قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جولائی 2023 قیمت ₹15

اردو دنیا

ماہنامہ

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادیب ہمارے راستہ کا رہنما ہوتا ہے۔ وہ ہماری انسانیت کو بیدار کرتا ہے۔ ہمارے اندر اعلیٰ و ارفع خیالات پیدا کرتا ہے۔ ہماری نظر کو وسعت بخشتا ہے۔

—— منشی پریم چند

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب کا خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

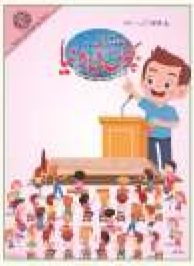

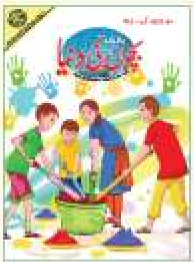

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:25، شمارہ:7، جولائی 2023

مدیر : پروفیسر شیخ عقیل احمد
نائب مدیر : عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط والتفات — قارئین کے خطوط 5

ادب: زاویے اور جہات
فرہنگ آصفیہ میں انتساب اور قرأت شعری کی غلطیاں — خلیق الزماں نصرت 8
سلطان عظیم آبادی اور حیدر جان — سلطان آزاد 12
کیا یہ فکشن کی صدی ہے؟ — احسن ایوبی 14
نیر مسعود کی غیر افسانوی خدمات — مہ جبیں خاں 17

اردو نثر کا ارتقا — ارشاد سیانوی 23
جکری: دکن کے ابتدائی دور کی مقبول صنف — عامر مظفر بھٹ 25
متون کی تحقیق و تدوین میں خواتین کا کردار — ریحانہ حسن 28
اردو ادب میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی عکاسی — صدف فاطمہ 31

یاد پریم چند
پریم چند کی ناول نگاری — سمیع احمد 33
خطبۂ پریم چند: ایک ادبی منشور — عمران عاکف خان 37

زبان اور زمینی صورت حال
زبان، انسانی خیالات واحساسات کا مجموعہ ہے — عبدالعزیز عرفان 39

خراج عقیدت
نکہت غزل کا معتبر لہجہ: ڈاکٹر نسیم نکہت — ماجد دیوبندی 41
ادب کا مہرو ماہ: پروفیسر شاداب رضی — عبدالباسط حمیدی 43

تنویر احمد علوی کی ادبی جہتیں — ثمر جہاں 45

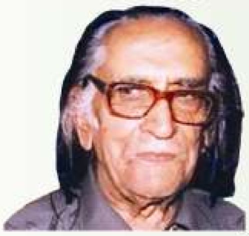

زبان و تعلیم
نئی قومی تعلیمی پالیسی کا متوقع سماجی کردار — شفاعت احمد 49

لعل و گہر
جاں نثار اختر: حیات و خدمات — دیوان حنان خان 52
علامہ شبنم کمالی کی غزل گوئی — افضل مصباحی 55
دیویندر اسر کی ادبی اور صحافتی خدمات — محمد تنویر 58

سلسلۂ صحافت
اردو میں کالم نگاری — صابر رضا رہبر 62

عالمی ادبیات
ورڈزورتھ کی نظم دی رینبو کے اردو منظوم

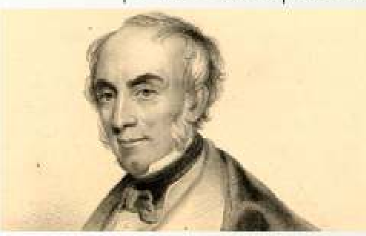

تراجم کا تنقیدی جائزہ — محمد ریاض 64
کشمیر میں فارسی زبان و ادب کی ترویج — گلزار حسین 67

خصوصی گفتگو
اردو کا مستقبل تاریک نہیں ہے: بدنام نظر — خان محمد رضوان 70

نیا آسمان نئے ستارے
ادبی تحریکات ور جحانات میں اردو تنقید — تنویر احمد 73
انور جلال پوری کی شاعری میں قومی یکجہتی — محبوب عالم 77
موسیٰ کلیم کی غزل گوئی — سعدیہ پروین 79

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 82

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 90

ہماری بات

کسی بھی علمی، ادبی، تحقیقی تصنیف اور تخلیق کو اعتبار و وقار اسی وقت ملتا ہے جب اس میں مصنف کی اپنی عرق ریزی، محنت اور ژرف نگاہی شامل ہو اور اس کا مواد سرقہ اور انتحال سے پاک صاف ہو۔ سرقہ یا چربہ کسی بھی تحریر کی معتبریت کو مجروح کر دیتا ہے، اسی وجہ سے ہمیشہ سنجیدہ علمی حلقوں میں اس پہلو پر خاص توجہ دی جاتی رہی ہے۔ علمی اور ادبی نظریات و افکار کی توثیق کے لیے اسلاف کے علمی و تحقیقی ترکے سے استفادہ اور بہ حوالہ اس کا استعمال کبھی معیوب نہیں رہا ہے، مگر اس کے بھی کچھ ضابطے اور اصول مرتب اور متعین کیے گئے ہیں، بے ضابطگی کے ساتھ یا بغیر حوالے کے کسی بھی ماخذ سے سرقہ و انتحال علمی اور تحقیقی دیانت داری کے خلاف ہے اور اسے معتبر حلقوں میں تحسین کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے معتبر مصنفین اپنی تحقیقات میں سرقے سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں مگر اس کے باوجود کبھی کبھی ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ جن مصنفین کو اعتبار اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ان کے یہاں بھی سرقے کی مثالیں تلاش کر لی جاتی ہیں۔

علمی اور ادبی دنیا میں سرقہ کی روش پرانی ہے مگر آج کے عہد میں یہ وبا بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ سرقے کے تعلق سے کچھ رپورٹیں بھی سامنے آئی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ دوسروں کی تحریریں اور تصانیف اپنے نام سے چھپوا لیتے ہیں۔

دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی سرقہ رائج ہے۔ اردو میں سرقہ کی بات کریں تو ابتدا میں کچھ شعرا پر فارسی شعرا کے مضامین و موضوعات چرانے کے الزامات عائد کیے گئے۔ اس کے بعد ایک دوسرے پر سرقہ اور چوری کے الزام کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا۔ شاعری کے بعد اردو نثر تک سرقہ کی وبا پہنچی۔ بہت سے لوگوں نے کسی ادیب یا مصنف کی مکمل تحریر یا تحریر کا کچھ حصہ نقل کر کے یا مختلف مصنفین اور ادیبوں کے اقتباسات کو جمع کر کے اپنی تخلیق یا مضمون کا حصہ بنانا شروع کیا اس طرح بڑی تعداد میں ایسے ادیب اور قلمکار موجود ہیں جن پر سرقہ ثابت ہو چکا ہے۔

جامعات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے مقصد سے بھی کچھ طلبا سرقہ کا سہارا لے رہے ہیں۔ محنت و مشقت کر کے مواد حاصل کرنے کے بجائے مفوضہ یا متعلقہ موضوع پر کسی کا تحقیقی مقالہ مل جائے یا اس موضوع سے متعلق کوئی حوالہ جاتی کتاب مل جائے تو اس کو اپنی تحقیق بنا کر پیش کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ جامعات میں یہ سلسلہ کافی عرصے سے چلا آ رہا ہے مگر اب اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ جامعات میں اس مذموم عمل کو روکنے کے لیے نئے نئے قوانین اور اصول بھی وضع کیے جا رہے ہیں، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن بھی اس حوالے سے بہت فکر مند ہے اور تحقیقی مقالوں مقالہ کو سرقہ سے پاک کرنے کے سلسلے میں بار بار نئی گائڈ لائن جاری کرتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ایجنسیاں اور ادارے بھی اس کوشش میں ہیں کہ سرقے کے عمل کو مکمل طور پر روکا جاسکے۔ انگریزی اور دیگر کچھ زبانوں میں یہ سہولت تو موجود ہے، مگر اردو کی مجبوری یہ ہے کہ اب تک ایسا او سی آر (Optical Character Recognition) وجود میں نہیں آیا جو سو فیصد سرقہ کی گرفت کر سکے اور سارقین کو بے نقاب کر سکے۔

سرقے کو بڑھاوا دینے میں سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کا بھی بڑا کردار ہے۔ انٹرنیٹ کی سہولیات نے علمی اور ادبی چوری کی راہ بہت آسان کر دی ہے۔ اس دور میں زیادہ تر سرقہ برقی ذرائع یا ویب سائٹ وغیرہ سے ہی ہو رہا ہے۔ بہت سے اسکالر کسی ویب سائٹ سے مضامین من و عن نقل کر کے اشاعت کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ ان کے پاس عنوانات تک تبدیل کرنے اور حوالہ جات تک درست کرنے کی فرصت نہیں ہوتی۔

کاپی پیسٹ کی سہولت نئے اسکالر کی تخلیقی و تنقیدی دونوں ہی صلاحیتوں کو برباد کر رہی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ آج کچھ اساتذہ بھی اس فعل کے مرتکب ہیں۔ یہ اخلاقی اور قانونی دونوں اعتبار سے قابل تعزیر جرم ہے۔ سرقہ کو روکنے کے لیے تکنیکی سطح پر مضبوط نظام کی ضرورت ہے۔ اردو رسائل کے مدیران سرقے کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اردو کے لیے یہ ذرا ناممکن العمل ہے، اسی لیے ماہنامہ 'اردو دنیا' میں کسی بھی مضمون کی اشاعت کے لیے 'غیر مسروقہ' کا تصدیق نامہ لازمی قرار دیا گیا ہے، اس کے باوجود سرقہ شدہ مضامین بھیجنے کا سلسلہ جاری ہے، قلمکاروں سے گزارش ہے کہ ایسی غیر اخلاقی حرکت سے گریز کریں کیونکہ اس سے صرف قلمکاروں کی نہیں بلکہ ادارہ کی ساکھ بھی مجروح ہوتی ہے۔

شیخ عقیل احمد

ربط و التفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

اردو دنیا جون کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق سے لے کر فہرست تک ایک ہی جست میں نظر جا پہنچی۔

اداریہ، خطوط، ادب: زاویے اور جہات، زبان اور ذہنی صورت حال، کتاب دریچہ، لعل و گہر، ذکر جگن ناتھ آزاد، خراج عقیدت، سلسلہ صحافت، عالمی ادبیات، زبان و تعلیم، تاریخ و تہذیب، خصوصی گفتگو، فلم، طب اور اردو، نیا آسماں نئے ستارے اور آخر میں خبرنامہ جس میں اردو دنیا کی خبریں موجود ہیں۔

اس فہرست کے ان جلی عنوانات پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ہی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ انسانی زندگی اور ادب کے تقریباً تمام گوشوں کا بھرپور احاطہ کرتی ہے۔ مثلاً اس میں زبان و ادب کے ساتھ ساتھ تاریخ و تہذیب، صحافت اور خبر، فلم اور انٹرویوز کے علاوہ طب کے تعلق سے بھی ایک گوشہ شامل کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس رسالے کی اشاعت کا مقصد صحت مند ادب کو فروغ دینا ہے۔ اگر ادب ملکی زندگی کا آئینہ دار اور سماجی زندگی کا عکاس ہے تو اس تعمیری مہم میں اردو دنیا کا ایک گراں قدر حصہ ہے، عوام کے دلوں میں جذبۂ تعمیر و ترقی بیدار کرنا اور ایک نئے مستقبل کی تشکیل کا ولولہ پیدا کرنے میں یقیناً اس رسالے کا بڑا رول رہا ہے۔ اس شمارے کے ابتدائی صفحات میں ہی زبان اور ذہنی صورت حال کے تعلق سے ایک سوال نامہ شامل کیا گیا ہے جس میں تقریباً بیس سے پچیس سوالات قائم کیے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سوچنا اور سوال قائم کرنا ایک کامیاب زندگی کی ضمانت ہے۔ ڈاکٹر ڈیوڈ جوزف شیوارڈز اپنی کتاب میں بڑی سوچ کا جادو (The Magic of thinking big) میں لکھتے ہیں ہیں کہ ہمارا دماغ ایک کارخانے کی طرح ہے۔ جس میں ہر وقت خیالات کی پیداوار ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے اس کارخانے میں دو انچارج ہوتے ہیں ایک کامیابی اور دوسرے ناکامی کا۔ یہ دونوں انچارج بہت سمجھدار اور فرمانبردار ہیں۔ ہم جس طرح کی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ فراہم کر دیتے ہیں اگر ہم غیر مؤثر سوالات کریں گے تو غیر مؤثر جواب ملیں گے اور مفید سوالات کریں گے تو مفید ملیں گے۔ لہٰذا یہ اس شمارہ کی ایک اہم، قابل غور اور قابل قدر خصوصیات میں سے ایک ہے۔

اس کے علاوہ ادب کے تعلق سے جو مضامین موجود ہیں وہ سب منفرد اور ادب تمام گوشوں کا احاطہ یعنی مختلف اصناف سے متعلق ہیں مثلاً مجنوں گورکھپوری اور افسانے کی تنقید، مومن خان مومن کے فارسی خطوط کا تنقیدی جائزہ، انشائیہ کا فن، کوچہ نرگسیت کا والہ و شیدا ریاض خیرآبادی، قرۃ العین حیدر کے سفرناموں کا تاریخی و تہذیبی مطالعہ اور منشی محمد الدین فوق وغیرہ۔ یعنی افسانہ، خطوط، ناول، انشائیہ اور سفرنامے کے علاوہ نرگسیت کے تعلق سے بھی گفتگو ملتی ہے۔ کتاب دریچہ میں شامل منظور احمد گنائی کا مضمون بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں مضمون نگار نے مقدمہ حالی سے لے کر کلیات پروین شاکر اور غبار خاطر وغیرہ کے حوالے سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ مضمون عوامی ترسیل اور نئی ٹیکنالوجی بھی بے حد اہم ہے۔ ٹیکنالوجی کے حوالے سے اس شمارہ کے اداریے میں بھی نہایت اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

غرضیکہ مجموعی طور پر یہ شمارہ نہایت اہم، منفرد، رنگا رنگ اور مختلف النوع موضوعات پر مبنی قابل ستائش ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس میں موجود سوال نامہ پسند آیا۔ یہ ایک نہایت ہی قابل تحسین کوشش ہے ورنہ اس دوڑتی بھاگتی زندگی میں کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ ٹھہر کر ذرا سوچے اور خود سے سوالات قائم کرے حالانکہ بڑی شخصیات ہمیشہ سے سوالات قائم کرتی رہی ہیں۔

مہر فاطمہ: C-206، سرایا سرور اپارٹمنٹ، بڈگر، مین روڈ، وہائٹ فیلڈ، بنگلور، کرناٹک

ماہنامہ 'اردو دنیا' جون کا شمارہ کئی معنوں میں اہمیت کا حامل ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور خوبصورت ہے۔ اداریے میں ڈیجیٹل تدریس کی اہمیت و افادیت پر زور دیا گیا ہے۔

کورونا کے دوران تدریس کے میدان میں ایک مثبت تبدیلی رونما ہوئی بہ وجوہ درس وتدریس کے دائرے میں وسعت ہوئی۔ تعلیم کمرہ جماعت کے محدود دائرے سے نکل کر ہر فرد تک بہ آسانی پہنچ سکی۔ طریقۂ تدریس میں ٹکنالوجی کے مثبت استعمال کے در وا ہوئے۔ مگر فوائد کے ساتھ ہی اس کے منفی اثرات بھی ثبت ہوئے۔ 'ادب: زاویے اور جہات' کے تحت ظفر انصاری کا 'مجنوں گورکھپوری اور افسانے کی تنقید عمدہ مضمون ہے۔ اسی گوشے کے تحت عدیلہ جسیم کا مضمون 'قرۃ العین حیدر کے سفرناموں کا تاریخی وتہذیبی مطالعہ' واقعی قابل مطالعہ ہے۔ قرۃ العین حیدر امریکی تہذیب کی چکا چوندھ سے پرے سکے کے دوسرے رخ سے پردے واشگاف کرتی ہیں۔ امریکی تہذیب کی شکستگی اور اس کی پژمردگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں جہاں انسانی اقدار کی پامالی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ 'زبان اور زمینی صورت حال' کے تحت محمد اسماعیل کا سوال وجواب کے فارم میں اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ کرنے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے۔ واقعی کسی تہذیب وثقافت کی بقا ودوام اس کی زبان پر منحصر ہوتی ہے۔ زبانوں کی حفاظت کے لیے کس طرح تدابیر اپنائی جائیں، زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟ اس طرح کے بے شمار سوالات کے تحقیقی وزمینی جوابات دیے گئے ہیں۔ منجملہ اس شمارے میں شامل تمام گوشوں کے مضامین قابل مطالعہ ہیں۔

حسنین رضا: حسنین رضا، حاجی پور، ویشالی، بہار

خدا معلوم، یہ شہرِ خموشاں کیسی بستی ہے
زمیں آباد ہوجاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

ان کی شاعری میں خودی اور رجائیت کی کثرت بھی ملتی ہے۔ مثلاً

اگر ساقی مجھے آنے نہیں دیتا، نہ آنے دے
ذرا دیکھوں تو کیوں کر میکدہ آباد ہوتا ہے

اسی طرح انھوں نے 'خودی' کا جذبہ محمد اقبال سے مستعار لیا ہے۔ مثلاً

اغیار کی تقلید نہیں مجھ کو مناسب
میں سب سے الگ راہگزر کیوں نہ بناؤں

ڈاکٹر اسلم پرویز اسلم کی شاعری بھی طنزیہ اور استہزائیہ رہی ہے، مستزاد، اس میں انسان کی نفسیات اور احساسات کا ایک وافر خزینہ بھی مرتسم رہا ہے اور تخیل کی بلند پروازی بھی رقم ہے۔ تبصرے کے تحت ص 77 پر ان کا یہ شعر دیدنی ہے۔

یہ ترا شہر بھی تجھ سا ہی فریبی نکلا
راستہ کوئی چلوں، تیری گلی آتی ہے

اس شمارے کے آخری صفحہ 98 پر 'خراجِ عقیدت' کے تحت ساحر لدھیانوی کی بابت کچھ نہ کہنا بے طرح کھٹکتا ہے، ان کا ایک بھی شعر درج نہیں کیا گیا ہے۔ باتیں تو بہت ہی کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر کرشن بھاؤک: کوٹھی نمبر A-201، گورو نانک نگر گلی نمبر K-18، A-201، پٹیالہ (پنجاب)

محترمہ ڈاکٹر ریشا قمر نے حافظ کرناٹکی کے ادب کا محاکمہ پیش کیا ہے، تاہم ان سے جتنے بھی سوالات مشافہے میں کیے ہیں، معقول اور موزوں جوابات انھوں نے دیے ہیں۔ فقط صفحہ 61 پر ایک جواب میں حافظ کرناٹکی ان کے معاصر پسندیدہ شعرا کے بتا نا دانستا ٹال گئے ہیں۔ حافظ صاحب بچوں اور بڑوں کے ادب کی متعدد کتب اس خادم کو وقتاً فوقتاً ارسال کرتے رہے ہیں، جو کہ ان کی وسیع دریادلی کا مظہر ہے۔ اس مصاحبے میں ڈاکٹر صاحبہ نے ان کی ادبی اور سماجی خدمات کا کاملاً محاکمہ پیش کرکے ان کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔

جناب شفیق جونپوری کی شاعری کا جائزہ اپنے مضمون میں محمد ارشد صاحب نے لیا ہے، ان کی شاعری میں 'تضاد' کا عنصر اکثر پڑھنے کو ملتا ہے، یہ شعر دیدنی ہے۔

سرسبز اور سفید رنگوں کے حسین امتزاج سے آراستہ غنچہ وگل کی نرگسیت کا استعارہ 'اردو دنیا' باصرہ نواز ہوا۔ اول تو سرورق اس قدر دیدہ زیب کہ دل شدت کی تپش میں بھی مشکبو ہو اٹھے، اداریہ اس قدر پر مغز، زبان وادب کے فروغ میں جدید وسائل و ٹکنالوجی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو کی ویب سائٹ کی عمدہ کارکردگی کا موثر بیانیہ اذہان کو تقویت فراہم کر رہا ہے۔ اردو جو ہماری گنگا جمنی تہذیب وثقافت کی علم بردار ہے آج اکیسویں صدی کی ترقیات کو سمیٹنے میں محو ہے۔ جس کا منھ بولتا ثبوت 'اردو دنیا' اور قومی کونسل برائے فروغ اردو ہے۔ نادر موضوعات پر مبنی مضامین اردو دنیا کا نہ صرف حسن دوبالا کر رہے ہیں بلکہ قاری کی معلومات میں اضافے کا باعث ہیں۔

ڈاکٹر رضوانہ ارم: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور وومنس یونیورسٹی، جھارکھنڈ

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا
نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن ودل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت ومعنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم وہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی ومعروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورت حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذراسی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

خلیق الزماں نصرت

فرہنگ آصفیہ میں انتساب اور قرآت شعر کی غلطیاں

فرہنگِ آصفیہ کو مولوی سیدؔ احمد دہلوی نے ترتیب دیا ہے۔

فرہنگ آصفیہ جلد اوّل اور جلد دوّم کو پہلے مفید عام پریس آگرہ نے 1891 میں شائع کیا تھا۔ جلد سوم اور چہارم ترقی اُردو بورڈ نے 1974 میں شائع کیا تھا۔ قومی اُردو کونسل دہلی نے بڑے اہتمام کے ساتھ تین جلدوں میں شائع کر کے ایک بڑا کام کیا ہے۔ یہی اشاعت میرے پیشِ نظر ہے۔

لغت روز کے پڑھنے کی چیز نہیں ہے۔ کسی لفظ کی معلومات نہ ہونے یا اس کے معنی الگ الگ ہونے کی وجہ سے اسے بطور حوالہ کھول کر دیکھنا پڑتا ہے۔ 1300 اشعار برمحل اشعار اور ان کے مآخذ (پہلی جلد) 2011 میں شائع ہوئی۔ اس کے چار ایڈیشن شائع ہوئے۔ اسی چھان بین کے دوران فرہنگ آصفیہ ہمارے مطالعے میں آئی اس میں سے میں نے تقریباً 100/125 اشعار کے حوالے قبول کیے ہیں بقیہ کئی اشعار کی توثیق کی ہے۔

لغت میں لاکھوں الفاظ کے معنی ہوتے ہیں چند ہی لغات ایسی ہیں جن میں الفاظ کے معنی سمجھانے کے لیے شعروں کے حوالے دیے گئے ہیں۔ ایک ایک لفظ کے لیے کئی کئی اشعار ہیں جن سے ہم شعروں کا لطف بھی اٹھا سکتے ہیں۔ سید احمد دہلوی نے اپنی لغت سے معنی کو سمجھانے کا بڑا کام کیا ہے۔ یہ ان کی خاص خوبیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر تراق پڑاق (استعمال تڑاق تڑاق) لکھا ہے۔ کسی چیز کے ٹوٹنے یا سینگی توڑنے کی آواز چٹاخ کو تراق کہتے ہیں۔

تڑاق پڑاق -1- تابع فل (1) جلد جلد پے در پے۔ متواتر۔ برابر

(2) چٹاچٹ۔ چٹ چٹ۔ چٹاخ چٹاخ۔ ٹوٹنے کی آواز۔

ذرا بھی سینۂ حسد چاک میں جو تڑپا دل تو
ٹوٹ جائیں گے تارِ رفو تڑاق پڑاق
نہ کیجیے ہم سے بہت گفتگو تڑاق پڑاق
وگرنہ ہووے گی پھر دوبدو تڑاق پڑاق

(3) تڑاتڑ، پڑاپڑ، سڑاسڑ

سزا دل کی اگر اس کو باندھ کر زلفیں
لگائیں کوڑے ترے روبرو تڑاق پڑاق ظفر

اسی طرح 3 اور شعر کے حوالے دیے گئے ہیں۔

امیر اللغات میں بھی اشعار کے حوالے ہیں مگر الگ ہیں۔ معنی ملتے جلتے ہیں۔ سیدؔ صاحب کی لغت سے امیر مینائی نے استفادہ کیا ہے۔ مگر دونوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ امیر اللغات کی ترتیب میں کئی شاعروں کا کام ہے، اسے کئی مرحلے میں طے کیا گیا ہے مگر فرہنگ آصفیہ فردِ واحد کا کام ہے۔ اب برمحل اشعار کے تعلق سے چند اشعار مثال کے طور پر 269 پر آگے کے معنی اس طرح دیے گئے ہیں۔ آگے آگے۔ ہ۔ تابع فعل۔ آگے کو۔ زمانہ مستقبل میں تھوڑے دنوں بعد چند روز میں۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
نامعلوم

مذکورہ شعر میں شاعر کا نام نہیں ہے اور روایت کے مطابق 'نامعلوم' لکھا ہے۔

اب دوسرا شعر اس کے معنی کے لیے لکھا گیا ہے۔

تم تو نظیر مکرے اور کل ہی ہم نے دیکھا
تھے تم تو پیچھے پیچھے وہ شوخ آگے آگے
نظیر

ابتدائے عشق... برمحل شعر ہے۔ یہ میر کا مشہور شعر ہے۔ مگر فرہنگ آصفہ کے مولف نے نامعلوم لکھا ہے۔ کلیاتِ میر ص 133 پر اس طرح درج ہے۔

'راہِ دورِ عشق میں' روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

'راہِ دورِ عشق میں کسی جگہ 'ابتدائے عشق ہے' استعمال ہوتا ہے۔ اب یہ تحقیق طلب ہے کہ آیا میر نے اس مصرعے کو بدلا یا کسی استادِ زماں نے تصرف کیا تھا۔ میری تحقیق میں پتہ چلا کہ بہت سے مصرعے بدلے گئے ہیں۔

فرہنگ آصفیہ کے اشعار میں نے برمحل اشعار ڈھونڈنے کے لیے ہزاروں شعر پڑھ ڈالے تھے۔ اس لغت میں تقریباً 100 سے زیادہ برمحل اشعار ہیں اور اکثر جگہوں پر جہاں شاعر کا نام ہوتا ہے نامعلوم لکھا ہے۔ ممکن ہے قارئین کو ان کے شعرا کا نام معلوم نہ ہو۔

اس لیے میں نے یہ مضمون لکھنا شروع کیا۔ چند اشعار میری غیر مطبوعہ کتاب میں ہیں اور کئی تو مشہور اشعار گمنام شاعر کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

فرہنگِ آصفیہ کے اشعار میں چند اشعار کے

انتساب میں غلطی ملی ہے۔ کہیں پر شاعر کا نام نہیں دے کر خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس مضمون کے لکھنے کا مقصد خاص یہ ہے کہ آئندہ ایڈیشن کے حاشیے میں ان تمام خامیوں کی تصحیح ہوجائے۔

اب آیئے صحیح عنوان پر آتے ہیں، جلد نمبر 1 ص 187

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے
نامعلوم

اس شعر میں نامعلوم لکھا ہے، یہ عام طور سے اسی طرح مشہور ہے۔ یہ دونوں مصرعے اس طرح ہیں:

گئے دونوں جہاں کے کام سے ہم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے
نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

اوپر کا پورا مصرعہ اور ثانی مصرع کا آدھا ٹکڑا مشہور ہے مگر یہ شعر مرزا صادق شرر کا ہے اور گلستانِ خزاں، ص 121 پر ہے۔ کچھ اور تذکروں میں ایسا ہی ہے۔

(ص 24 اور II 254)

تم تو بیٹھے ہی بیٹھے آفت ہو
اٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو
میر

یہ شعر میر کا نہیں ہے حاتم کا ہے۔ مختلف تذکروں میں اس کی قرأت الگ الگ ہے۔ گلشن بے خار جو ص 55 پر ہوئے یہ آفت ہو، عیار الشعراص 152 پر اسی طرح ہے مگر انتخابِ سخن (1)۔ مولانا حسرت موہانی میں ایسا ہے اور یہی درست ہے

تم کہ بیٹھے ہوئے اک آفت ہو
اٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو

(ص 3-261)

سینہ تمام جلنے لگا دل کے داغ سے
لو گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

یہی مشہور ہوگیا۔ شعرائے ہنود میں ص 39 پر شعر اس طرح ہے اور یہی درست ہے۔

شعلہ بھڑک اٹھا میرے اس دل کے داغ سے
آخر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے
نامعلوم

اس شعر کے شاعر کا نام نہیں لکھا ہے۔ یہ شعر پنڈت مہتاب رائے تاباں نے بارہ برس کی عمر میں میر درد کے مشاعرے میں پڑھا تھا۔ محمد حسین آزاد نے بھی اس برہمن زادے کا نام نہیں لکھا تھا۔

ص 4-269)

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا

یہ میر کا نہیں غالب کا ہے اور دیوان غالب ص 20 پر ہے۔

(ص 6-334)

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے
میر ×

یہ شعر بدھ سنگھ قلندر کا ہے اور اس طرح ہے۔

تھمتے ہی تھمے گا اشک ناصح
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے
میر ×

میر پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ کئی دوسرے اشعار کو میر کا نام دے کر کتابوں اور رسالوں میں شائع کر دیا گیا ہے۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ شعر میر کا ہی ہے۔ اس طرح کی غلطیاں مستند کتابوں میں بھی ہیں۔ میر کے بعد سب سے زیادہ اشعار علامہ اقبال کے کھاتے میں ڈال دیے گئے ہیں۔ میں نے اپنی تحقیقی کتاب 'برمحل اشعار اور اُن کے مآخذ' میں اصل شاعر کی کھوج کی ہے۔

(ص 7-442)

کیا ملا عرضِ مدعا کر کے
بات بھی کھوئی التجا کر کے
لاعلم

یہ شعر سید محمد خان رند کا ہے جو خلیق اور آتش کے شاگرد تھے۔ اس کے دیوان 'گلدستہ عشق' کے ص 135 پر شعر اسی طرح ہے۔

(ص 8-907-513)

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا
لاعلم

یہ شعر مولانا ضیاء الدین رضا کا ہے جو مولوی شاہ امام بخش تھانیسری سے بیعت تھے۔ اس مفہوم کو بہت سے شعرا نے ان کے بعد شعر میں باندھا ہے۔ امیر مینائی۔

زیست کا اعتبار کیا ہے امیر
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

غیرت بہارستان، ص 143

امیر نے تضمین کی ہوگی مگر اشارہ نہیں کیا۔ عیار الشعرا میں شعر اس طرح درج ہے۔

آدمی بلبلہ ہے پانی کا
کیا بھروسہ ہے زندگانی کا

یہاں اولیٰ مصرع کو ثانی کر دیا گیا ہے۔ اس شعر کی غزل کے دوسرے اشعار بھی ہیں۔

(ص 9-693)

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا اسے کیا اضطراب میں

(60-70)

نام یوں پستی میں بالا تر ہمارا ہوگیا
جس طرح پانی کوئیں کی تہہ میں تارا ہوگیا

ان دونوں اشعار میں شاعر کا نام نہیں ہے اور یہ ذوق اور مومن کے اشعار ہیں اور بالترتیب دیوانِ مومن کے ص 129 اور 6 پر ہیں۔ (ص 727-11)

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو
نامعلوم

یہ شعر خواجہ وزیر لکھنوی کا ہے۔ حسرت موہانی کے انتخاب سخن ص 222 پر ہی نہیں کئی انتخاب میں مولانا حسرت موہانی ایسا لکھا ہے۔

(ص 614، 626 اور 13-801)

کوئی عاشق نظر نہیں آتا
ٹوپی والوں نے قتلِ عام کیا
مومن ×

یہ شعر میر کا نہیں شرف الدین علی خاں پیام کا ہے۔ بحوالہ مجموعہ نغز ص 131۔ یہ ایک قطعہ کا شعر ہے۔

دلّی کے کج کلاہ لڑکوں نے
کام عشاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا
ٹوپی والوں نے قتل عام کیا
میر تقی میر

(ص 14-823)

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں الٹا سیدھا
قیس ×

یہ قیس کا نہیں شناور کا ہے جو آتش کا شاگرد تھا۔
دبستانِ آتش ص 151 پر۔

کب ہے عریانی سے بڑھ کر کوئی دنیا میں لباس

شہکار غزلوں میں ثانی مصرعے میں سیدھا الٹا ہے، میرے خیال سے الٹا سیدھا درست ہے تذکرہ خوش معرکہ زیبا II ص 26 پر بھی 'کب ہے' ہے۔ مختلف تذکروں میں اس شعر کی قرأت الگ الگ ہے۔

(15-894)

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کر نا رفو
تا قیامت سوزنِ تدبیر گو سیتی رہے

یہ جعفر علی خاں کا شعر ہے مگر اولیٰ مصرعے میں ہونا اور ثانی میں گر ہے۔

(16-976)

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

یہ شعر ذوق کا ہے اور دیوانِ ذوق، مرتبہ تنویر احمد میں ص 261 پر اولیٰ مصرعہ اس طرح ہے۔

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے

مؤلف نے کس کتاب کو ماخذ بنایا ہے پتہ نہیں اور یہی مشہور بھی ہوگیا۔ کلیم الدین احمد (معاصر 6) نے بھی پھول تو.... لکھا ہے۔ (16 II 78/999)

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائے پیمبری ہو جائے

یہ شعر امین الدولہ مہر کا ہے۔ اس کا کوئی مستند ماخذ نہیں ملا ہے۔

باؤ بھی کھائی نہ تھی دل نے کہ مرجھانے لگا
آہ یہ غنچہ تو کچھ کھلتے ہی کمھلانے لگا

یہ میر ضیاء الدین ضیا کا شعر ہے۔ تذکرہ گلشن بے خار ص 127۔

(17-1013)

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
عارف×

یہ شعر غالب کا ہے اور دیوانِ غالب میں ص 563 پر ہے۔

(18-19) جلد نمبر II

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں
ذوق×

یہ مرزا درد کا شعر ہے اور ان کے دیوان میں ص 119 پر اسی طرح ہے۔

(19-180)

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں
کیا ڈیڑھ چلّو پانی سے ایمان بہہ گیا
غالب×

یہ شعر غالب کا نہیں ذوق کے دیوان ص 27 پر اسی طرح ہے۔

(20-193)

یارب زمانہ ہم کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہیں ہم

اس شعر کے ساتھ شاعر کا نام نہیں ہے۔ یہ مشہور شعر غالب کے دیوان میں ص 291 پر ہے اور اولیٰ میں مجھ ہے اور ثانی میں ہوں میں ہے۔

(21-199)

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں
ذوق×

یہ ذوق کا نہیں ناسخ کا شعر ہے اور اسی طرح مشہور بھی ہے۔ بیشتر حضرات نے ایسا ہی لکھا ہے مگر اولیٰ مصرعہ بحر سے خارج ہو جاتا پھر بھی یہی مشہور ہے۔ ناسخ کے دیوان میں ص 105 پر 'ہے نام' ہے۔

(22-216)

مے بھی ہے مینا بھی ہے ساغر بھی ہے ساقی نہیں
جی میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے کو ہم
گویا

یہ شعر نظیر کی غزل کا ہے۔ کلیات نظیر میں ص 106 پر ہے۔ مگر ثانی مصرعہ میں دل ہے۔

(23-244)

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد
لاعلم

یہ شعر میر کے نام سے مشہور ہے۔ مگر مصحفی کے ایک شاگرد منور حسین غافل کا شعر ہے۔ اس کا دیوان شائع ہوا ہے۔ میری کتاب میں بھی یہ شعر چمن بے خزاں (ص 27) کے حوالے سے شائع ہوا ہے۔

(24-420)

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا
لاعلم

یہ شعر آتش کے کلیات میں ص 20 پر ہے۔

(25-423)

شہہ زور اپنے زور میں گرتا ہے سر کے بل
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے
لاعلم

اس شعر کے اولیٰ مصرعہ کو اس طرح بدل کے پڑھا جاتا ہے۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں
لاعلم

یہ مرزا عظیم بیگ عظیم کے ایک مخمس کے دو اشعار ہیں او رمجموعۂ نغز ص 13 پر (شہہ زور...) ہے او ر دوسرے مصرے میں 'کرے' ہے۔ (26-426)

(27-522)

لیے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل
شہیدِ ناز کی تربت کہاں ہے
لاعلم

اس شعر میں لاعلم لکھا تھا مگر میں نے نواب تخلص کے ایک شاعر کا نام پڑھا ہے جو درد کا ہمعصر تھا۔ ممکن ہے آئندہ کی تحقیقی کتاب میں اس کی معلومات آجائے۔

(28-658)

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے
لاعلم

یہ شعر احمد حسین امیر اللہ تسلیم کا ہے اور جدید شاعری ص 791 پر ہے اور ان کے دیوان میں بھی ہے۔

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو
غالب

اس شعر کو اکثر لوگ غالب کا سمجھتے تھے۔ مگر ان کے شاگرد میاں داد سیاح اور انھیں کے دیوان میں ص 189 پر یہ شعر ہے۔

(29-671)

ایسی ضد کا کیا ٹھکانا اپنا مذہب چھوڑ کر
میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

یہ شعر کس کا ہے میں نے کیا کسی نے ابھی تک نہیں بتایا ہے۔ غالب کے نام سے مشہور ہوگیا۔

(30-728)

ہے فقیروں سے کج ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
عاشق

میر تقی میر کا شعر ہے مگر کلیاتِ میر ص 128 پر ہے کی جگہ ہم اور کج ادائی کی جگہ بے ادائی ہے۔ فصاحت کا دھیان دیتے ہوئے یہ شعر اسی طرح پڑھا جائے گا۔

(31-735)

سر سبز اور خط سے ہوا حسن یار کا
آخر خزاں نے کچھ نہ اکھاڑا بہار کا

یہ جیون لال عشاق کھتری کا شعر ہے میر محمدی کا شاگرد تھا۔ مجموعہ نغز کے ص 396 پر ایسا ہے۔

آنے سے خط کے دُونا ہوا حسنِ یار کا
آخر خزاں نے کچھ نہ اوپاڑا بہار کا
لاعلم

(32-769)

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے
مومن×

یہ خواجہ فخر الدین سخن، غالب کے شاگرد کا ہے۔ دیوان سخن ص 107 پر اسی طرح ہے۔

(33-782)

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر توڑا خدا خدا کر کے
نامعلوم

یہ مومن کا نہیں، دیا شنکر نسیم کا شعر ہے اور یہ مستند ہے۔ مگر نسیم کے مجموعے میں اور جواہر سخن میں ہے اور ص 226 پر ٹوٹا ہے اور یہ درست بھی ہے' کفر توڑا درست نہیں ہے۔ میں نے ہر جگہ کفر ٹوٹا پڑھا ہے۔

(34-797)

نہ خوف آہ بتوں کو نہ ڈر ہے نالوں کا
بڑا کلیجہ ہے ان دل دکھانے والوں کا
میر×

یہ شعر ضامن علی جلال لکھنوی کا ہے اور حسرت موہانی کے انتخاب سخن میں بھی ص 70 پر ہے۔

(53-830)

مہیا جس کنے اسباب ملکی اور مالی تھے
وہ اسکندر گیا یاں سے تو دونوں ہاتھ خالی تھے
میر

یہ شعر میر کا نہیں ہے منشی محمد رضا معجز کا ہے۔ اس مفہوم پر تقریباً دسوں شعر ہم نے پڑھے ہیں۔ جن میں تھوڑا تھوڑا تصرف کیا ہوا ہے۔ لیکن شعر ایسا ہے۔

مہیا گو کہ سب سامان ملکی اور مالی تھے
سکندر جب چلا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے
نامعلوم

(جلد III، 36-5)

گو ہم سے تم ملے نہ تو تم ہم بھی مر گئے
کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

یہ قائم کا شعر ہے اور اس کے دیوان میں ص 220 پر اس طرح ہے۔

گو ہم سے تم ملے نہ تو کچھ ہم نہ مر گئے
کہنے کو رہ گیا یہ سخن دن گزر گئے
نامعلوم

(37-5)

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا
نامعلوم

یہ شعر آتش کا ہے اور کلیاتِ آتش کے ص 49 پر ہے۔

(38-6)

زلف کا کہنا پریشاں عقل کی دوری ہے یہ
ہر گرہ میں اس کے دل ہے گانٹھ کی پوری ہے یہ
نیاز×

39/63

گلستاں میں جا کے ہر اک گل کو دیکھا
نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے
لاعلم

یہ شعر نیاز کا نہیں نصیر الدین حیدر پادشاہ کا ہے اور ہو بہو خمخانۂ جاوید (2) ص 40 پر ہے تاریخ اردو 187 پر بھی یہی شعر ہے۔ کہیں کہیں میں نے چمن بھی دیکھا ہے۔

(40-209)

کون کہتا ہے کہ ہم تم میں لڑائی ہوگی
کسی دشمن نے ہوائی یہ اڑائی ہوگی
نامعلوم

مؤلف نے اس شعر کے خالق کے نام سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے مگر یہ شعر محمد امان نثار کا ہے اور گلشنِ بے خار میں اس طرح درج ہے۔

مجھ میں اور ان میں سبب کیا جو لڑائی ہو گی
یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہو گی

(41-331)

سیرت کے ہم غلام ہیں صورت ہوئی تو کیا
سرخ و سپید مٹّی کی مورت ہوئی تو کیا
نا معلوم

یہ شعر خواجہ احسن اللہ بیان کا ہے صرف مٹی کی جگہ ماٹی ہے۔ کئی تذکروں میں یہ بیکل کے نام سے منسوب ہے مگر بیان کے شعری مجموعے میں بھی ہے۔

(42-362)

زلف کا کھولنا بہانا تھا
مدّعا ہم سے منہ چھپانا تھا
نامعلوم

شعر نواب عماد الملک غازی الدین فیروز جنگ نظام کا ہے اور نشترِ عشق ص 130 پر ہے۔

(43-383)

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا بچنا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی
رند

یہ میر سوز کا شعر ہے، بچنا کی جگہ جینا ہے۔

(44-519)

آئینہ ان کا ٹوٹ گیا میرے ہاتھ سے
اب کوئی منہ دکھانے کی صورت نہیں رہی
حیدری

یہ شعر رند کا نہیں ہے اس کے دیوان میں بھی نہیں ہے کئی تذکروں میں بھی نہیں ملا۔

(45/533)

برابری کا ترے گل نے جب خیال کیا
صبا نے مار طمانچہ منہ اس کا لال کیا

اصل میں یہ شعر میر تقی میر کا ہے اور اس کے دیوان میں اس طرح ہے۔

جو گل نے دعوی رخ کا ترے خیال کیا
صبا نے مارے طمانچوں کے منہ کو لال کیا
نامعلوم

(47-693)

حیدری بعد کا شاعر ہے اور ہے بھی یا نہیں یہ تو نثر نگار تھا۔ میرے خیال سے اس نے سرقہ کیا ہے۔ ویسے بھی اس مضمون کے کئی دعویدار ٹھہرائے گئے ہیں۔ سودا کا بھی شعر اسی طرح ہے۔

(49-845)

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی
نامعلوم

امیر اللہ تسلیم کا یہ مشہور شعر ہے۔ چند تذکروں میں بھی ہے آوارہ گرد اشعار ص 82 پر اسی طرح ہے۔

(48-441)

میکدہ میں گر سراسر فعلِ نا معقول ہے
مدرسہ دیکھا تو واں بھی فاعل و مفعول ہے
نامعلوم

یہ شعر مضمون کا ہے اور فرہنگِ آصفیہ جلد دوم ص 563 پر گر کی جگہ گو ہے۔ تذکرہ شورش ص 387 پر بھی درج ہے۔ آبِ حیات ص 92 سراسر کی جگہ 'سراپا' ہے۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

یہ نواب سید محمد خاں رند کے دیوان گلدستۂ عشق کے ص نمبر 179 پر اسی طرح ہے۔

(50-863)

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

یہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کا مشہور شعر ہے جو دیوانِ شیفتہ کے ص 26 پر شائع ہوا ہے۔

کتابیات

1 برمحل اشعار اور ان کے مآخذ (I) اور غیر مطبوعہ II (اہم)
2 عیار الشعراء، شعرائے ہنود، انتخاب سخن (حسرت موہانی)
3 جواہر سخن، دبستان آتش، خوش معرکہ زیبا، مجموعہ نغز، جدید شاعری، تاریخ ادب، نشترِ عشق، آوارہ گرد اشعار
4 کلیات دیوان میر، غالب، گلدستۂ عشق، غیرتِ بہارستان، ذوق، کلیات ناسخ، نظیر، غافل، میاں داد سیاح، مومن، نسیم، جلال، قائم، آتش، بیان، مضمون۔

■

Khaleequzzaman Nusrat
861, 203, Opp. Salauddin Ayyubi School
Ishrat Apartment, Kashanaenusrat
Bhiwandi- 421302 (MS)
Mob.: 9923257606

سلطان آزاد

سلطان عظیم آبادی اور حیدر جان

روایت اور تحقیق سے یہ بات عیاں ہے کہ اردو کے کئی شعرا اور صاحبِ حیثیت شعرا طوائفوں کی زلف کے اسیر ہوئے اور ان کے حُسن و عشق کے اس طرح دیوانہ ہوئے کہ مشہور زمانہ ہوئے۔ ان ہی میں عظیم آباد کے خوب رو شاعر، جو نوابان صاحبان محلہ گزری پٹنہ سٹی (عظیم آباد) کے سب سے ممتاز خاندان کے چشم و چراغ، نواب سید تجمل حسین خاں المتخلص بہ سلطان عظیم آبادی بھی ہیں۔

اُردو شاعری کا ایک وہ زمانہ رہا جب شرفا، شعرا اور شاعرات کے ساتھ طوائفوں کا ایک بڑا حلقہ بھی اس فن سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت کے شعرا اور ناقدین ادب طوائفوں کی شاعری پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ ان میں کچھ شرفا، شعرا جو اس وقت کے استادالشعرا کہلاتے تھے، کئی طوائفوں کے استاد رہے۔ ان کے کلام پر اصلاحیں دیں۔ اُن میں خصوصی طور پر داغ دہلوی کا نام نمایاں ہے۔ حجاب نامی طوائف جو کلکتہ کی مشہور رقاصہ تھی، داغ دہلوی کی محبوبہ کہلائی، روایت ہے کہ حجاب ایک بار رامپور میں میلہ بے نظیر دیکھنے گئی، داغ دہلوی دیکھ کر اس پر ایسے فریفتہ ہوگئے کہ اس کے واپس جانے پر ملاقات کے شوق میں 1299ھ میں عظیم آباد ہوکر کلکتہ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر منّی بائی حجاب خود شعر نہ کہتی تب بھی محض مثنوی 'فریادِ داغ' کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے زندہ رہتی۔ کیونکہ داغ دہلوی نے اپنی فریفتگی کے قصّے کو مثنوی 'فریادِ داغ' میں نظم کیا ہے۔ اس کے علاوہ دیوان 'آفتابِ داغ' کی بعض غزلوں کے مقطع میں بھی حجاب کا ذکر ہے۔

اسی طرح کا ایک نوجوان شاعر مرزا رضا علی المتخلص بہ ضیا عظیم آبادی جو شوق نیموی کے ہونہار شاگرد تھے، انہوں نے عظیم آباد میں موجود ایک طوائف اور رقاصہ شاعرہ معشوق سے دل لگا بیٹھے۔ جس کا نام ولایتی جان عرف صاحب جان تھا۔ دونوں میں کافی قربت ہوگئی۔ خط و کتابت کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ نالہ وفغاں، شب کی بیداری، دل کی بیتابیاں، جنون و وحشت اور رشک و رقابت وغیرہ اکثر مضامین جو عاشقانہ شعروں میں خیالی طور پر باندھے جاتے ہیں وہ بالکل ان کے مطابق ہوگئے۔ بالآخر دونوں نے عشق و محبت میں جان بھی دے دی۔

روایت اور تحقیق سے یہ بات عیاں ہے کہ اردو کے کئی شعرا اور صاحبِ حیثیت شعرا طوائفوں کی زلف کے اسیر ہوئے اور ان کے حُسن و عشق کے اس طرح دیوانہ ہوئے کہ مشہور زمانہ ہوئے۔ ان ہی میں عظیم آباد کے خوب رو شاعر، جو نوابان صاحبان محلہ گزری پٹنہ سٹی (عظیم آباد) کے سب سے ممتاز خاندان کے چشم و چراغ، نواب سید تجمل حسین خاں المتخلص بہ سلطان عظیم آبادی بھی ہیں۔ جن کے اوصاف کا ذکر کلیم الدین احمد عاجز اپنی مذکورہ کتاب 'بہار میں اردو شاعری کا ارتقا' (مطبوعہ 1998) میں یوں کیا ہے:

"نہایت حسین، خوش رو، شہہ زور، موزوں جسم، پیکر خلق و محبت، منکسر المزاج، متواضع ملنسار ان تمام خوبیوں کے مالک تھے۔ جو ایک اچھے انسان کی تشکیل کرتے ہیں۔ آغاز نوجوانی ہی میں شاعری کا چشمہ ذہن سے پھوٹ پڑا۔ اللہ نے انہیں شاعر ہی بنایا تھا۔ صورت شاعرانہ، مزاج شاعرانہ، کوئی بات غیر شاعرانہ نہیں تھی۔"

بقول سید عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی (تاریخ شعراء بہار جلد اوّل) سلطان عظیم آبادی صفیر بلگرامی کے شاگرد تھے۔ اُردو کے دو دیوان ایک بحر خفیف میں اور دوسرا مختلف بحروں میں اور دو مثنویاں بھی اپنے نام سے یادگار چھوڑی تھیں۔

نواب سید تجمل حسین خاں عرف سید سلطان مرزا المتخلص بہ سلطان خلف نواب بہادر سید ولایت علی خاں (سی آئی ای) کی پیدائش 1849 کو عظیم آباد میں ہوئی تھی۔ جب سلطان عظیم آبادی جوان ہو چکے تھے۔ ان دنوں نواب بہادر ولایت علی خاں کے یہاں دوسری بڑی اہم تقریب میں لکھنؤ کی ایک بہت حسین کمسن مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ طوائف زینت مجلس بنی تھی۔ اس کا نام حیدر جان تھا۔ اسے دیکھ کر ایک ہی نظر میں سلطان کو حیدر جان سے اور حیدر جان کو سلطان سے عشق ہوا۔ اس واقعے اور حادثے کا ذکر کلیم احمد عاجز اپنی مذکورہ کتاب 'بہار میں اردو شاعری کا ارتقا' میں بیان کرتے ہیں:

"یہ حادثہ سلطان عظیم آبادی کی شاعرانہ شخصیت کا بنیادی جزو ہے۔ یہ حادثہ نہ ہوا ہوتا تو شاید سلطان کی شاعری وہ شاعری نہ ہوتی جو ہوئی۔ قطع نظر اس کے کہ سلطان عظیم آبادی کی مثنوی 'دردِ دل' اس حادثے کی تفصیلی شاعرانہ روداد ہے (یہ مثنوی بھی اب دستیاب نہیں)۔ سلطان کی چند غزلیں جو ایک نہایت گمشدہ بیاض کے ایک گوشے میں لکھی ہوئی ملیں اور جن کے سوا غالباً سلطان کی بیس-بائیس سالہ شاعرانہ مشق کی کوئی یادگار باقی نہیں۔ وہ غزلیں اس حادثہ کی روشنی ہی میں زیادہ لطف دے سکتی ہیں۔"

اس سلسلے میں کلیم احمد عاجز مزید واقعے کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"حیدر جان پہلی مرتبہ تقریب میں پٹنہ آئی۔ سلطان اور حیدر جان کی نگاہیں چار ہوئیں۔ حیدر جان لکھنؤ بھول گئی۔ سلطان عظیم آباد کو بھول گئے۔ تقریب ختم ہوئی۔ لکھنؤ کا قافلہ واپس جانے لگا۔ حیدر جان نے عظیم آباد چھوڑنے سے انکار کیا۔ ماں نے بہت سمجھایا، آخر کچھ دنوں رہ کر ماں تنہا لکھنؤ واپس گئی، جا کر حیدر جان کی خالہ کو لکھنؤ سے عظیم آباد بھیجا کہ اس شوریدہ سر کو پنجۂ عشق سے آزاد کراؤ، اس علامہ نے عظیم آباد آ کر زمین آسمان ایک کردیا۔ چار و نا چار ہو کر حیدر جان کو عظیم آباد چھوڑنا ہی پڑا۔"

سلطان عظیم آبادی نے اس واقعے اور فراق کے ذکر کا اظہار اس طرح نظم کیا ہے، ملاحظہ ہو

کیا کہوں اس فراق کا احوال
وہ مرا رنگ وہ مرا احوال
نہ اسے اختیار رہنے کا
نہ مجھے حوصلہ اُلجھنے کا
شاق تھی اس نگار کی دوری
تا بہ آرہ گیا بہ مجبوری
ریل جس وقت آرہ میں ٹھہری
جمع تھے سب دیہاتی و شہری
اس گھڑی میں اٹھا جو پہلو سے
بھرے آنکھوں کو اپنے آنسو سے
اور بولا کہ لو خدا حافظ
مجھ کو اب جانے دو خدا حافظ
گرچہ دل کو ذرا قرار نہیں
آگے جانے کا اختیار نہیں
سننا تھا یہ کہ وہ بجوش فغاں
بولی ہیں ہیں کہاں کہاں یہ کہاں

میں نہ مانوں گی میں نہ مانوں گی　　تم جو اتروگے جان دیدوں گی
کہہ کے یہ میرا تھام کر دامن　　چاہا بٹھلائے ریل میں فوراً
میں نے ہٹ کی یہ التجا ہٹ کر　　دامن اتنے میں رہ گیا پھٹ کر
کھول کر کھڑکی اور دے کے دعا　　ریل کے نیچے میں اتر ہی پڑا
اور کھڑکی کو تھام کر اک بار　　بولا چلنے میں مجھ کو کیا انکار
پر مناسب نہیں مرا جانا　　تمہیں سمجھو کہ ایسا کیا جانا
عزت خاندان کا بھی ڈر ہے　　دم بدم باپ ماں کا بھی ڈر ہے
کہنے کو تو کہا مگر کہوں کیا　　دل پہ صدمہ جو کچھ گذر رہا تھا
ریل کی سیٹی اس طرف کو بجی　　اور دونوں کا سنسنا گیا جی
اس طرف آہ تھی ادھر نالے　　آنکھوں سے آنسوؤں کے پرنالے

دونوں حسرت سے نکلتے تھے باہم
ہائے کچھ کہہ نہ سکتے تھے باہم

اس طرح حیدر جان سے رخصت تو ہوا لیکن اس کا کیا اثر سلطان عظیم آبادی کو ہوا، وہ بیان کرتے ہیں۔

مری حالت وہ تھی معاذ اللہ　　کہ نہ دکھلائے، وہ گھڑی اللہ
آرہ سے آیا تو میں گھر کو مگر　　لانے والوں کو ہے کچھ اس کی خبر
آہ کچھ ایسا میں ہوا دل گیر　　دل نے کی جان لینے کی تدبیر
کھانے پینے کو بھی جواب دیا　　بلکہ جینے کو بھی جواب دیا
بند آنکھیں کئے زمیں پہ پڑا　　نقش پا تھا امید رفتہ کا

اس طرح دونوں کی زندگی جدائی اور فراق میں گذری۔ ان کی بے چینی اور بے قراری کو دیکھ کر والد نے انہیں کلکتہ لے جانا مناسب سمجھا۔ لیکن سلطان کا دل وہاں بھی نہ لگا۔ اس طرح پٹنہ واپس آگئے۔ انھوں نے حیدر جان کو ایک منظوم خط لکھا۔ ملاحظہ ہوں۔

اے تمنائے عاشق ناکام　　دلربائے زمانہ دلبر نام
تو سلامت رہے بصد خوبی　　روز افزوں ہو تیری محبوبی
تو مسلمان ہے تو اے کافر　　یاد کر اپنے قول کو آخر
تجھ کو سوگند شاہ خیبر ہے　　بالیقیں تو کنیز حیدر ہے
تجھ کو اپنے اداؤں کی سوگند　　مجھ کو میری وفاؤں کی سوگند
اپنے حیران نیم جاں پہ نظر　　جلد لے جلد آکے میری خبر

ختم اب داستانِ حیراں ہے
خطِ سلطانِ عشق بازاں ہے

بالآخر بہت ساری بندشوں اور رکاوٹوں کے بعد حیدر جان لکھنؤ سے پٹنہ آئی۔

سلسلہ وعظ و پند کا ٹوٹا　　قفل سب قید و بند کا ٹوٹا
کھلے بندوں وہ پائے بند وفا　　لکھنؤ سے چلی بصدق و صفا

حیدر جان کے پٹنہ آنے پر سلطان عظیم آبادی پر جو کیفیتیں گذریں اس کا اظہار اس طرح کیا۔

تغافل سے بہت دعوے کئے تو گھر میں بیٹھا تھا
نکل آیا نہ دل پکڑے ہوئے میری دہائی سے

سلطان فراق میں نہ ہو بے چین اس قدر
دو چار روز ہی میں تو وہ آئے جاتے ہیں

سُنا ہے تابہ در میری عیادت کو وہ آپہونچے
بغل میں ہاتھ دو کوئی اٹھا دو چارپائی سے

رومانیت شخصیت کا آئینہ اور ذات کی عکاسی ہوتی ہے۔ سلطان عظیم آبادی رومانیت پرور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا محور عشق اور عشقیہ شاعری ہے۔ بلاشبہ اگر ان کی زندگی میں حیدر جان نہیں آتی تو وہ اس طرح کی شاعری نہیں کر پاتے۔ وہ پھر صفیر بلگرامی کی پیروی کرتے ہوئے وہیں تک محدود رہ جاتے اور دیگر تلامذۂ صفیر کے شاعروں میں گنے جاتے۔ انہوں نے عشقیہ شاعری کو اس قدر تہہ دار اور پہلودار بنا دیا کہ حسن وعشق کے تعلقات اور نازک رشتے سے ایک نئی دنیا کی خبر ملتی ہے۔ یہ دنیا نہ تو غم کی دنیا ہے اور نہ خوشی کی بلکہ علم واحساس سے عبارت ہے، جس کا تصور کیف آفریں ہے۔ اس کا اندازہ ان کے چند اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

سلطان نہ بس اس طرح کراہو　　مرجاؤ اگر یونہی تو کیا ہو
اس موت پہ صدقے لاکھ عمر میں　　تیرے ہاتھوں اگر قضا ہو
مدفن مرا وسیع رکھنا　　میلا شاہد پسِ فنا ہو

لی خبر جلد مری آپ نے ہشیاری کی　　سال کٹتا تو مجھے ہجر کا غم کھا جاتا
نزع کے وقت وہ آئے تو اشارے سے کہا　　اب تم آئے کہ زباں سے نہیں بولا جاتا

سلطان عظیم آبادی کی دو مثنویوں میں مثنوی 'دردِ دل' ایک اہم مثنوی ہے۔ کیونکہ یہ مثنوی ان کی پوری شاعری کا ماخذ ہے۔ ان میں عشقیہ واقعات نظم کیے گئے ہیں جو حقیقت پر مبنی ہیں۔ وہ اس مثنوی کے ہیرو ہیں تو ان کی محبوبہ طوائف ہیروئن ہے۔ اس میں مثنوی نگاری کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ اشعار میں روانی کے ساتھ قصہ، کردار نگاری، ماجرا نگاری، واقعہ نگاری غرض کہ مثنوی میں جو لوازمات ہونے چاہئیں وہ سب موجود ہیں اور یہ حقیقت پر مبنی منظوم کہانی ہے۔ اس کی زبان پیاری اور پُرلطف ہے۔ درحقیقت یہ مثنوی شاعر کی منظوم آپ بیتی ہے۔ بہار کے اہم مثنوی نگاروں میں سلطان عظیم آبادی کا ذکر خاص طور سے کیا جانا چاہیے۔

مختصر یہ کہ سلطان عظیم آبادی کا معشوق اگرچہ طوائف ہے جسے اس زمانہ میں بازاری سمجھا جاتا تھا۔ لیکن سلطان عظیم آبادی کے عشق کی روح کی شرافت نے ان کے دل کے اندر رہنے والے فنکار سے اس بازاری طوائف کو گرہستی کی دنیا کا بیش بہا اور پاکیزہ سرمایہ بنا دیا۔ سلطان عظیم آبادی نے بازاری محبوب کو ایسا پردہ نشیں بنایا کہ اس کی ایک ایک ادا پر شرافت قربان ہوتی ہے۔

بچھا دے بسترِ گل ہاں لگا دے اوٹ پھولوں کی
کہ اس رشک چمن کا وصل ہے اے باغباں ہم سے

حوالے اور ماخذ

1. تاریخ شعرائے بہار، جلد اول از سید عزیز الدین بلخی راز عظیم آبادی
2. بہار اور اردو شاعری۔ معین الدین دردائی
3. دفتر گم گشتہ (بہار میں اردو شاعری کا ارتقا) کلیم احمد عاجز
4. تذکرہ شمیم سخن۔ مولوی عبدالحئی صفا بدایونی
5. تذکرۃ الخواتین۔ مولانا عبدالباری آسی
6. مثنوی "فریادِ داغ"۔ داغ دہلوی
7. تذکرہ مسلم شعرائے بہار۔ حکیم سید احمد اللہ ندوی
8. بہار میں اردو مثنوی کا ارتقا۔ ڈاکٹر احمد حسن دانش
9. مرقع فیض۔ نواب سید تجمل حسین خاں سلطان عظیم آبادی

Sultan Azad
Pannu Lane
Gulzarbagh
Patna- 800007 (Bihar)

احسن ایوبی

کیا یہ فکشن کی صدی ہے؟

گذشتہ دو دہائیوں کے ادبی منظر نامے کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ماضی کے مقابلے میں یہ صدی فکشن کے لیے سازگار ثابت ہو رہی ہے۔ فکشن پر ہونے والے مباحثے اور تعلیمی اداروں میں فکشن سے متعلق تحقیق کی رفتار اور تعداد سے بھی یہ محسوس ہو رہا ہے کہ فکشن کے مطالعے اور تفہیم میں اکیسویں صدی کا قاری دلچسپی لے رہا ہے۔ لیکن کیا اس سازگار ماحول کی وجہ سے خوش گمان ہوا جاسکتا ہے کہ یہ صدی فکشن کی صدی ہے؟ اطمینان اور خوشی کی بات تو اس وقت ہوگی جب کیفیت وکمیت کے اعتبار سے آج کا فکشن گذشتہ صدی سے بہتر ہو۔

ترقی پسند تحریک اور تقسیم ہند کے بعد لکھے جانے والے افسانے اور ناولوں میں پیشکش اور زبان و بیان کی درستگی آج بھی کسی نئے لکھنے والے کے لیے جس طرح مشعل راہ بنتی ہے، اُس طرح کیا اِس صدی میں لکھی جانے والی کسی تحریر کو رہنما بنایا جا سکتا ہے۔ ساتویں اور آٹھویں دہائی کے فکشن نگاروں کے سامنے زبان و بیان اور اظہار کے نئے نئے مسائل تھے۔ جدیدیت کے زیر اثر اسلوبیاتی اور ہیئتی سطح پر افسانے میں جو تبدیلیاں آئی تھیں یا یوں کہہ لیجیے کہ افسانہ، کہانی اور قاری سے دور ہو کر رہ گیا تھا، اسے از سر نو تعمیر کے مراحل سے گزارنا نئے افسانہ نگاروں کی ذمے داری تھی۔ اس لیے 70ء کے بعد لکھے گئے افسانوں میں بیانیہ کی تہہ داری، ابہام اور علامتوں سے سروکار اور نئی جہتوں کی گرفت کے ساتھ ساتھ کہانی پن کی جستجو بھی تیز تر ہو گئی تھی، یعنی کہانی پھر اسی محور پر گردش کرنے لگی تھی جس پر منٹو اور ان کے معاصرین چھوڑ گئے تھے۔ واضح رہے کہ کہانی پن سے مراد وہ اکہرا بیانیہ نہیں جو ایک زمانے میں اردو افسانے میں در آیا تھا بلکہ ستر کے بعد لکھے جانے والے افسانوں میں کہانی پن پہ زور کے ساتھ ساتھ اس میں تکنیک کے نو بہ نو تجربوں کی بھی آمیزش تھی۔ ان سب میں کہانی پن کی واپسی کی آواز زیادہ بلند تھی۔ اُس وقت بھی قاری کی تشفی اور اطمینان کے لیے سلام بن رزاق، رام لعل، عابد سہیل، شوکت حیات، رتن سنگھ، پیغام آفاقی، سید اشرف، اقبال مجید، طارق چھتاری وغیرہ موجود تھے، لیکن اس وقت قاری کے مطالبات، تشفی اور اطمینان کی بات چھوڑیے، زبان و بیان اور موضوع کی سطحی پیشکش اور عامیانہ پن جگہ جگہ قاری کی طبع نازک کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ مشتعل حالات اور مسائل کو بیان کرنے کا جو ہنر کرشن چندر، عصمت، منٹو، بیدی، شوکت صدیقی وغیرہ کے یہاں تھا، اس کا عکس ماضی تا حال دیگر ہندوستانی زبانوں خصوصاً تمل، ملیالم، مراٹھی اور ہندی کے فکشن نگاروں کے یہاں پھر بھی نظر آتا ہے لیکن اردو میں اس مہارت کا فقدان ہے۔ کتنے ہی مسائل ایسے ہیں جو فکشن کے قالب میں ڈھل کر معاشرتی سطح پر فکر و عمل کی نئی جہات کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے تخلیقی اذہان انقباض کا شکار ہیں اور ان مسائل تک ان کی رسائی نہیں ہو رہی جو دوسری زبانوں کے فکشن میں برتے جا رہے ہیں۔

تسلیم شدہ بات ہے کہ کسی بھی صنف ادب کو مقبول بنانے میں اس کی صنفی خصوصیات اور کشش کے ساتھ ساتھ قارئین کا بھی اہم رول ہوتا ہے۔ قاری کا ذوق، اس کی ذہنی سطح کے تناسب سے اس کے مطالبات کا خیال رکھنا گرچہ مصنف کی ذمے داری نہیں ہے مگر انسان تہذیبی و معاشرتی زوال کے جس مرحلے میں ہے، اس کے پیش نظر فرد کے ذوق سے لے کر سماج کی متنوع کیفیات کا ادراک فکشن نگار کے لیے ضروری ہے۔ اس کے برعکس اس صدی میں فکشن نگاروں کی تعداد بڑھ رہی ہے، فکشن پڑھا جا رہا ہے، مباحثے ہو رہے ہیں لیکن ملکی اور غیر ملکی زبانوں سے تقابل تو در کنار، بیشتر اردو افسانے اور ناول قاری کو ذہنی و جذباتی آسودگی فراہم کرنے اور ذوق مطالعہ کو تسکین دینے کی خوبی سے بھی عاری ہیں۔ انگلیوں پر شمار کیے جانے والے چند ناموں کے علاوہ بیشتر مصنفین کے یہاں زبان و بیان کی ایسی فاش غلطیاں ہیں جنھیں درگزر کرنے میں بحیثیت قاری سخت تردد ہوتا ہے۔ لکھنے والوں کو سوشل میڈیا نے شہرت کا شارٹ کٹ ضرور فراہم کر دیا ہے۔ کتابوں کی اشاعت بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گیا، ہفتے اور مہینے گزرتے نہیں کہ ایک نئی کتاب بازار میں آجاتی ہے، معاشرتی احوال کا سرسری تجزیہ، تہذیبی اصولوں سے باغی کرداروں کی من مانیوں کا نفسیاتی جواز پیش کر کے، بولڈنیس کا تڑکا لگا کر، سنسنی پیدا کرنے والے احوال کے سطحی بیان کو فکشن قرار دینے کا وہم عام ہو چکا ہے۔ ان حالات نے قاری کو ایک ایسے تذبذب میں مبتلا کر دیا ہے

کہ وہ مطالعے و تجزیے کی کوئی سمت متعین کرنے سے قاصر نظر آ رہا ہے۔ سنجیدہ قاری کے پاس خاموشی کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اس خاموشی کی اذیت اپنی جگہ، مزید اس پر معاصر فکشن کے عمق سے نابلد ہونے کا الزام بھی ہے۔

اس وقت لکھے گئے ناولوں اور افسانوں میں استعمال ہونے والی زبان اور خشک بیانیے اس زمانے کی یاد شدت سے دلاتے ہیں جب اردو افسانہ نظریات کی بھول بھلیوں میں کھو کر قاری سے دور ہوتا جا رہا تھا، اس میں دوبارہ کشش پیدا کرنے کے لیے افسانہ نگاروں نے نت نئے طرز اختیار کیے تھے لیکن زبان و بیان سے سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ صحافتی اور تخلیقی بیانیہ کے درمیان ایک حد فاصل تھی۔ تجربات کی شدت اور احساس و شعور کی پیچیدگیوں کو بیان کرنے کے لیے نیا پیرایہ اظہار تلاش کرنے میں حتی الامکان نزاکتوں کا خیال تھا، وہ حسن تناسب اِس صدی کے فکشن میں بمشکل ہی نظر آتا ہے۔ ایک عجیب اتفاق یہ ہے کہ اس عہد میں بھی افسانے کی ناخدائی وہی لوگ کر رہے ہیں جنھوں نے بیسویں صدی میں لکھنا شروع کیا تھا۔ دوسری جانب، گزشتہ صدی کی روایت اور طریقہ کار سے استفادہ کرنے والوں کی جو کھیپ تیار ہوئی ان کی راہیں تنقیدی نظریات کی بہتات کی وجہ سے تنگ نظر آتی ہیں۔ تخیل اور خلاقی کے بجائے نت نئے موضوعات کو برتنے کی عجلت اور لفظوں کے استعمال اور موزونیت سے ناواقفیت کی وجہ سے فکشن کا ایک اور ہی عکس پیش کر رہی ہے۔ بعض ایسے بھی ہیں جو اسلوب کے تجربے اور علامت وضع کرنے کے چکر میں انشائیہ نما چیزیں بطور افسانہ پیش کر رہے ہیں۔ اس تخلیقی انقباض کی ایک وجہ تخلیقی اذہان کی اپنی روایت اور اجتماعی شعور تک نارسائی بھی ہے۔ تغیر اور ترقی کا تحیر خیز منظر نامہ انھیں روایت اور تہذیب سے اغماض پر مجبور کیے ہوئے ہے۔ نئے قلمکاروں کا المیہ ہے کہ ماضی تو بہت دور، اپنے عہد کے اہم ناموں سے بھی ناواقف اور ان کی تحریر کی خوبیوں سے ناآشنا ہیں۔ اس مغائرت کا اثر تخلیق کار کی ذہنی ساخت اور تخلیقی معاملات پر نظر آنا فطری ہے۔ ان باتوں کا مقصد کسی پر بے سمتی یا لایعنیت کا الزام عائد کرنا نہیں ہے مگر نئی نسل کو احتساب کرنا چاہیے کہ اس عہد کے زندہ حوالوں اور تہذیب و روایت کی روح کی طرف رجوع کرنے اور روبہ رو ہونے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے۔

سنجیدگی کے فقدان اور اطلاعات سے پر معاصر افسانوی ادب کی اکھڑتی سانسیں بحال کرنے میں سید محمد اشرف، ذکیہ مشہدی، انیس اشفاق، خالد جاوید، صدیق عالم، محسن خان، رضوان الحق اور چند دیگر نئے پرانے تخلیق کار اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ انھوں نے عصری تقاضوں کو تہذیب کی روح سے ہم آہنگ کر کے اپنے تجربات، مشاہدات، اقدار اور اجتماعی احساسات کو فکشن کا روپ دیا ہے اور اس صدی کے اردو فکشن کا وقار انھیں جیسے مصنفین کی تحریروں سے قائم ہے۔ یہاں ان سینئر لکھنے والوں کا نام قصداً نہیں لیا گیا ہے جو ایک زمانے سے خود کو دہرا رہے ہیں یا کوئی قابل ذکر تخلیق پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ مذکورہ ناموں میں ہر ایک کی منفرد تخلیقی شناخت ہے اور اس شناخت کی تشکیل میں برسوں لگے ہیں۔

سید محمد اشرف نے اپنے عہد کے سیاسی داؤ پیچ کو جس تخلیقی جدت کے ساتھ سیاسی و سماجی معلومات کا انبار لگائے بغیر بیان کیا ہے وہ قابل توجہ ہے۔ انھیں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ

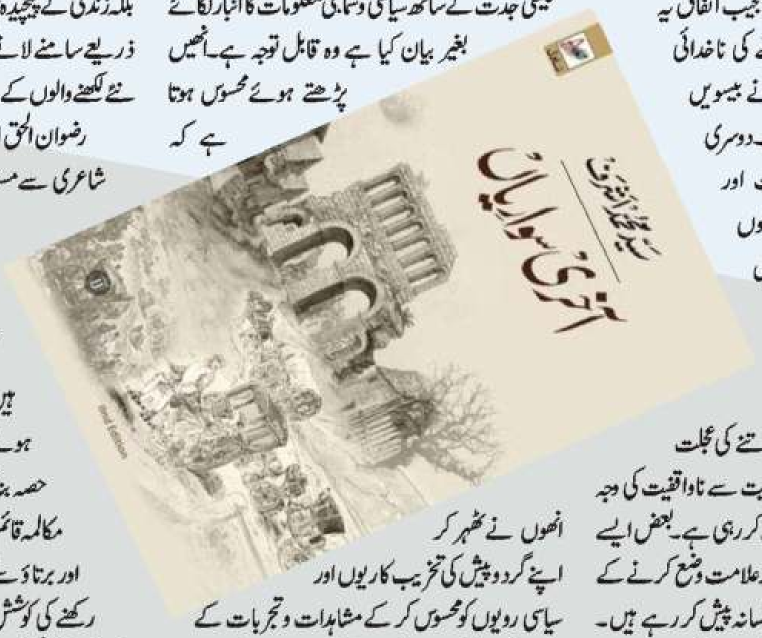

انھوں نے ٹھہر کر اپنے گرد و پیش کی تخریب کاریوں اور سیاسی رویوں کو محسوس کر کے مشاہدات و تجربات کے اظہار کے لیے نئی راہ نکالی ہے۔ 'آخری سواریاں' میں بڑے ہی سہل انداز میں ان مسائل کی طرف اشارے کیے ہیں جو سیاسی جبر کی وجہ سے قابل گرفت ہو سکتے ہیں۔

انیس اشفاق نے ناول کی ہیئت میں جو واقعاتی اور بین التونی تجربے کیے، تہذیبی تشخص کی بازیافت اور اس کی معنویت بیانیہ کے ذریعے اجاگر کی وہ ان کی تخلیقی انفرادیت کی بہترین مثال ہے۔ ماضی کی طرف مراجعت انیس اشفاق کو عصریت کے تقاضوں سے غافل نہیں کرتی۔ انھوں نے مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کے متن کو جس انداز سے اپنے ناول 'خواب سراب' میں زندہ رکھا اور اس کی بنیاد پر ایک تازہ بیانیہ خلق کیا، 'پری ناز اور پرندے' میں نیر مسعود کے طویل افسانے 'طاؤس چمن کی مینا' کی بازگشت کے باوجود تاثرات، احساسات اور کیفیات کو تازہ تخلیقی زاویوں سے پیش کیا، وہ ان کی فنکارانہ ہنرمندی کو یقینی بناتا ہے۔

محسن خان کا ناول 'اللہ میاں کا کارخانہ' گذشتہ دو دہائی میں شائع ہونے والے ناولوں میں ایک ایسا منفرد شہ پارہ ہے، جس نے بزرگ فکشن نگار اور قارئین سے لے کر نئی نسل کے لکھنے اور پڑھنے والوں کو یکساں طور پر متاثر کیا۔ محسن خان کے افسانوں سے اردو فکشن کے قاری کی دیرینہ آشنائی ہے۔ ان کے یہاں اسلوب کی سادگی اور تجسس خیز سچویشن کے ذریعے قاری کی توجہ کشید کرنے کا ہنر موجود ہے۔ مذکورہ ناول میں انھوں نے کسی طرح کا نظریاتی یا فلسفیانہ نکتہ نہیں اٹھایا ہے اور نہ ہی ان کے بیانیے میں مطالعے و تحقیق کا رعب اور علمیت کا زعم ہے بلکہ زندگی کے پیچیدہ حقائق کو نہایت ہی سادے سوالوں کے ذریعے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ طریقہ کار نئے لکھنے والوں کے لیے یقیناً مشعل راہ ثابت ہو سکتا ہے۔

رضوان الحق اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ انھوں نے شاعری سے مستعار اسلوب اور علامت کے بجائے روز مرہ کی زبان اور سادہ نثر میں قدرے پیچیدہ اور تہہ دار افسانے اور ناول 'خودکشی نامہ' لکھا جو ان کی تخلیقی زرخیزی کی بہترین مثال ہیں۔ دنیا بھر میں خصوصاً اپنے ملک میں ہونے والی خودکشی کے واقعات کو بیانیہ کا حصہ بنا کر انھوں نے اس عمل کے محرکات پر مکالمہ قائم کیا ہے۔ رضوان الحق نے طریقہ بیان اور برتاؤ سے اس ناول کو راست اظہار سے بعید تر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول خودکشی سے متعلق مفروضوں کی نفی کرتے ہوئے یہ ثابت کرتا ہے کہ زندگی کے مصائب سے فرار کے لیے اختیار کیا گیا یہ راستہ کس قدر مشکل اور ہمت طلب ہے۔ عصری تناظر میں موضوع کی سطح پر یہ ناول اپنی اہمیت منوانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

رحمٰن عباس کا تازہ ترین ناول 'زندیق' اس وقت ادبی حلقوں میں زیر بحث ہے۔ اس میں انھوں نے تخیل اور ٹھوس حقائق کی آمیزش سے ایک نیا تجربہ کرنے یعنی ڈاکیوفکشن لکھنے کی کوشش کی ہے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں انھوں نے مختلف قرینوں سے ناول پڑھنے اور اس پر گفتگو کرنے کی تگ و دو عملی سطح پر کی ہے۔ اس عرصے میں انھوں نے پانچ ناول لکھنے کے علاوہ ناول پر اپنے ہم عصر

فکشن کے تئیں سازگار فضا تشکیل دینے کی کوشش ہمارے فکشن نگار کر رہے ہیں، اس کوشش میں کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب تحریر کو ناپختہ احساسات اور فکری انتشار کا ملغوبہ بننے سے محفوظ رکھا جائے اور وہ معیار پیش نظر ہو، جن کی بنیاد پر کوئی تخلیقی تجربہ اعتبار حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

اور نئے لکھنے والوں سے مکالمے بھی کیے ہیں۔ان کے ناولوں میں عشق اوراس راہ پرخار کی اذیتوں کا بیان غالب موضوع کے طور پر سامنے آتا ہے اس کے علاوہ معاشرتی جبر، ثقافتی تنوع، ممبئی کے طرز زندگی کے توسط سے شہری زندگی کے مسائل، رشتوں کی پیچیدگیاں، جنسی ناآسودگی، اخلاقی بے راہ رویوں کی جزئیات 'روحزن' میں کمال ہنر مندی سے بیان کی گئی ہیں۔

اکیسویں صدی میں منظر عام پر آنے والے ناولوں میں مشرف عالم ذوقی کے ناول موضوعات کی جدت کے سبب زیر بحث رہے۔ تیزی سے بدلتی دنیا، سائنس اور ٹیکنالوجی کے انکشافات کو ذوقی نے بیانیہ کا حصہ بنا کر اردو ناول کو ثروت مند بنانے کی کوشش کی ہے لیکن سب کچھ سمیٹ لینے کی عجلت میں بیانیہ کا اسٹرکچر بکھراؤ کا شکار ہوگیا، مسائل وقوعہ میں نہ ڈھل سکے، حالانکہ حال کے سیاسی منظرنامہ کو منعکس کرنے کے ساتھ ساتھ ماضی میں جا کر وہ ان جڑوں کو بھی تلاش کرنے میں کامیاب رہے، جہاں سے مسائل جنم لیتے ہیں لیکن ناول یا ادب محض مسائل کی پیشکش کا وسیلہ نہیں بلکہ اس کی شناخت اس کی ہیئت اور شعریات سے ہے جسے برقرار رکھنے کے لیے مسائل کی قلب ماہیت ضروری ہے۔

ناول کے فنی پہلوؤں سے قطع نظر اگر نظری اور فکری عمق پر گفتگو کی جائے تو وہ ذوقی کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ تازہ ترین ناول 'مرگ انبوہ' اور 'مردہ خانے میں عورت' میں انھوں نے جن سیاسی اور سماجی المیوں کو طنزیہ پیرایے میں بیان کیا ہے اور جن خدشات اور مسائل کے متعلق پیش گوئی کی ہے وہ موجودہ تناظر میں حرف حرف درست ثابت ہوئے ہیں۔ان کا طریقہ اظہار اب تک تعین قدر کرنے والوں کے درمیان معتوب رہا ہے لیکن ادب کے حسن وقبح پر گہری نظر رکھنے والے ایک وسیع النظر پارکھ انتخاب حمید نے ذوقی کے یہاں کچھ ایسا دریافت کیا ہے جوان کے طرز اظہار کو معتبر بناتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ابلیسی سازشوں اور عفریتی توانائیوں کے بالمقابل مسلم معاشرہ کی بے بسی اور اس کی تذلیل پر یہ لرزہ خیز ڈسکورس معاصر اردو فکشن میں ایک منفرد تجربہ ہے اس ڈسکورس کے کچھ ڈائمنشنز ایسے ہیں جنھیں ناولٹی یا نئے پن سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔متن وموضوعات اور زبان و بیان کی سطح پر بھی یہ اختلاف درج کرتا ہے۔سائبر دنیا اور اس کی مخصوص اصطلاحات کا اس قدر تخلیقی تصرف معاصر اردو فکشن میں کہیں اور نظر نہیں آتا۔''

''ہندوستان کی دیگر زبانوں میں اور عالمی سطح پر بھی اس نوعیت کے ملت وقوم اور ثقافت مرکوز بے شمار مخاطبات دستیاب ہیں۔ دلت ادب، افریکن، امریکن، لیٹن امریکی، افریقی اور یوروپ کی مختلف زبانوں میں لاتعداد دانشورانہ نگارشات اور تخلیقی مخاطبات کی اعلیٰ ترین مثالیں ہیں جو اپنے فنی محاسن اور جمالیات از خود خلق کرتی ہیں۔مزید براں دنیا بھر میں کئی نظریات اور مشہور زمانہ نظریہ ساز اس قبیل کی تخلیقات کی دانشورانہ، نیم فلسفیانہ توجیہات فراہم کرتے ہیں۔''

(اردو کے نئے ناول صنفی وجمالیاتی منطق: انتخاب حمید،ص: 71-162)

انتخاب حمید کی اس حجت کے بعد بحیثیت قاری محاسبہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ کسی تحریر کو مسترد کرنے کے لیے مطالعے کی وسعت ناگزیر ہے۔مختلف زبانوں کے ادب، رجحانات اور نظریات پر گہری نظر کے بغیر کوئی حتمی رائے قائم کرنا غیر تنقیدی رویہ ہے۔

مذکورہ غیر تنقیدی رویے کا مظاہرہ خالد جاوید کی تحریروں کے تئیں بھی کیا گیا۔خالد جاوید نے وجود کے اسرار دریافت کرنے کے لیے زندگی کی پیچیدگیوں کو ٹھوس اور معنوی پیرایے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔اس پر پیچ سفر میں انھوں نے حقیقت پسند اور بیانیہ کی سیدھی لکیر سے انحراف کرتے ہوئے اپنا ایک نیا لہجہ تخلیق کیا ہے جس سے مانوس نہ ہونے کی وجہ سے اسے بیشتر قارئین نے رد کیا لیکن بالغ نظر اور مختلف اسالیب سے آشنا اذہان نے ان ناولوں کی تفہیم مختلف زاویوں سے کرتے ہوئے مطلوبہ مقام پر رکھا۔خالد جاوید کے ناولوں پر فلسفیانہ اور وجودی نظریات کا اطلاق کر کے تفہیم کی کوشش نتیجہ خیز تو ہو سکتی ہے لیکن اس کے برعکس یہ خیال عام ہو چلا ہے کہ مصنف نے فلسفیانہ نظریے کے تحت یا وجودی فلسفے کی روشنی میں ناول کا تانا بانا تیار کیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خالد جاوید کا (یا کسی بھی مصنف کا) تخلیقی عمل نظریات اور اصولوں کا پابند نہیں بلکہ مصنف کا اسلوب اور طرز اظہار، قاری کے اندر یہ وہم پیدا کرتے ہیں کہ مصنف نے شعوری طور پر ان نظریات کا سہارا لیا ہے۔خالد جاوید کا تخلیقی تجربہ اپنی معنویت کا دائرہ جن عناصر سے پورا کرتا ہے ان میں انسانی وجود کے تاریک گوشے ضرور شامل ہوتے ہیں۔

اردو فکشن کی صدی پر گفتگو کرتے ہوئے سرحد پار لکھے جانے والے فکشن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔یہاں کی بہ نسبت وہاں قدرے بہتر صورت حال ملتی ہے۔اکیسویں صدی میں ہی کئی ایسے ناول منظر عام پر آئے جن میں موضوع اور مواد کی شمولیت اور انتخاب میں بڑی وسعت ہے۔اس ضمن میں وحید احمد کا ناول زینو، جس میں بیک وقت کئی علوم سے استفادہ کر کے، رومان کی آمیزش سے تاریخی حقائق کو بیانیہ کا حصہ بنایا گیا ہے۔مرزا اطہر بیگ کے ناول 'غلام باغ' اور 'صفر سے ایک تک' میں پیچیدہ ترین وقوعوں اور غیر معمولی کرداروں کی پیشکش کے ذریعے بیانیہ کو ایک نئے ڈگر پر رواں رکھنے کی کوشش کی گئی اور اس کوشش میں وہ کامیاب بھی رہے۔اسی طرح خالد طور کے ناول 'بالوں کا گچھا' میں اسلوب کی کشش موضوع کی فرسودگی کو عیاں نہیں ہونے دیتی۔ان کے علاوہ اور کئی ناول ہیں جن کا اگر ذکر کیا جائے تو فہرست سازی کے زمرے میں آئے گا کیوں کہ اس مختصر مضمون میں تمام ناولوں کا احاطہ ناممکن ہے۔

فکشن کے تئیں سازگار فضا تشکیل دینے کی کوشش ہمارے فکشن نگار کر رہے ہیں، اس کوشش میں کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب تحریر کو ناپختہ احساسات اور فکری انتشار کا ملغوبہ بننے سے محفوظ رکھا جائے اور وہ معیار پیش نظر ہوں، جن کی بنیاد پر کوئی تخلیقی تجربہ اعتبار حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

گذشتہ صفحات میں پیش کیے گئے نام فکشن صدی کی مصنوعی فضا کو با قرینہ اور زرخیز بنانے کے لیے کافی تو نہیں مگر اطمینان بخش ضرور ہیں۔اس اطمینان بخش فضا کو بحال رکھنے کے لیے ان تخلیقات پر گفتگو اور قابل ذکر صفات کو سراہنے کے ساتھ ساتھ خامیوں کی بھی نشاندہی کی جانی چاہیے تاکہ اس صدی کا فکشن وقت کی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد بھی قاری کے حافظے کا حصہ بن سکے۔

■

Ahsan Ayyubi
C-4/3,Suroor Apartment,Sir Syed Nagar
Aligarh-202001
Mob:9616272524

مہ جبین خاں

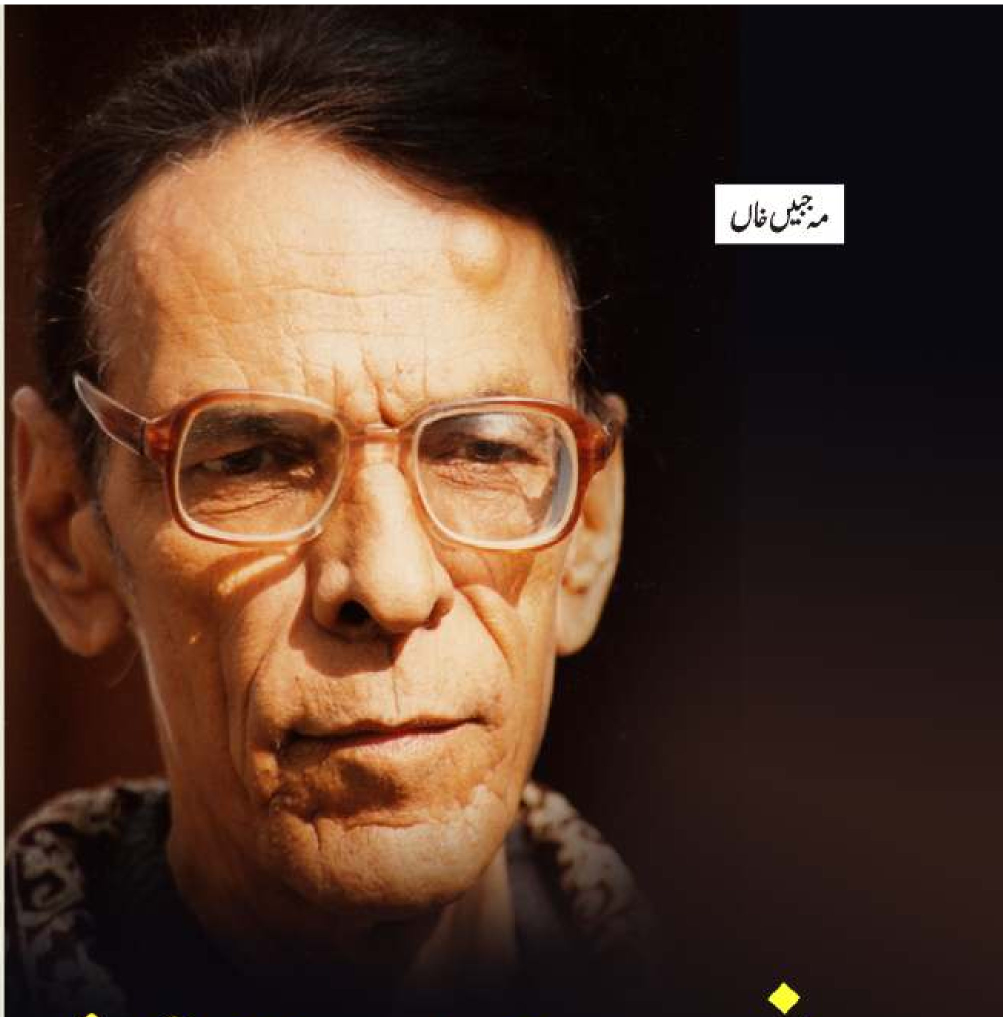

نیر مسعود کی غیر افسانوی خدمات

نیر مسعود اردو ادب میں ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ان کے علمی و ادبی کارنامے مختلف النوع ہیں۔ان کا شمار جہاں اردو کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے وہیں اردو کے غیر افسانوی ادب یعنی تحقیق، تنقید، تدوین، خاکہ نگاری اور ترجمہ نگاری کے میدان میں بھی وہ نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔بالخصوص جن دو مختلف و متضاد میدانوں میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ ان کی افسانہ نویسی اور تحقیقی و تنقیدی کارنامے ہیں۔ان کی شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں میں کون سا پہلو زیادہ اہم ہے یہ طے کرنا مشکل ہے۔

ایک طرف ان کی افسانہ نگاری کے اعتراف میں انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے اور دوسری طرف ان کے تحقیقی کارنامے 'رجب علی بیگ سرور۔حیات اور کارنامے' کے لیے میر اکادمی انھیں اعزاز سے سرفراز کر چکی ہے۔چنانچہ اپنے تخلیقی سفر اور ادبی حیثیتوں کی وضاحت نیر مسعود نے درج ذیل الفاظ میں کی ہے:

''اصل میں میرے دو ہی میدان رہے ہیں تحقیق اور افسانہ۔بعض لوگ غالباً اس کو متضاد سمجھتے ہیں مگر یہ ہیں نہیں، یہ دونوں اصناف ادب ہیں اگر دو بالکل الگ قسم کی چیزوں میں انسان کو دلچسپی ہو سکتی ہے جیسے مرغی پالنے اور افسانے لکھنے سے تو پھر اصناف ادب سے کیوں نہیں ہو سکتی۔افسانے کے قاری بہت ہیں تحقیق کم لوگ پڑھتے ہیں۔لہٰذا اس حوالے سے لوگ زیادہ مانتے ہیں تعارف میں ضمناً لوگ لکھتے ہیں کہ تحقیق کا کام بھی کرتا ہوں ابھی افسانوں کی دو کتابوں کا ترجمہ ہوا ہے ظاہر ہے کہ حیات انیس یا معرکہ انیس و دبیر کا ترجمہ کوئی نہیں کرے گا مگر میں نے افسانے کے مقابلے میں دس گنا زیادہ تحقیق پر کام کیا ہے اس کی میں نے پرواہ نہیں کی کہ افسانے سے زیادہ فائدہ شہرت اور مقبولیت ملی۔''[1]

نیر مسعود کی ولادت 16 / نومبر 1936 کو لکھنؤ میں ہوئی صغرسنی سے ہی انھیں مطالعے کا بہت شوق تھا۔ان کے گھر میں ادبی کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا اس لیے فطری طور پر ادبی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔یہ کتابیں زیادہ تر ریسرچ کی اور اودھ کی تاریخ یا تنقید کی تھیں۔نیر مسعود کے والد سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں پروفیسر تھے اور ان کی خصوصی دلچسپی تحقیق و تنقید جیسے موضوعات سے تھی اور اکثر کتابیں اسی قسم کی ان کے گھر میں موجود تھیں۔چنانچہ نیر مسعود پانچ سال کی عمر میں محمد حسین آزاد کی 'آب حیات' جیسی ضخیم کتاب ہجے کے ساتھ پڑھ چکے تھے اور دس سال کی عمر تک آتے آتے 'دربار اکبری' اور اسی قسم کی کئی دوسری ضخیم کتابیں پڑھ چکے تھے۔[2]

نیر مسعود نے اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز اپنے تحقیقی کارنامے 'رجب علی سرور حیات اور کارنامے' سے کیا۔اردو میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد 1965 میں ان کے تحقیقی مقالے 'رجب علی بیگ سرور اور ان کے قلمی آثار' کے کچھ حصے الہ آباد یونیورسٹی میگزین کی طرف سے شائع کیے گئے۔بعد میں 1967 میں یہی مقالہ 'رجب علی بیگ سرور: حیات و خدمات' کے عنوان سے کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔[3] بلاشبہ رجب علی بیگ سرور اردو کے ان زندہ جاوید ادیبوں میں شامل ہیں جنھیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کر پائے گی اور ان کی اس شہرت اور مقبولیت کی اصل وجہ فسانۂ عجائب ہے۔لیکن قارئین کے حلقے نے فسانۂ عجائب کو جس قدر پڑھا اور پسند کیا اس کے مصنف پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔یہی وجہ ہے کہ فسانہ عجائب کی اتنی مقبولیت کے باوجود سرور پر تحقیقی کام کم وجود میں آیا بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ نیر مسعود کے کارنامے 'رجب علی بیگ سرور حیات اور کارنامے' سے پہلے اردو ادب میں سرور پر کوئی مکمل کتاب موجود نہیں تھی اور یہ بات بھی کہنے کی گنجائش ہے کہ نیر

مسعود کے بعد بھی سرور سے متعلق کارناموں میں کوئی اہم اضافہ سامنے نہیں آیا ہے اس لحاظ سے سرور کی سوانح اور تصانیف سے متعلق اب تک کا سب سے جامع اور مکمل کارنامہ نیر مسعود کا ہے۔ سرور پر تحقیقی کام کرنے والے تقریباً تمام محققین نے اپنی تصانیف میں نیر مسعود سے استفادہ کیا ہے اور ان کی پیش کردہ شہادتوں اور حوالوں کو مستند و معتبر تسلیم کیا ہے۔ نیر مسعود سے رجوع کرنے والے محققین میں اردو کے نامور محقق رشید حسن خاں، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر گیان چند، پروفیسر حنیف نقوی، ڈاکٹر سید سلیمان اور پروفیسر ابن کنول وغیرہ کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

نیر مسعود نے تحقیق کے تمام اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی کے ساتھ سرور کی زندگی کے بکھرے ہوئے اوراق کو اپنی اس کتاب میں یکجا کر دیا ہے جس سے سرور اور ان کے احوال و آثار سے متعلق بہت سی مبہم باتیں مترشح اور واضح صورت میں ہمارے سامنے آ گئی ہیں۔ نیر مسعود کی شخصیت کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی تحقیق میں مستند حوالہ جات اور شہادتوں کے بغیر کسی بات کا حتمی تعین نہیں کرتے، کتاب 'رجب علی بیگ سرور حیات اور کارنامے' کے آخر میں شامل تتمہ اس بات کا ثبوت ہے جس میں سرور سے متعلق ایسے نکات زیر بحث لائے گئے ہیں جن پر ابھی مزید تحقیق درکار ہے۔ سرور سے متعلق تحقیقی بحث حنیف نقوی کی تحریروں میں بھی ملتی ہے۔ اس ضمن میں ان کی کتاب 'رجب علی بیگ سرور۔ چند تحقیقی مباحث' (1991) اہمیت کی حامل ہے۔[4]

یہ بحث ہمیں نیر مسعود اور حنیف نقوی کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط میں بھی ملتی ہے۔ استاد محترم پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی عنایت سے راقمہ کو اپنے تحقیقی مقالے پر کام کرنے کے دوران ان غیر مطبوعہ خطوط کا مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ان خطوط میں نیر مسعود نے سرور سے متعلق حنیف نقوی کی تحقیق کو نہ صرف قبول کیا ہے بلکہ ان کی تحقیق کو داد و تحسین کا مستحق بھی قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں نیر مسعود نے ان خطوط میں اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ وہ 'رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے' کی اشاعت ثانی میں حنیف نقوی کی تحقیق کو بطور ضمیمہ شامل کرنا چاہتے ہیں۔ نیر مسعود کی یہ تحریریں نہ صرف تحقیق میں ان کی دیانت داری اور غیر جانب داری کا ثبوت پیش کرتی ہیں بلکہ ان کی بے مثال شخصیت اور اعلیٰ ظرفی کی آئینہ دار بھی ہیں۔ اس بات کا ذکر بھی یہاں ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ بعض ضمنی اختلافات سے قطع نظر حنیف نقوی نے نیر مسعود کی تحقیق کو معتبر اور مستند تسلیم کیا ہے اور نیر مسعود کو 'ماہر سروریات' قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں سرور سے متعلق اپنے دیگر تحقیقی کارناموں (تصانیف سرور اور مقدمۂ کلام سرور) میں بھی حنیف نقوی نے بارہا نیر مسعود سے رجوع کیا ہے۔

تحقیق کے میدان میں نیر مسعود کا دوسرا بڑا اور اہم کارنامہ 'انیس۔ سوانح' ہے۔ ان کی یہ معرکہ آرا تصنیف 2002 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے اشاعت پذیر ہوئی۔ انیس کی سوانح اور عہد پر یہ ایک مکمل اور جامع کتاب ہے۔ نیر مسعود کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے لکھنؤ اور رثائی ادب سے وابستہ ادبا و شعرا کے حالات زندگی کو خاص طور پر اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور ان سے متعلق تمام تفصیلات کو مکمل اور جامع تحقیقی کارناموں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ نیر مسعود کی زیر بحث کتاب 'انیس۔ سوانح' اسی سلسلے کی ایک کڑی کہی جا سکتی ہے۔

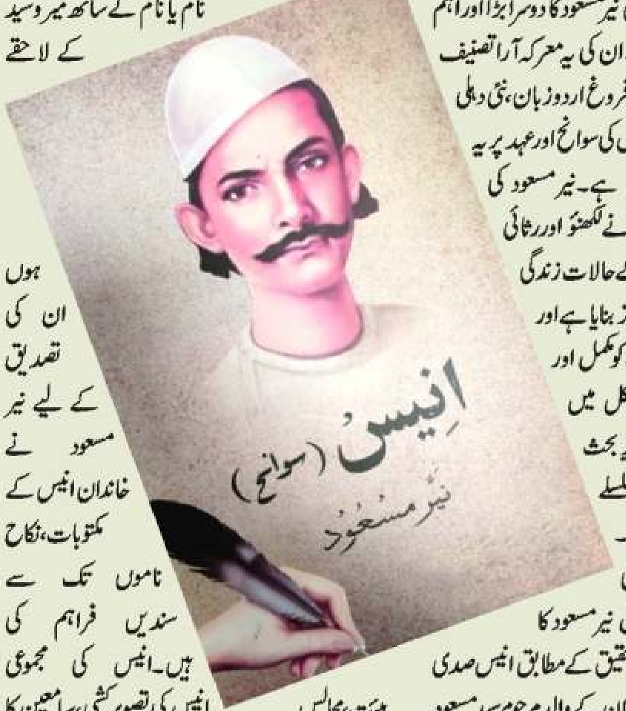

'انیس۔ سوانح' میر انیس کی حیات اور شخصیت سے متعلق نیر مسعود کا لاثانی کارنامہ ہے۔ راقمہ کی تحقیق کے مطابق انیس صدی کمیٹی نے نیر مسعود سے پہلے ان کے والد مرحوم سید مسعود حسن رضوی ادیب سے اس کام کو کرنے کی فرمائش کی تھی لیکن نومبر 1975 میں ادیب کی وفات ہو جانے کے سبب نیر مسعود سے اس کام کے لیے رجوع کیا گیا۔[5] انھوں نے اسی زمانے سے اس کام کا آغاز کر دیا تھا جس کی تکمیل 2000 کے وسط میں ہوئی۔ اس طویل عرصے پر اگر غور کیا جائے تو نیر مسعود نے انیس کی حیات و شخصیت پر اس کام کو تقریباً 25 سال کے عرصے میں مکمل کیا۔ جتنی تعداد میں ماخذ اور حوالے اس کتاب میں پیش کیے گئے ہیں انھیں یکجا کرنا آسان کام ہرگز نہ تھا۔ کیوں کہ یہ تمام حوالہ جات اور شواہد اپنی نوعیت کے اعتبار سے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نیر مسعود کا یہ کارنامہ غیر معمولی ہے کہ انھوں نے انیس کی زندگی کے کسی بھی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے اور چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی تحقیقی تفصیلات کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نیر مسعود کی یہ کتاب اس لحاظ سے بھی اردو ادب میں اولیت کا درجہ رکھتی ہے کہ اس میں پہلی بار انیس کی ادبی شخصیت و شاعری کے تشکیلی مراحل کو زمانے اور سنہ کے ساتھ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیر مسعود نے کوئی بھی بات یا واقعہ صرف اپنی معلومات کی بنیاد پر نہیں لکھا ہے بلکہ اس واقعے سے متعلق جتنے بھی حوالے مل سکتے تھے انھیں تحریر کرنے کے بعد کوئی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ خواہ وہ انیس کا سنہ پیدائش ہو، ان کے اساتذہ سے متعلق تفصیلات ہوں، شعر گوئی کا آغاز ہو یا ان کے نام یا نام کے ساتھ میر و سید کے لاحقے ہوں ان کی تصدیق کے لیے نیر مسعود نے خاندان انیس کے مکتوبات، نکاح ناموں تک سے سندیں فراہم کی ہیں۔ انیس کی مجموعی ہیئت، مجالس انیس کی تصویر کشی، سامعین کا مجمع، معرکۂ انیس و دبیر ان تمام موضوعات پر نیر مسعود نے جس مدلل انداز میں بحث کی ہے وہ ان کے وسعت مطالعہ کا واضح ثبوت ہے۔ جہاں کہیں بھی انھیں اشتباہ کی گنجائش نظر آتی ہے وہ کسی حتمی فیصلے سے احتراز کرتے ہیں اور تحقیقی احتیاط کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ کتاب کو ابتدا سے اختتام تک پڑھنے کے بعد انیس کی شخصیت کا ایک جیتا جاگتا مرقع قارئین کے سامنے آ جاتا ہے۔ انیس کا رعب داب، ان کی نازک مزاجی، ان کے لطیفے اور ان کا حس مزاح ایسے موضوعات ہیں جو انیس کی مکمل شخصیت کو قارئین کے روبرو لا کھڑا کرتے ہیں۔ انیس کی مجالس سے متعلق بیانات جس پر اثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں قاری کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی ان مجالس کا حصہ ہیں۔ نیر مسعود کی کتاب سے پہلے میر انیس کی جو سوانح لکھی گئیں وہ عام طور پر نصابی ضرورتوں کے تحت لکھی گئیں وہ انیس کی شخصیت کے بارے میں بعض ضروری معلومات تو فراہم کرتی ہیں لیکن اس عہد کے حالات اور تہذیب و ثقافت کو پیش نہیں کرتیں جس میں میر انیس اور

مرزا دبیر سانس لے رہے تھے۔اس عہد کا لکھنؤ کیا تھا اس وقت کی معاشی اور تہذیبی صورت حال کیا تھی۔انتزاع سلطنت اودھ کا کیا اثر امرا،شرفا اور شعرا پر پڑا،انیسیے اور دبیریے کی سماجی نوعیت کیا تھی ایسے بہت سے سوال ہیں جن کا جواب میر انیس پر لکھی جانے والی عام کتابوں میں نہیں ملتا۔نیر مسعود نے اس کتاب میں حیات انیس اور اس کے ذیلی متعلقات کو جس جامع انداز میں پیش کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔نیر مسعود کی کتاب ''انیس سوانح'' نہ صرف تحقیق کے تمام تقاضوں پر پوری اترتی ہے بلکہ تحقیق پر کام کرنے والوں کے لیے ایک مشعلِ راہ بھی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ تحقیق کو Systematic اور Scientific طریقۂ کار کے ساتھ کس طرح کرنا چاہیے۔

تحقیق سے متعلق نیر مسعود کے دو اہم کارنامے 'مرثیہ خوانی کا فن' (1990) اور 'معرکۂ انیس و دبیر' (2000) ان کے مذکورہ معرکتہ الآرا کارنامے 'انیس سوانح' کے ہی حصے ہیں۔چونکہ یہ سنجیدہ اور وسیع موضوعات تھے اور ان میں مفصل تحقیقی بحث و مباحثے شامل تھے،جس کی وجہ سے اصل کتاب 'انیس' کے سوانحی حصے کا توازن بگڑ رہا تھا اس لیے نیر مسعود نے ان ابواب کو 'انیس سوانح' سے ہٹا کر علاحدہ کتابی صورت میں شائع کرنا مناسب سمجھا۔[6] یہ دونوں کتابیں اصل کتاب 'انیس' سے پہلے منظر عام پر آئیں۔

'مرثیہ خوانی کا فن' پہلی مرتبہ 1990 میں مغربی پاکستان اردو اکادمی،لاہور سے شائع ہوئی بعد میں اس کی اشاعت ثانی 2005 میں آج کی کتابیں،کے زیر اہتمام،سٹی بک پریس شاپ،کراچی سے ہوئی۔تحت اللفظ مرثیہ خوانی کے فن پر لکھی جانے والی یہ پہلی مبسوط اور جامع کتاب ہے۔اس کتاب میں نیر مسعود نے فن مرثیہ خوانی کے ابتدائی خدوخال اور تشکیلی عناصر سے لے کر اس کے عروج و زوال تک کی داستان تحقیقی حقائق کی روشنی میں بیان کی ہے۔نیر مسعود کا یہ کارنامہ اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ مرثیہ خوانی کے فن کے ساتھ نہ صرف تاریخ ادب بلکہ ایک مکمل تہذیب وابستہ ہے۔مرثیہ خواں کا لباس،اس کا منبر پر آنا،سامعین کا مجمع،خواندگی کے دوران مرثیہ خواں کے حرکات و سکنات اور اس کا طرز خواندگی یہ تمام باتیں ایک مکمل تہذیب کی عکاسی کرتی ہیں باوجود اس کے مرثیہ خوانی کے اصول و قواعد پر اردو کے

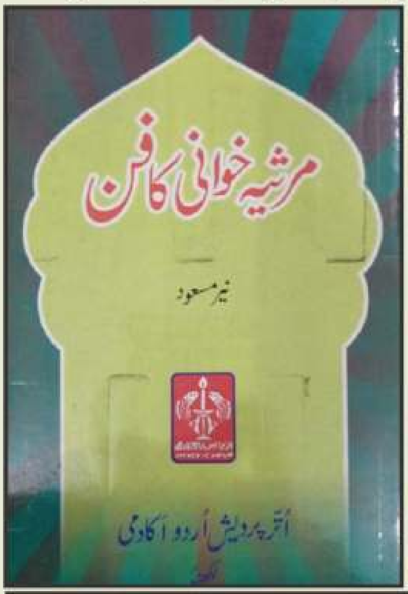

مرثیہ خوانی سے متعلق نیر مسعود نے جو تحقیقی و تنقیدی بحث کی ھے اس سے ان کی رثائی ادب سے گھری دلچسپی و وسعت معلومات کا اندازہ ھوتا ھے۔اور اس بات کا احساس ھوتا ھے کہ یہ صنف مرثیہ سے متعلق ایک بے حد اھم پھلو تھا جسے ھمارے ناقدین نے اپنی توجہ سے محروم رکھا۔نیر مسعود کا یہ کارنامہ نا قابل فراموش ھے کہ انھوں نے مرثیہ سے وابستہ ایک عظیم فن کی بازیافت کی اور اس کے اصول و قواعد کا تعین کیا۔

سرمایہ ادب میں اب تک کوئی مکمل اور مربوط کتاب موجود نہیں تھی۔اس سمت میں پہلا اہم کارنامہ نیر مسعود کا ہے۔انھوں نے اس کمی کا احساس کرتے ہوئے اس موضوع کو اپنی غور و فکر کا مرکز بنایا اور اپنی کتاب 'مرثیہ خوانی کا فن' میں مرثیہ گوئی کی صنفی حیثیت سے صرف نظر کرتے ہوئے مجالس میں اس کی خواندگی کے اصول و قواعد سے ہمیں روشناس کرانے کا گراں قدر کارنامہ انجام دیا۔مرثیہ خوانی سے متعلق نیر مسعود نے جو تحقیقی و تنقیدی بحث کی ہے اس سے ان کی رثائی ادب سے گہری دلچسپی و وسعت معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔اور اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہ صنف مرثیہ سے متعلق ایک بے حد اہم پہلو تھا جسے ہمارے ناقدین نے اپنی توجہ سے محروم رکھا۔نیر مسعود کا یہ کارنامہ نا قابل فراموش ہے کہ انھوں نے مرثیہ سے وابستہ ایک عظیم فن کی بازیافت کی اور اس کے اصول و قواعد کا تعین کیا۔

'معرکۂ انیس و دبیر' محمدی ایجوکیشن،کراچی سے 2000 میں شائع ہوئی۔معرکۂ انیس و دبیر کا نام آتے ہی ہمارا ذہن شبلی کی 'موازنۂ انیس و دبیر' (1907) کی طرف لازماً منتقل ہو جاتا ہے اور ہم یہ قیاس کرنے لگتے ہیں کہ شبلی کی طرح نیر مسعود نے بھی کلام انیس و دبیر کا فنی موازنہ و مقابلہ پیش کیا ہوگا۔لیکن اس کتاب کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نیر مسعود نے موازنے اور مقابلے سے ہٹ کر ایک الگ راہ کا سفر طے کیا ہے انھوں نے اس کتاب میں دونوں عظیم مرثیہ نگاروں کی معرکہ آرائی کے جملہ سماجی و تہذیبی پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے جو اس معرکے کے اصل محرک تھے۔[7] یہ کتاب اس لحاظ سے منفرد ہے کہ نیر مسعود نے انیس و دبیر کے کردار و شخصیت کے موازنے کو معرکے کا نام دیتے ہوئے تقابلی کارروائی سے گریز کیا ہے۔انھوں نے تمام شواہد و حوالوں سے ان دونوں شخصیتوں کے کردار و عادات و خصائل قارئین کے سامنے آئینے کی طرح پیش کر دیے ہیں۔نیر مسعود کا یہ کارنامہ نہ صرف تحقیق کے معیار پر پورا اترتا ہے بلکہ ان کے معتدل و متوازن انداز تنقید کا بھی عمدہ نمونہ پیش کرتا ہے۔

'میر انیس' 'انیس سوانح' کے سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ یہ دراصل نیر مسعود کی ضخیم کتاب 'انیس سوانح' کی تلخیص ہے۔اس میں تحقیقی مباحث،حوالوں اور ماخذوں کی تفصیل وغیرہ حذف کر کے اختصار کے ساتھ صرف سوانح انیس کو برقرار رکھا گیا ہے۔اس کتاب کا مقصد آئندہ نسلوں کو اردو زبان و ادب کے بنیاد گزاروں کی علمی،ادبی ولسانی خدمات سے آگاہی اور واقفیت حاصل کرانا ہے۔

لکھنویات سے متعلق نیر مسعود کا ایک اور مستند کارنامہ 'یگانہ احوال و آثار' ہے۔یہ کتاب 1990 میں انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی سے شائع ہوئی۔اپنی ضخامت کے اعتبار سے نیر مسعود کا یہ مختصر کارنامہ موضوع اور مواد کے لحاظ سے بے حد اہم ہے۔اس کتاب میں نیر مسعود نے یگانہ کی شخصیت،فن اور ان کے ادبی معرکوں سے متعلق سات مضامین شامل کیے ہیں۔ان مضامین میں نیر مسعود نے نہایت معقول اور مدلل انداز میں یگانہ کی ذہنی کجروی اور پیچیدہ نفسیاتی شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔ دراصل یگانہ نے اپنی زندگی کے مشکل ترین دور میں ایک عرصے تک نیر مسعود کی رہائش گاہ 'ادبستان' میں ان کے والد مسعود حسن رضوی ادیب کے ساتھ قیام کیا تھا۔[7] چنانچہ نیر مسعود کے لیے یگانہ سے متعلق معلومات کا سب سے معتبر اور بنیادی ماخذ ادیب کی ذات تھی۔[8] علاوہ ازیں خود نیر مسعود نے یگانہ کی زندگی کے آخری چند برس بہت قریب سے دیکھے تھے لہٰذا نیر مسعود بہ ذات خود ایک بنیادی اور معتبر ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔نیر مسعود کو یگانہ سے متعلق مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کا علم تھا۔اور اس

کتاب میں انھوں نے یگانہ کے تعلق سے بعض ایسے حقائق بھی بیان کیے ہیں جن کا تذکرہ دیگر محققین و ناقدین کے یہاں ناپید ہے۔علاوہ ازیں نیر مسعود نے یگانہ کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بھی ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے اور نہایت غیر جانب داری کے ساتھ ان کی شخصیت اور فن کا جائزہ لیتے ہوئے ادب کے قارئین کے لیے یگانہ شناسی کی راہیں استوار کی ہیں۔

'یگانہ احوال و آثار' میں یگانہ کی پیچیدہ اور نفسیاتی شخصیت سے متعلق تمام حقائق کو نیر مسعود نے جس معروضیت، منطقیت اور دقیقہ رسی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ تحقیق کی ایک عمدہ مثال ہے۔نیر مسعود کی یہ کتاب چند متفرق مضامین پر مبنی ہونے کے باوجود یگانہ کی زندگی کے بیشتر اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔اس کتاب کے ذریعے نیر مسعود نے اپنے پیش روؤں کے لیے یگانہ شناسی کی راہیں استوار کردی ہیں۔اس کی عمدہ مثال مشفق خواجہ کے مرتبہ 'کلیات یگانہ' سے دی جاسکتی ہے جس میں انھوں نے مقدمے میں نیر مسعود کے بیانات کو بنیادی حوالے کے طور پر برتا ہے۔ چنانچہ 'یگانہ احوال و آثار' یگانہ کی سوانح بھی ہے اور یگانہ کی تحریروں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ بھی۔نیر مسعود کی یہ تحقیقی تصنیف یگانہ شناسی کی سمت میں ایک اہم اور معتبر کارنامہ ہے۔

تحقیق کے ساتھ ساتھ نیر مسعود کو تدوین سے بھی گہری دلچسپی ہے۔انھوں نے کئی پارینہ نسخوں اور مخطوطوں کو تحقیق و تدوین کے اصولوں کے مطابق مرتب کرنے کا مستحسن فریضہ انجام دیا ہے۔اس سلسلے میں ان کے کارنامے دولہا صاحب عروج (1980) اور شفاء الدولہ کی سرگزشت (1990) تحقیق اور تدوین دونوں اصناف پر مبنی ہیں۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں عرض کیا جاچکا ہے کہ رثائی ادب، انیس اور متعلقین انیس نیر مسعود کے دلچسپ تحقیقی موضوعات ہیں۔ان موضوعات پر نیر مسعود نے خصوصی توجہ مرکوز کی ہے۔نیر مسعود کی کتاب 'دولہا صاحب عروج' (1980) اس سلسلے کی اولین کڑی کہی جاسکتی ہے۔ 1980 میں انھوں نے انیس کے پوتے اور لکھنؤ کے آخری باکمال مرثیہ خواں 'خورشید حسن عرف دولہا صاحب عروج' کی سوانح عمری کو مرتب کرکے 'اردو پبلشرز، لکھنؤ' سے شائع کروایا۔بعد میں اس سلسلے کو مرثیہ خوانی کا فن، موازنہ انیس و دبیر، انیس سوانح اور 'میر انیس' جیسی معرکہ آرا کتابوں نے آگے بڑھایا ہے۔موضوع کے اعتبار سے نیر مسعود کا یہ کارنامہ بے حد اہم ہے کیوں کہ دولہا صاحب عروج کی سوانح و شخصیت سے واقفیت کے لیے یہ کتاب ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔[9]

سید خورشید حسن عرف دولہا صاحب عروج میر انیس کے جانشیں، پوتے اور خاندان انیس کے آخری باکمال مرثیہ خواں تھے۔ان کے بعد لکھنؤ میں مرثیہ خوانی کے میدان میں کوئی قابل ذکر نام سامنے نہیں آیا۔چنانچہ اس کی اشد ضرورت تھی کہ دولہا صاحب جیسی بلند مرتبہ شخصیت پر تحقیقی حوالہ جات کی روشنی میں گفتگو کی جائے۔ نیر مسعود کا یہ کارنامہ قابل قدر ہے کہ انھوں نے خاندان انیس اور صنف مرثیہ کی آخری وراثت کے بکھرے ہوئے اوراق کو یکجا کرکے تاریخ ادب میں محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

تحقیق کے ساتھ ساتھ نیر مسعود کو تدوین سے بھی گہری دلچسپی ہے۔انھوں نے کئی پارینہ نسخوں اور مخطوطوں کو تحقیق و تدوین کے اصولوں کے مطابق مرتب کرنے کا مستحسن فریضہ انجام دیا ہے۔اس سلسلے میں ان کے کارنامے دولہا صاحب عروج (1980) اور شفاء الدولہ کی سرگزشت (1990) تحقیق اور تدوین دونوں اصناف پر مبنی ہیں۔

تحقیق و تدوین سے متعلق نیر مسعود کا ایک اور لائق تحسین کارنامہ 'شفاء الدولہ کی سرگزشت' (1989) ہے۔ شفاء الدولہ حکیم سید افضل علی اودھ کے مقتدر رئیس ممتاز عالم دین اور طبیب حاذق ہی نہیں بلکہ اردو، فارسی و عربی میں کامل دستگاہ رکھنے والے کثیر التصانیف بزرگ بھی تھے۔ان کا شمار مشاہیر اودھ کی ممتاز شخصیات میں ہوتا ہے۔آپ نواب واجد علی شاہ کے طبیب خاص اور ہمہ وقتی ندیم بھی تھے۔نیر مسعود کی تحقیق کے مطابق واجد علی شاہ نے اپنی اکثر تصانیف میں بھی شفاء الدولہ کا ذکر کیا ہے۔چنانچہ نیر مسعود نے شفاء الدولہ کی شخصیت و علمیت کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ان پر تحقیق کی روشنی میں گفتگو کی ہے۔کتاب کے آخر میں انھوں نے شفاء الدولہ کی مثنوی قصہ 'عبرت منزل وحشت' کو مرتب کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔[10]

اپنے دائرۂ عمل میں نیر مسعود کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ تحقیق کی گتھیوں کو سلجھانے میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور نظم و ضبط کے ساتھ دید و دریافت کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہیں۔بنیادی اور مستند ماخذ کے حوالے ان کی تحقیق کے لازمی عناصر ہیں۔بعض اوقات بنیادی اور مستند ماخذ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے قیاس یا داخلی شواہد کے ذریعے انھوں نے مسئلے کی پیچیدگیوں کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن ایسے موقعوں پر وہ کوئی حتمی رائے پیش نہیں کرتے بلکہ قاری کو غور و فکر پر آمادہ کرتے ہیں نیر مسعود کا یہ تحقیقی رویہ تحقیق کے وقار کو قائم رکھتا ہے۔ تحقیق و تدوین سے متعلق اپنے تمام کارناموں میں نیر مسعود نے انھیں اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے۔

نیر مسعود کے تدوین سے متعلق کارناموں میں 'دیوان فارسی میر تقی میر: تدوین و تصحیح' غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ میر کا یہ فارسی دیوان نوادرات میں سے ہے۔ 1983 میں انھوں نے میر تقی میر کے غیر مطبوعہ فارسی کلام کی ترتیب و تصحیح کی۔ان کا یہ کارنامہ مجلہ 'نقوش' لاہور، 1983 کے میر نمبر3 میں شائع ہوا۔یہ بات قابل غور ہے خدائے سخن میر تقی میر کے یہ قلمی آثار جن کا مطالعہ ان کے اردو کلام کے مطالعے کے لیے بھی مفید اور بجائے خود بھی دلچسپ ہے ہنوز ناقدین ادب کی توجہ اور زیور طباعت سے محروم تھا نیر مسعود نے اس کی اہمیت و وقعت کا احساس کرتے ہوئے اس کی بازیافت کی اور میر کے اس ضائع ہوتے ہوئے سرمائے کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔نیر مسعود اردو کے ساتھ فارسی زبان و ادب میں بھی اپنی مخصوص شناخت رکھتے ہیں۔اردو کی بہ نسبت فارسی میں ان کی خدمات مختصر ہونے کے باوجود نہایت وقیع ہیں۔فارسی زبان و ادب میں نیر مسعود کی خدمات کا اعتراف حکومت ہند نے انھیں صدر جمہوریہ اعزاز سے سرفراز کرکے کیا ہے۔'دیوان فارسی میر تقی میر: تدوین و تصحیح' نیر مسعود کا دوسرا اہم فارسی کارنامہ ہے۔پہلا کارنامہ ان کا فارسی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس میں انھوں نے فارسی کے مشہور شاعر 'ملا محمد صوفی مازندانی' کے دیوان کی ترتیب و تصحیح کی تھی۔نیر مسعود کا یہ کارنامہ ہنوز طباعت سے محروم ہے۔

تدوین سے متعلق ان کے دیگر اہم کارنامے خطوط مشاہیر بنام مسعود حسن رضوی ادیب، انتخاب بستان حکمت، اسم اعظم، بزم انیس، آگ الاؤ صحرا[11] اور 'دیوان سخن اشرف' ہیں۔ان تمام کارناموں میں نیر مسعود نے تحقیق و تدوین کے تمام اصول و ضوابط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے علمی فرائض کو انجام دیا ہے اور اردو ادب کے گراں قدر سرمایے کے تحفظ کا فریضہ انجام دیا ہے۔

'خطوط مشاہیر بنام مسعود حسن رضوی ادیب' میں نیر مسعود نے اپنے والد مسعود حسن رضوی ادیب کے نام آنے والے مشاہیر ادب کے خطوط کو مرتب کرکے شائع کیا ہے۔یہ کتاب 1984 میں اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ سے شائع ہوئی۔پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب

کی شخصیت اردو ادب میں محتاج تعارف نہیں۔وہ اردو کے بڑے محقق، جید عالم اور بلند پایہ ادیب ہیں اور ان کے علمی اور ادبی کارناموں کا دائرہ نہایت وسیع و وقیع ہے۔یہ کتاب 'خطوط مشاہیر بنام مسعود حسن رضوی ادیب' نہ صرف مسعود حسن ادیب کی ادبی زندگی اور سوانحی گوشوں پر روشنی ڈالتی ہے بلکہ اردو کے بلند پایہ محققین و ناقدین کے درمیان ان کے اعلیٰ ادبی مرتبے کا تعین بھی کرتی ہے۔مشاہیر کے خطوط کے اس مجموعے کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس کے سرسری مطالعے سے بھی ہو سکتا ہے لیکن نیر مسعود کی یہ کوشش قابل تحسین ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو مزید مفید اور دلچسپ بنانے کے لیے تقریباً تمام مکتوب نگاروں کی تحریر اور دستخط اور بعض جگہ مکتوب الیہ کی متعلقہ تحریروں کے عکس اس مجموعے میں شامل کر دیے ہیں جن سے ہمارے بہت سے مشاہیر کی اصل تحریری صورت اور شان خط سے ہمیں وقوف حاصل ہوتا ہے۔[12] نیر مسعود کا یہ کارنامہ اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے اپنے والد اور دیگر مشاہیر ادب کی شخصیت اور ان کے فکر و خیال کو ان خطوط کے ذریعے محفوظ کر کے آئندہ نسلوں کے لیے ایک گراں قدر سرمایہ محفوظ کر دیا ہے۔

'انتخاب بستان حکمت' 1988 میں اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ سے شائع ہوئی۔اس کتاب میں نیر مسعود نے فقیر محمد گویا کی تالیف 'بستان حکمت' کے مخصوص حصوں کو منتخب کر کے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔نیر مسعود نے اردو اکادمی کی فرمائش پر طلبہ کی درسی ضرورت کے تحت یہ کتاب مرتب کی تھی۔[13]

'علی: اسم اعظم' کاظم علی زیدی کی کتاب ہے جس میں انھوں نے حضرت علی کی سوانح کو موضوع بنایا ہے۔ کاظم علی زیدی ایک قابل قدر شخصیت تھے انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ان کتابوں میں 'علی اسم اعظم' سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے چنانچہ نیر مسعود نے یہ کتاب 1993 میں مکتبہ کائنات، دہلی سے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کی ہے۔'بزم انیس' انیس کے منتخب مراثی کا مجموعہ ہے جو 1998 میں رہبر پرنٹرز، لاہور سے اشاعت پذیر ہوا۔یہ ترتیب و تدوین سے متعلق نیر مسعود کا ایک اور اہم کارنامہ ہے جس میں انھوں نے انیس کے بارہ شاہکار مرثیوں کو شامل کیا ہے۔[14] اور ان کے متن کی ترتیب و تصحیح کی ہے۔نیر مسعود کی ترتیب و تقدیم سے متعلق ایک اور گراں قدر کارنامہ 'سخن اشرف' 2006 ہے۔جس میں انھوں نے واجد علی شاہ کے دوسرے دیوان 'سخن اشرف' کو اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ واجد علی شاہ کا دیوان ان کی زندگی میں ہی شاہی مطبع سے شائع ہو چکا تھا۔ چونکہ یہ دیوان اب نایاب ہے اور اس کا ایک ہی نسخہ 'امیر الدولہ پبلک لائبریری' لکھنؤ میں موجود ہے چنانچہ اردو ادب کے اس گراں قدر سرمایے کے تحفظ کے لحاظ سے نیر مسعود نے اسے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کروایا۔

نیر مسعود ایک محقق و مدون ہی نہیں ایک ناقد کی بہترین صلاحیتیں بھی رکھتے تھے۔وہ ایک وسیع النظر نقاد تھے ادب کی ماہیت، اس کے مقاصد اور اس کے طریقہ کار پر ان کی نظر گہری تھی اور وہ ادب کے جملہ مباحث کے متعلق اپنی ایک منفرد رائے رکھتے تھے۔نیر مسعود کی کتاب 'تعبیر غالب' کلام غالب اور فکر غالب سے ان کی شناسائی کی عمدہ مثال پیش کرتی ہے۔'تعبیر غالب' کی پہلی اشاعت 1973 میں نظامی پریس، لکھنؤ سے ہوئی تھی۔

کلام غالب کی شرح پر مشتمل یہ کتاب نہ صرف اردو میں کلاسک کا درجہ رکھتی ہے بلکہ نیر مسعود کی تنقیدی صلاحیتوں کا بھی عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے۔'تعبیر غالب' کی ان شرحوں کا تجزیہ ہمیں بتاتا ہے کہ نیر مسعود کو شاعری کے عیوب و محاسن کی روح کا ادراک تھا۔وہ لغات و الفاظ کے اصل و لغوی مفاہیم، لفظوں کے تعبیری پہلو، استعاراتی و کنایاتی زبان کی سمجھ، لفظ و معانی کے درمیانی رشتوں کی پہچان اور ان رشتوں میں اپنی طرف سے فکر انگیز اور نئی معنویت کے انسلاک کا شعور رکھتے تھے۔ نیر مسعود مغربی اصول نقد و نظر اور علوم و اسلوب کی آگہی کے باوجود مشرقی آداب شعریات و نظریات انتقاد سے زیادہ کام لیتے ہیں۔اپنی اس کتاب میں انھیں اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے انھوں نے کلام غالب کی اصل روح تک رسائی حاصل کی ہے۔کلام غالب کی متعدد شرحیں لکھی گئیں ہیں اور لکھنے والوں نے اپنے اپنے انداز میں غالب کو سمجھنے اور سمجھانے کی کامیاب کوششیں کیں ہیں۔حالیہ برسوں میں بھی کئی اچھی اور دلچسپ شرحیں سامنے آئی ہیں۔نیر مسعود کی 'تعبیر غالب' کا آخری حصہ اگر چہ غالب کے محض چودہ منتخب اشعار کی شرح ہے لیکن اپنے مباحث کے لحاظ سے بڑی وقیع اور مشرقی طرز تنقید کی انتہائی عمدہ کوشش ہے۔اس کتاب سے غالب شناسی اور شعر فہمی کی نئی جہات سامنے آ رہی ہیں جو اس حقیقت کا برملا اظہار ہے کہ نیر مسعود جس کوچے میں گئے اپنی انفرادیت کے نقش روشن کر دیے۔[15]

تنقید سے متعلق ان کا دوسرا کارنامہ 'افسانے کی تلاش' ہے۔کتاب 'افسانے کی تلاش' کی پہلی اور دوسری اشاعت بالترتیب 2017 اور 2018 عرشیہ پبلی کیشنز دہلی

نیر مسعود ایک محقق و مدون ہی نہیں ایک ناقد کی بہترین صلاحیتیں بھی رکھتے تھے۔وہ ایک وسیع النظر نقاد تھے ادب کی ماہیت،اس کے مقاصد اور اس کے طریقہ کار پر ان کی نظر گہری تھی اور وہ ادب کے جملہ مباحث کے متعلق اپنی ایک منفرد رائے رکھتے تھے۔نیر مسعودکی کتاب'تعبیر غالب' کلام غالب اور فکر غالب سے ان کی شناسائی کی عمدہ مثال پیش کرتی ہے۔'تعبیر غالب' کی پہلی اشاعت 1973 میں نظامی پریس،لکھنؤ سے ہوئی تھی۔

سے ہوئی ہے۔یہ کتاب نیر مسعود کے فکشن تنقید سے متعلق مضامین کا مجموعہ ہے جسے آصف فرخی نے مرتب کیا ہے۔ ان مضامین کے تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نیر مسعود نہ صرف ایک بہترین افسانہ نگار تھے بلکہ افسانوں کے پارکھ بھی تھے۔نیر مسعود کے یہ مضامین انھیں فکشن تنقید سے متعلق اہم ناقدین کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔[16]

نیر مسعود کو تحقیق و تنقید اور افسانہ نویسی کے علاوہ بچوں کے ادب سے بھی خاص شغف رہا ہے۔اس موضوع پر ان کی کتابیں 'ڈراما سوتا جاگتا'، 'بچوں کا مشاعرہ' اور 'بچوں سے باتیں' وغیرہ دلچسپ ہیں۔ادب اطفال سے متعلق ان کا ڈراما 'سوتا جاگتا' اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کی جانب سے 1985 میں شائع ہوا۔مذکورہ اصناف کے علاوہ نیر مسعود نے اردو کی دیگر غیر افسانوی اصناف میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔جن میں ترجمہ نگاری، خاکہ نگاری اور سفرنامہ نگاری وغیرہ شامل ہیں۔[17]

نیر مسعود کا شمار اردو کے بڑے مترجمین میں ہوتا ہے۔انھیں اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ادب سے بھی شغف تھا چنانچہ ان زبانوں کی متعدد تخلیقات کو انھوں نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔مغربی ادب میں ان کا مطالعہ وسیع ہے۔علاوہ ازیں انھوں نے ایران کا سفر بھی کیا تھا جس کی وجہ سے وہاں کے تہذیب و تمدن، زبان و بیان کی نفاست، اس کی باریکی اور تہہ داری سے وہ بخوبی واقف تھے۔

'کافکا کے افسانے' ترجمہ نگاری کے حوالے سے ان کا لاثانی کارنامہ ہے۔پہلی مرتبہ یہ کتاب 1978 میں 'شبستان پرنٹرز' الہ آباد سے شائع ہوئی۔نیر مسعود نے اس کتاب میں کافکا کے بیس افسانوں کا ترجمہ پیش کیا ہے۔کافکا کی تحریروں پر یوں تو اردو کے متعدد مترجموں

نے طبع آزمائی کی ہے لیکن یہ ترجمے ان تمام کوششوں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ نیر مسعود ادبی ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ دقیق النظر بھی تھے انھوں نے نہ صرف کافکا کے افسانوں کی معنویت پر غورر کیا ہے بلکہ اس کے طرز نگارش کو بھی گرفت میں لیا ہے اور معانی کی گہرائی تک پہنچ کر پوری مہارت کے ساتھ کافکا کے انگریزی افسانوں کو اردو کے قالب میں منتقل کیا ہے۔[18]

ترجمہ نگاری سے متعلق نیر مسعود کا دوسرا بڑا کارنامہ 'ایرانی کہانیاں' ہے۔اس میں نیر مسعود نے پندرہ جدید ایرانی افسانوں کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ نیر مسعود نے اس کتاب میں جن مصنفین کے آثار شامل کیے ہیں ان میں اسماعیل فصیح، بابا مقدم، جمال میر صادق، شیمن پرتو، صادق ہدایت، غلام حسین ساعدی، فریدون تنکابنی، فریدہ راری، محسن دامادی، منوچہر خسروشاہی وغیرہ ہیں۔ نیر مسعود کا یہ کارنامہ لائق تحسین ہے کہ انھوں نے اس انتخاب کے ذریعے نہ صرف اردو کے سرمایہ ادب میں گراں بہا اضافہ کیا بلکہ شائقین اردو کو جدید ایرانی افسانے سے متعارف ہونے کا موقع بھی فراہم کیا۔'ترجمہ حکیم نباتات' اور جارج لوئی بورخس کی نظموں کا ترجمہ ان کے دیگر اہم تراجم ہیں۔[19]

اردو کے غیر افسانوی ادب میں نیر مسعود نے ایک اچھے خاکہ نگار کی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ خاکہ نگار کی حیثیت سے ان کا مجموعہ 'ادبستان' اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔ 'ادبستان' کے خاکے مربوط منصوبے کے تحت نہیں لکھے گئے یہ مختلف وقتوں میں حادثات وجذبات کے زیر اثر وجود میں آنے والی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ نیر مسعود کے اس مجموعے میں بارہ شخصیات کے خاکے شامل ہیں۔ جن میں رشید حسن خان، ڈاکٹر کیسری کشور، احتشام حسین، مسعود حسن رضوی ادیب، اور ادبستان سے متعلق خاکے خصوصاً قابل تعریف ہیں۔[20]

نیر مسعود نے جس طرح اردو کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی اور بہت خوب لکھا اسی طرح انھوں نے سفرنامے کی روایت کی بھی توسیع کی اور سفرنامہ 'خنک شہر ایران' (1978) لکھا۔ 1977 میں نیر مسعود نے ایران کا سفر کیا اور اپنے سترہ اٹھارہ دن کی مختصر روداد 'خنک شہر ایران' کے نام سے قلم بند کی۔ یہ سفرنامہ پہلی مرتبہ رسالہ 'اظہار' بمبئی شمارہ 4ر 1978 میں شائع ہوا۔ بعد میں یہ سفرنامہ ان کی کتاب 'نیر مسعود کے منتخب مضامین' میں بھی شائع ہوا ہے۔ یہ سفرنامہ نیر مسعود کے اسلوب بیان کا شاہکار ہے۔ نیر مسعود نے بیانیہ میں نہایت شائستہ وشگفتہ انداز بیان اختیار کیا ہے اور بسیار نویسی سے گریز کیا ہے۔

علاوہ ازیں نیر مسعود نے جو منظر نگاری کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ایرانی کلچر، وہاں کے لوگ، ان کا انداز گفتگو، وہاں کی سڑکیں، وہاں کے عجائبات تمام چیزوں کا بیان نیر مسعود نے اس انداز میں کیا ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن ایران کی فضا کی سیر کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ نیر مسعود کا یہ سفرنامہ دلچسپ اور معلومات سے پر ہے۔[21]

'مکاتیب نیر مسعود' قارئین ادب کے لیے ادب اور مشاہیر ادب سے متعلق معلومات کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ ان مکتوبات میں نہ صرف ادب زندہ ہے بلکہ لکھنوی تہذیب بھی زندہ ومتحرک نظر آتی ہے۔ نیر مسعود کے متعدد خطوط ابھی تک مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے کچھ خطوط رسالہ فیضان ادب، مئو، اتر پردیش، شمارہ اپریل تا دسمبر 2018 میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ کتابی صورت میں نیر مسعود کے خطوط ابھی تک منظر عام پر نہیں آئے ہیں۔[22]

نیر مسعود نے چند مخصوص کتابوں پر تبصرے بھی لکھے ہیں۔ جو ان کے معتدل ومتوازن انداز تحریر کا عمدہ نمونہ پیش کرتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی ادبی خدمات میں اردو کی مشہور ومعروف شخصیات کے انٹرویوز بھی شامل ہیں۔ اپنی ان تحریروں میں انھوں نے ادب کے بہترین قاری ہونے کا ثبوت بھی پیش کر دیا ہے۔

نیر مسعود کی ادبی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ دستیاب معلومات کے مطابق افسانوی اور غیر افسانوی ادب سے متعلق اب تک ان کی بتیس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں بائیس سے زائد کتابیں غیر افسانوی ادب سے متعلق ہیں اور مطبوعہ مضامین کی تعداد تین سو کے قریب ہے، جو ملک اور بیرون ملک کے نمائندہ ادبی جریدوں کی زینت بن چکے ہیں۔ ان کتابوں اور مضامین کے مشتملات میریات، غالبیات، رثائیات، انیسیات، لکھنویات، شعریات، تاریخ اور ادب جیسے مختلف اور متنوع موضوعات ہیں۔

نیر مسعود کی مذکورہ خدمات کا محاکمہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نیر مسعود کی شخصیت اور ان کی خدمات مختلف جہات کو محیط ہیں۔ ان کے علمی کارناموں کی دنیا نہایت وسیع و وقیع ہے۔ عصری ادب کی جلوہ گاہ میں وہ اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ اور ان کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ وہ نہ صرف ایک سحر طراز افسانہ نگار ہیں بلکہ ایک نکتہ رس محقق اور نقاد بھی ہیں۔ ان کے تحقیقی وتنقیدی کارناموں کے غائر مطالعے اور مفصل تجزیے کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ نیر مسعود عہد حاضر کے ممتاز و مستند محقق و ناقد ہیں اور ان کا یہ تحقیقی وتنقیدی سرمایہ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

حواشی

1 معرکہ انیس و دبیر، نیر مسعود، محمدی ایجوکیشن، کراچی 2000، ص 5
2 ساگری سین گپتا کے ساتھ انٹرویو۔ منتخب مضامین: نیر مسعود، نیر مسعود، ڈان پرنٹرز، کراچی، 2009، ص 420
3 رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے، نیر مسعود، اسرار کریمی پریس، جانسین گنج، الہ آباد، ناشر شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، 1967
4 رجب علی بیگ سرور، چند تحقیقی مباحث، حنیف نقوی، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دلی، 1991
5 انیس سوانح، نیر مسعود، زیر اہتمام آج کی کتابیں، ذکی سنز پرنٹرز، کراچی، 2005 (ابتدائیہ)
6 انیس سوانح، نیر مسعود، زیر اہتمام آج کی کتابیں، ذکی سنز پرنٹرز، کراچی، 2005 (ابتدائیہ)
7 معرکہ انیس و دبیر نیر مسعود، محمدی ایجوکیشن، کراچی 2000، ص 7
8 یگانہ احوال و آثار، نیر مسعود، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دلی، 1991 ص 24
9 دولہا صاحب عروج، نیر مسعود، اردو پبلشرز، نظیر آباد، لکھنؤ، 1980
10 شفاء الدولہ کی سرگزشت، نیر مسعود، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 2004 (پیش لفظ)
11 آگ اور صحرا، قمر احسن مرتبہ نیر مسعود، شب خون کتاب گھر، الہ آباد، 1980
12 خطوط مشاہیر بنام سید مسعود حسن رضوی ادیب، نیر مسعود، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1985، ص 11,12
13 انتخاب بستان حکمت، نیر مسعود، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1988
14 بزم انیس مرتبہ نیر مسعود، رہبر پرنٹرز، لاہور، 1990، ص 11
15 تعبیر غالب، نیر مسعود، نظامی پریس، لکھنؤ، 1973
16 افسانے کی تلاش، نیر مسعود مرتبہ آصف فرخی، 2017 عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
17 ڈراما سوتا جاگتا، نیر مسعود، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1985
18 کافکا کے افسانے، نیر مسعود، زیر اہتمام آج کی کتابیں، ڈان پرنٹرز، کراچی، 2009
19 ایرانی کہانیاں، مترجم نیر مسعود، آج کی کتابیں، کراچی، 2002
20 ادبستان، نیر مسعود، شہزاد پرنٹرز، کراچی، 2006
21 منتخب مضامین نیر مسعود: نیر مسعود، آج کی کتابیں، ڈان پرنٹرز، کراچی، 2009، ص 381 تا 405
22 سہ ماہی فیضان ادب، مئو، یو پی، جلد نمبر 3، شمارہ 2,3,4، ص 368 تا 415

■

Dr. Mahjabein khan
C/O Faizan khan,
Gata No. 1992/3,
near rosy ice cream plant,
Eidgah road,Hussain ganj,
BANDA, UTTAR PRADESH
210001Contact No: 7007649374

اردو نثر کا ارتقا
ایک سرسری جائزہ

ارشاد سیانوی

ہندوستان کو زبانوں کا عجائب گھر کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں میں اردو کو وہ مقبولیت حاصل ہے جو کم زبانوں کے حصے میں آتی ہے۔ سماج کا ہر فرد اردو زبان کی شیرینی کو پسند کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج اردو شاعری کو ہندو مسلم سکھ عیسائی سب پسند کرتے ہیں۔ اردو میں لکھے گئے گانے ہوں یا نغمے، ترانے ہوں یا گیت سب کے دل جیت لیتے ہیں۔ اردو زبان ملک ہندوستان کے گوشے گوشے میں پسند کی جانے والی زبان ہے۔ اردو واحد ایسی زبان ہے جس نے دیگر کئی زبانوں مثلاً عربی، فارسی، سنسکرت وغیرہ سے اثر قبول کیا۔ جس طرح اردو شاعری کا آغاز دکن سے تسلیم کیا جاتا ہے اسی طرح اردو نثر کے اولین نمونے بھی ہمیں دکن میں نظر آتے ہیں۔ اردو نثر کو بنیاد فراہم کرنے والے صوفیاء کرام کی فہرست بھی طویل ہے۔

پندرھویں صدی سے اردو نثر کو ادبی حیثیت حاصل ہوئی۔ قدیم اردو کی تاریخ بہمنی سلطنت سے شروع ہوئی۔ دکن میں بہمنی سلطنت اردو ادب میں پہلی تخلیقی تجربہ گاہ تھی۔ بہمنی دور میں تصانیف وتالیف کا خوب کام ہوا۔ دکن کے پہلے نثر نگاروں میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اردو کے ابتدائی نثر نگاروں میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، فضل علی فضلی، میر محمد حسین عطا خاں تحسین، میر امن وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ بہمنی سلطنت حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، شاہ میراں جی شمس العشاق وغیرہ صوفیوں کی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ یہاں ایسے تخلیق کار پیدا ہوئے جنھوں نے نثر اور نظم کے سدا بہار چمن کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اوائل عمر میں دولت آباد آئے۔ جب والد کا انتقال ہوا تو واپس دہلی چلے گئے اور حضرت نظام الدین اولیا کے مرید بن گئے۔ حضرت نظام الدین اولیا کے کہنے پر دکن گئے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تمام تصانیف مذہبی تھیں جو صوفیانہ خیالات کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ بہمنی دور میں حضرت خواجہ گیسو دراز کو وہ ادبی مقام حاصل تھا جو بہت کم ادبا و شعرا کے حصے میں آتا ہے۔ آپ نے دکن میں چشتیہ سلسلے کو آگے بڑھایا اور تصوف کے نئے دور کی شروعات کی۔ نئی تحقیق کی رو سے اگر دیکھا جائے تو اردو نثر کی پہلی تصنیف خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی 'معراج العاشقین' ہے۔ حالانکہ آپ کی کئی دیگر تصانیف بھی ہیں جو قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں جیسے ہدایت نامہ، شکار نامہ تلاوۃ الوجود وغیرہ۔ کتاب 'معراج العاشقین' میں ہندی، عربی الفاظ کی آمیزش سے کچھ پیچیدگی محسوس ہوتی ہے۔ دکنی الفاظ کی بھرمار زیادہ ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دکن نے ہمیشہ صوفیاء کرام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ان کا احترام کیا۔ خواجہ بندہ نواز کو جس احترام اور قدر کے ساتھ دیکھا جاتا ہے وہ ان ہی کا حق ہے۔ ان کی پہلی نثری کتاب 'معراج العاشقین' کی عبارت مشکل ضرور ہے لیکن قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کتاب کی عبارت کا ایک نمونہ دیکھیے:

"نبی کہے تحقیق خدا کے درمیان تے ستر ہزار پردے اوجیالے کے ہور اندھیارے کے اگر اس میں تے یک پردہ اٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں۔ ہور ایک وقت ایسا ہوتا ہے اور دیکھ بے پردہ اندھیارے کے اوجیالے کے عارفاں پر ہے واصلاں پر پردے نورانی۔ دے واصلاں کا صفا پردہ ہوتا ہے۔" (معراج العاشقین)

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے پوتے سید محمد عبداللہ حسینی بھی اپنے عہد کے ممتاز نثر نگار تھے۔ آپ کی کئی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ آپ اپنے زمانے کے بڑے صوفی بھی تھے۔ آپ نے اپنے مریدوں اور لوگوں کی ہدایت کے لیے شیخ عبدالقادر جیلانی کے رسالے 'نشاۃ العشق' کا دکنی (قدیم اردو) میں ترجمہ کیا۔

اسی زمانے میں یعنی پندرھویں صدی میں شاہ میراں جی شمس العشاق بھی ایک اہم صوفی گزرے ہیں جن کے مریدوں کی تعداد کافی تھی۔ آپ کی نثری تصانیف کے ساتھ ساتھ شعری تصانیف بھی منظر عام پر آئیں۔ عادل شاہی دور میں آپ کو پہلا نثر نگار قرار دیا گیا ہے۔ آپ کی نثری تصانیف 'جل ترنگ، گل باس، خوش نامہ، شہادت الحقیقت، شرح مرغوب القلوب وغیرہ میں تصوف کے مسائل ملتے ہیں۔ آپ ہندی زبان سے واقف نہیں تھے مگر نبیؐ کے فیضان سے آپ کو ہندی زبان پر دسترس ہو گئی۔ ان کی تصانیف اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہوئیں۔

برہان الدین جانم نے بھی دکنی نثر و نظم میں کمال پیدا کیا۔ آپ نے اپنے والد سے علوم ظاہری و باطنی حاصل کیا۔ آپ نے اپنے والد کے مبارک کام کو آگے بڑھایا۔ 'کلمۃ الحقائق' اور 'ہشت مسائل' ان کی نثری تصانیف ہیں۔ 'کلمۃ الحقائق' میں سوال و جواب کی شکل میں تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں جو مکالمے کی شکل میں ملتے ہیں۔ اس رسالے میں برہان الدین جانم نے اپنے مریدوں کو بتایا کہ انسانی ذات وصفات خدا اور اس کے وجود کو کس طرح جان اور پہچان سکتے ہیں۔ 'کلمۃ الحقائق' کی عبارت کا یہ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

سوال: صحیح ولیکن اس کا بھی شاہد توں ہوں۔

جواب: نوتوں شاہد نور تھا نہ کہ عقل۔

سوال: شاہد گواہ دار و اصل شاہد سوج عقل۔

جواب: صحیح۔ وہ ہدایت قدیم مستقیم سو یو فہم ہے اما عارف الوجود نھوے۔

سوال: اصل نور کا حال اصل کے نو تاریخ کا یہ شناس کیوں جا کھنا؟

جواب: اصل حال وہ کہ جس وقت تیراتج میں سماؤ۔

سوال: تو میرا ربن کہاں بتاؤں ہور کہاں سماؤ ہور کہاں اُپاؤ۔

جواب: تجھے قدرت میں سماؤ ہور قدرت میں اپاؤ۔

سوال: پرچو کیوں؟

جواب: اپنا پرچیت اپس میں دیکھ۔ تجھیں بول پر پرچو لیکھ۔

امین الدین اعلیٰ نے بھی تصوف کے عمدہ خیالات کو اپنی تصانیف میں پیش کیا ہے اور خاندان کی ادبی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ آپ نے قادریہ اور اس کے بعد چشتیہ سلسلے میں بیعت حاصل کی۔ آپ کی کافی نثری تصانیف ہیں۔ شاعری کے مقابلے میں آپ کا نثری کلام زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ خاندانی روایت کے پیش نظر آپ نے تصوف کے گہرے خیالات کو نثری تصانیف میں اُجاگر کیا اور اپنی صلاحیتوں سے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے فضا تیار کی۔ آپ کی نثر میں فارسی کا اثر زیادہ ہے۔ امین الدین اعلیٰ کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے، انھیں مربوط نثر لکھنے کا سلیقہ معلوم تھا۔ یہ تہذیبی روایات سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ نثر میں لکھے رسالے 'گفتار شاہ امین' اور 'گنج مخفی' کا موضوع بھی تصوف ہے۔ 'گفتار امین الدین' میں اللہ تبارک وتعالیٰ اور نبی اکرمؐ کے تعلق سے تشریحات ملتی ہیں۔ جو ان کے مریدوں کے لیے تسکین کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ رسالہ 'کلمۃ الاسرار' شاہ امین الدین کا طویل نثری کارنامہ ہے۔ جس میں اصطلاحات تصوف بہت ہیں۔ اس رسالے کے علاوہ بھی کئی رسالوں کا پتہ چلتا ہے۔ مگر ان رسالوں کے مصنفین کے بارے میں یقین کے ساتھ کوئی فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ مگر بعض مشاہیر ادب ان رسائل کو اسی عہد کی تصانیف قرار دیتے ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

"آپ نے نثر میں بھی چند رسالے لکھے ہیں۔ ایک کا نام رسالہ 'گفتار شاہ امین' ہے اور دوسرے کا نام 'گنج مخفی' ہے۔ ان کا موضوع بھی تصوف ہے۔

انجمن ترقی اردو وغیرہ کے کتب خانے میں اس کے مخطوطات موجود ہیں۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"اللہ تعالیٰ گنج مخفی کوں عیاں کرنا چاہا تو اول اس میں سوں ایک نظر نکلی۔ سو اس سے امین دیکھ ہوا۔ اس سے شاہد کہتے ہیں۔ یو دونوں ذات کے دو طور ہیں۔

اس عہد کے دو اور رسالوں کا پتہ چلا ہے جو نثر میں ہیں۔ لیکن ان کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہوتا مگر مخطوطہ کی اندرونی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اسی زمانہ کی تالیف ہیں۔"

(دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی، ص 58,257، NCPUL نئی دہلی 1985)

شمال میں نثری تصانیف میں فضلی کی 'دہ مجلس' بھی اہم تصنیف ہے، جو فارسی 'روضۃ الشہداء' کا ترجمہ ہے۔ یہ ایک مذہبی کتاب ہے۔ 'دہ مجلس' میں بارہ مجلسیں ہیں۔ یہ اس عہد کی ایک عمدہ کتاب ہے مگر جملے پے چیدہ اور مقفیٰ ہیں۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن کے بادشاہوں نے نثر و نظم کو کافی فروغ دیا۔ عادل شاہی خاندان نے 1490 میں بیجاپور میں اپنی حکومت قائم کی۔ اس عادل شاہی حکومت میں کل آٹھ بادشاہ ہوئے جن میں تین بادشاہوں نے اردو زبان و ادب کی خوب خدمت کی۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی، محمد عادل شاہ اور علی عادل شاہ ثانی کا عہد قابل ذکر ہے۔ عادل شاہ خاندان کے بادشاہوں نے اردو کو کافی فروغ دیا۔ ابراہیم عادل شاہ خود بھی شاعر تھے۔ گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان نے 1508 میں اپنی خودمختار حکومت میں اردو کے فروغ کے لیے بھرپور کوششیں کی۔ عادل شاہی خاندان کی طرح قطب شاہی خاندان میں بھی آٹھ بادشاہ ہوئے جن میں چار بادشاہ اردو شعر و ادب میں دلچسپی لیتے تھے۔ گولکنڈہ کا پانچواں بادشاہ محمد قلی قطب شاہ 1580 میں تخت پر بیٹھا۔ اسے اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر کہا جاتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ملا وجہی نہایت معروف شاعر اور نثر نگار گزرا ہے۔

ملا وجہی کا اصل نام اسد اللہ اور تخلص وجہی تھا۔ ملا وجہی نے قطب شاہی دور کے چار بادشاہوں یعنی ابراہیم قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور سلطان عبداللہ کا زمانہ دیکھا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ملا وجہی نے طویل عمر پائی تھی۔ اسی دور میں ملا وجہی کی 'سب رس' منظر عام پر آئی جس کا قصہ نہایت دلکش اور زبان سادہ وسلیس ہے۔ یہ اردو کی پہلی داستان ہے جو ملا وجہی نے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر 1635 میں لکھی جو تصوف کی اچھی کتابوں میں سے ایک ہے۔ یہ عشقیہ اور تمثیلی داستان دکنی زبان میں لکھی گئی۔ یہ ایک فرضی قصہ ہے مگر اس میں انسانی جذبات و احساسات کی سچی ترجمانی ملتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا شگفتہ اسلوب ہے۔ عبارت مقفیٰ مسجع ہے لیکن سلاست اور سادگی ہی اس کی خاصیت ہے۔ 'سب رس' کے بعد اسرار توحید بھی اہم تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ 'تاج الحقائق' بھی ملا وجہی کی اہم تصنیف ہے۔ 'تاج الحقائق' کا تذکرہ مولانا عبدالحق نے کیا ہے جو تصوف اور نثر پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی عبارت پیش نظر ہے:

"عشق خدا کوں بھید یا تو اس کی خاطر آسمان زمین ہویدا کیا۔ عشق خدا کوں بھیدیا۔ تو اپنا حبیب کر محمد کوں پیدا کیا اگر محمدؐ نا ہوتا تو آسمان زمین نا ہوتا اگر محمدؐ نہ ہوتا تو ماہ پیردیں نہ ہوتا، اگر محمدؐ نہ ہوتا تو دنیا ہوردیں نا ہوتا۔ صاحب طٰہٰ ویٰسین صاحب رحمتہ العالمین جس کے نور تے عالم نے پایا۔"

شمالی ہند میں فضلی کی 'کربل کتھا' بھی کافی مقبول ہوئی۔ شمالی ہند کی یہ پہلی تصنیف ہے جو قدیم وجدید اردو نثر کے درمیان کڑی تسلیم کی جاتی ہے۔ 1875 میں عطا حسین خاں تحسین نے 'نوطرز مرصع' تحریر کی جو فارسی قصہ 'چہار درویش' پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی عبارت بھی رنگین اور مقفیٰ نظر آتی ہے۔ اسے اردو کی عمدہ کتاب تسلیم کیا جاتا ہے، جس میں فارسی جملوں کی بھرمار ہے۔ جو ملا حسین واعظ کاشفی کی کتاب 'روضۃ الشہداء' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں واقعہ کربلا اور حضرت امام حسین کی شہادت کو منفرد انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ 'نوآئین ہندی' بھی شمالی ہند میں لکھی جانے والی ایک اہم داستان ہے جس کے مصنف مہر چند ہیں۔

اردو نثر کے فروغ میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ اسی کالج کے سربراہ تھے۔ فورٹ ولیم کالج میں ترجمے کا بڑا کام کیا گیا۔ اردو زبان و ادب کی بڑی خدمات انجام دینے والے اس کالج کا مقصد انگریزوں کو یہاں کی زبان اور تہذیب وتمدن سے روشناس کرانا تھا۔ جدید اردو ادب کی خدمات میں اس کالج کا بڑا ہاتھ ہے۔ آرائش محفل، طوطا کہانی، لیلیٰ مجنوں، باغ وبہار، قصہ مہر افروز و دلبر وغیرہ اس کالج سے شائع ہونے والی تصانیف ہیں مگر اس کالج کی تصانیف میں جو مقام و مرتبہ میر امن کی 'باغ وبہار' کو حاصل ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں۔ مجموعی طور سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو نثر کے ارتقا میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے لے کر اردو نثر کا سفر سید محمد عبداللہ، میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ، فضل علی فضلی، ملا وجہی سے گزرتا ہوا فورٹ ولیم کالج تک پہنچا تو اس کالج سے ایسے ادیب اور ترجمہ نگار پیدا ہوئے جنھوں نے بہت سی کتابوں کے ترجمے عربی اور فارسی سے اردو کی سادہ نثر میں کیے اور اردو نثر کو وقار عطا کیا۔ جدید اردو نثر کی بنیاد میں اس کالج کا اہم رول رہا۔ فورٹ ولیم کالج میں جتنی بھی تصانیف منظر عام پر آئیں ان پر فارسی کا اثر رہا۔ اس لیے زیادہ تر تصانیف میں سادگی اور سلاست کی کمی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میر امن دہلوی کی باغ و بہار میں سادگی اور سلاست نظر آتی ہے مگر اس داستان کو چھوڑ کر دیگر تخلیقات میں سادگی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

■

Irshad Sayanvi
Dept of Urdu
Chaudhary Charan Singh University,
Ramgarhi
Meerut-250001 (UP)

عامر مظفر بھٹ

جکری

دکن کے ابتدائی دور کی مقبول صنف

نویں اور دسویں صدی ہجری میں گجری روایت کی ایک مقبول و معروف صنف کا نام 'جکری' ہے۔ شیخ بہاو الدین باجن نے سب سے پہلے اس صنف سخن کو متعارف کرایا اور اس کی ماہیت نیز مقصد پر روشنی ڈالی۔ یہ صنف سخن گجری اردو کے ساتھ مخصوص ہے اور اردو شاعری کی پہلی اور قدیم ترین روایت میں شمار ہوتی ہے۔ جکری دراصل ذکری کی گجری شکل ہے۔ متاخرین علمائے ادب نے گجری روایت کے پیش نظر جکری کے طرز املا کو برقرار رکھا ہے۔ اس صنف میں بنیادی طور پر ذکر خدا، ذکر رسول، ذکر پیر و مرشد، ذکر تجربات باطنی اور واردات روحانی وغیرہ کو عام فہم الفاظ میں لکھا جاتا ہے، جسے آسانی کے ساتھ گایا جاسکے اور ساز پر بجایا بھی جاسکے۔[1] تاکہ لوگوں کے اندر وجد و سرور طاری ہو، اور وہ عشق الہی کے ولولے اور اس کے سوز و گداز کو اپنے دل میں محسوس کرسکیں۔ جکری میں عشق و محبت کے جذبات اور ایسے ناصحانہ مضامین بھی ہوتے ہیں جس سے طالبوں اور مریدوں کی ہدایت بھی کی جاتی تھی۔

حضرت شیخ بہاوالدین باجن نے 'خزائن رحمت اللہ' کے 'خزینہ ہفتم' میں جکری کی تعریف کرتے ہوئے اس صنف نغمہ کے مقصد و ماہیت پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

''درذکر اشعار کہ مقولہ این فقیر است، بزبان ہندوی جکری خوانند و قوالان ہند آمنرا در پردہ ہائے سرودمی نوازند و می سرایند، بعضے در مدح پیر دستگیر و وصف روضہ ایشان و وصف وطن خود کہ گجرات است و بعضے در ذکر مقصد خود و مقصودات مریداں و طالبان و بعضے در ذکر عشق و محبت......''

مذکوہ بالا اقتباس کا مطلب راقم کے لفظوں میں یہ ہے کہ ''اِن اشعار کا تذکرہ کرتے ہوئے جس کے موضوع کا تعلق اس فقیر سے ہے وہ لوگ ہندوی زبان میں جکری گاتے ہیں اور ہندوستانی شاعر پردے میں گاتے اور بھجن کرتے ہیں۔ کبھی کبھار عمر رسیدہ بزرگ قیدیوں کی تعریف میں، یا ان کے مزارات کو بیان کرتے ہیں اور ان کا وطن گجرات بیان کرتے ہیں اور کبھی اپنی منزل اور شاگردوں اور مریدوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے مقاصد کا تذکرہ کرتے ہیں.....''

مذکورہ اشعار جن کا تعلق اس فقیر سے ہے، جسے لوگ ہندوی زبان میں جکری کہتے ہیں اور ہندوستانی شعرا ساز پر گاتے اور بجاتے ہیں۔ کچھ تو اپنے پیر کی مدح اور ان کے روضے کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ اپنے وطن جو کہ گجرات ہے، کا ذکر کرتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے مقصد یا اپنے مریدوں یا طالب علموں کے مفاد کو سامنے رکھتے ہیں یا کچھ لوگ جکری میں عشق و محبت کا تذکرہ کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات ہمارے ذہن میں رہے کہ اس اقتباس کے مطالعے سے حضرت شیخ بہاوالدین باجن کے موضوعات کا علم ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے کہے ہوئے جکریوں میں باندھے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جکری کا کوئی موضوع مخصوص نہیں۔ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، قاضی محمود دریائی کے ترجمے میں جکری کا تعارف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

صاحب 'خزینۃ الاصفیاء' کے حوالے سے محمود شیرانی نے جکری کی ایک اور تعریف نقل کی ہے۔ ملاحظہ ہوں:

''اشعار عاشقانہ بزبان ہند فرمودے کہ قوالان آن دیار بوقت سماع اشعار آنجناب بہ مجلس اصفیا میخوانند و بغایت موثر می باشند۔''[2]

جکری ہیئت کے اعتبار سے بھجن اور گیت ہی کی ایک شکل ہے، جس میں دوہروں کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ گجری روایت میں اس صنف سخن کو متعارف کرانے والوں نے اس کے ارکان کو اپنے طور پر برتا ہے۔ چنانچہ شیخ بہاوالدین باجن کے یہاں اس کے ارکان اس طرح

ہیں کہ ابتدائی اشعار جو ہم قافیہ ہوتے ہیں 'عقدہ' کہلاتے ہیں۔ اس کے بعد تین تین چار چار مصرعوں کے بند آتے ہیں، جنھیں 'چین' کہا جاتا ہے۔ آخری بند جو عام طور پر تین مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے 'تخلص' کہلاتا ہے۔ پہلے دو مصرعے ہم قافیہ جبکہ تیسرا مصرع الگ قافیہ میں ہوتا ہے، لیکن یہ تینوں ہم وزن ہوتے ہیں۔ ہر جکری میں عنوان کے تحت یہ واضح کردیا جاتا ہے کہ اسے کس راگ کے مطابق لکھا گیا ہے۔ مثلاً ''عقدہ در پردۂ صباحی، عقدہ در پردۂ بلاول اور عقدہ در پردہ للت وغیرہ۔

عقدہ در پردۂ صباحی کی مثال۔

سب پھل باری تو ہیں بھونرا بہو بھر لیو باس
راول میرا راج کرے ری مندر کے پاس
باجن باجن تیرا تجھ باجیں نا جیون میرا

عقدہ در پردہ بلاول کے نمونے بطور مثال۔

شراب محبت بھر بھر پیالے
آتش عشقت نقل نوائے

پس روئے رسول مالامالی
نبی رسول کی چنوں چالی
بھکاری آیا عیدی مانگے
ہیری کا کچھ تجھ دھر سانگے
صحت تن اور عمر دراز
رزق فراخ توفیق نماز
اوکن سکلی کن کر لیجیں
باجن کو دیکھن لیجیں

عقدہ کی مثال۔

تھن پائیں دی رج بسلایا دبھرا کے اک کلال
خوب ملیں صندلی رنگ نیلے پیلے کالے لال2

چین کی مثال۔

شہ جو لایا چندنا چوہا چولہ مہوکے
ہوئی جو آئی تو شہ کی میرا جیورا ہو کے
جائی جوئی موگرا چن چن لایا مالی
کچھ کندری کچھ کھولے شہ تیری تائیں تھالی
مائی بہنے مل کر دیو یوں آسیسا
یہ بنائی جیوری گور لگ پریا

تخلص کی مثال۔

باجن تیرا باؤلا تجھ کارن تیپے دھمکے
نبی محمد مصطفیٰ سیں نور جگ میں جھمکے

عقدہ کے علاوہ مندرجہ بالا مثالیں جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو سے ماخوذ ہیں۔3

شاہ علی محمد جیوگام دھنی نے جکری کی اسی ہیئت کو برقرار رکھتے ہوئے عناصر ترکیبی کے نام میں فرق کیا ہے۔ انھوں نے جکری کو مکاشفہ کا نام دیا ہے اور ہر بند کو 'نکتہ' قرار دیا ہے۔ جکری کی پوری نظم 'مکاشفہ' کے نام سے موسوم ہوتی ہے جب کہ شیخ باجن نے اپنی نظم کو 'عقدہ' اور بند کو 'چین' کے نام سے موسوم کیا ہے اور آخر کے تینوں مصرعوں کو 'تخلص' کا نام دیا ہے۔

جکری کے ممتاز شعرا میں سے ایک شیخ بہاوالدین باجن نے ایک سو بائیس سال کی طویل عمر پائی۔ انھیں موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا اسی لیے اپنا تخلص باجن اختیار کیا۔ فارسی میں 'خزائن رحمت اللہ' کے نام سے ان کی ایک یادگار تصنیف ہے، جس میں شیخ باجن نے جا بجا اپنا اردو کلام بھی درج کیا ہے۔ اس کتاب کے ایک باب کا نام 'خزینۂ ہفتم' ہے، جس میں دوسروں کے اقوال کے ساتھ اپنے اشعار اور جکریاں بھی درج کی ہیں۔ ان اشعار کی زبان نویں صدی ہجری کی زبان ہے، جن میں اسلامی اور ہندوی اثرات مل جل کر ایک ایسی شکل اختیار کرتے ہیں جو گجری اردو کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کی کتاب 'خزائن رحمت اللہ' کے بارے میں تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

''لسانی اعتبار سے باجن کی تصنیف 'خزائن رحمت اللہ' بہت قدر و قیمت کی حامل کتاب ہے۔ اس کی اہم ترین قدر یہ کہ یہ اردو کے قدیم ترین روپ کا مستند نمونہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ باجن کی ایک اور اہم قدر یہ ہے کہ اس میں اردو غنائیہ شاعری کی روایت پروان چڑھتی ہے۔''4

شیخ باجن کی جکریوں کے نمونے حسب ذیل ہیں۔

اللہ سیتیں جے کوئی ہوئے
اللہ اور جگ اس کا ہوئے
من مراد گھر بیٹھے پاوے
اس کو مار نہ سکھے کوئے
کوئی اللہ سیتیں اللہ کے
سہتیں باجن درویش پر مناوے
اللہ ہوں کو چہ سہتیں بیٹھی بھکیاوے

ایک دوسری مثال میں عقدہ در پردۂ للت کا یہ بند ملاحظہ ہو

کھولو کھولو ری پار دکھلاؤ سکھو
جس سکھو دیکھیں میری نینو جی سکھو
جس سکھو دیکھیں دکھ دلندر جاوے
شاہ رحمت کا درسن باجن پاوے

اس ادبی روایت کو مستحکم کرنے میں قاضی محمود دریائی کا بھی نام خاصا نمایاں ہے۔ گجرات کے برگزیدہ صوفیا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ قاضی صاحب بیرپور کے رہنے والے تھے، ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت ولولۂ عشق ہے۔ 'تحفۃ الکرام' میں قاضی صاحب کے بارے میں لکھا ہے ''ہنگام جوانی از مقام غوثیت درگزشتہ بمقام محبوبیت در رسیدند۔''5 جمیل جالبی قاضی صاحب اور ان کلام کے بارے میں اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں یوں تحریر کرتے ہیں:

''مزاج کی اس کیفیت اور عشق کی شدت کا یہ اثر ان کے کلام میں محسوس ہوتا ہے۔ دین و دنیا کے سارے امور اسی محور پر گھومتے ہیں۔ عشق کی اس آگ کو وہ موسیقی کی نرمی اور پھوار سے ٹھنڈا کرتے ہیں۔ ان کا بیشتر کلام گانے کے لیے لکھا گیا ہے اور ان کا ایک ضخیم دیوان قلمی صورت میں موجود ہے۔''6

صنف جکری میں گجری کی مروجہ روایت کے مطابق ہندوی اثرات نمایاں ہیں۔ قاضی صاحب نے اپنے کلام کو مختلف راگ راگنیوں اور سروں کے مطابق ترتیب دیا ہے۔ اسی اعتبار سے عنوان قائم کیے ہیں۔ جیسے جکری در پردۂ بلاول، در دھناسری، در بھاکرہ، در سارنگ وغیرہ۔

نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

نین رنگیلوں کے قربان
نین چھبیلوں کے قربان
نین جنجالوں کے قربان
نین سلونوں کے قربان
جن دیکھے سورہ کر دھولے آپس کرے ندھان
دیکھت تین مرک میں موئی جھیل ہوئی نسران
پنکھی پنتھی دیکھت ہوئی کالی کیتی جان

قاضی محمود کا موضوع سخن عشق ہے اور اس عشق کی ہزار ادائیں ان کے کلام میں جھلکتی ہیں۔ ان کا کلام پڑھنے سے زیادہ قوالوں کی زبان اور سازوں کی سنگیت میں اثر کا جادو جگاتا ہے۔

قاضی محمود دریائی بیرپوری کو اپنے والد سے انتہا درجے کی عقیدت تھی۔ اپنے والد کو قاضی محمد کے نام سے یاد کرتے ہیں اور نام کے ساتھ چالندہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں، جو ان کے والد کا لقب تھا۔ والد کے وصال پر جو جکری لکھی ہے وہ قاضی محمود کی اپنے والد سے عقیدت و محبت کی دلیل ہے۔ جس کی مثال درج ذیل ہے:7

قاضی محمد تن شاہ چالندھا پیر لاگوں پائے

جکری کی روایت کو مزید مستحکم کرنے میں گجرات کے ایک اور نامور بزرگ شاہ علی محمد جیوگام دھنی کا نام بھی شامل ہے۔ انھوں نے گجرات کی اس قدیم صنف سخن کو

> اس دور میں جکریاں بہت مقبول تھیں مجالس حال وقال میں قوال مزا میر کے ساتھ گاتے تھے۔ جکریاں ہیئت میں نظم او رخیال کے اعتبار سے غزل ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے جکری کے موضوعات اور ان کے محل استعمال پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جکری (جکری، ذکری کی گجری شکل ہے) میں بنیادی طور پر ذکر خدا، ذکر رسولؐ، ذکر پیرو مرشد، ذکر تجربات باطنی و واردات روحانی کو اس طور پر ایسے اوزان اور ایسے عام فہم الفاظ میں لکھا جاتا تھا کہ اسے گایا بھی جا سکے اور سازوں پر بجایا بھی جا سکے۔ جکری کی حیثیت مختصر گیت یار اگ راگنیوں کے ان بولوں کی تھی جنھیں گا بجا کر لوگوں کے اندر عالم وجد و سرور پیدا کیا جا سکے۔ اس میں عشق و محبت کے جذبات بھی ہوتے تھے اور ایسے ناصحانہ مضامین بھی جن سے مریدوں اور طالبوں کی ہدایت ہو سکے۔

بام عروج تک پہنچایا۔ ان کی تصنیف کا نام 'جواہر اسرار اللہ' ہے۔ شاہ علی محمد جیو گام دھنی کا کلام فلسفہ 'ہمہ اوست' کا ترجمان ہے۔ گام دھنی بہت مشکل پسند شاعر ہیں، ہر بات کو صرف اشاروں میں بیان کرنے کی وجہ سے ان کے کلام میں ابہام نمایاں ہے۔ ان کا سارا کلام واردات قلبی، عرفان ذات کے مسائل اور صوفیانہ تجربات میں ڈوبا ہوا ہے۔ محمود شیرانی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ''معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ صفات سے گزر کر عین ذات میں محو ہیں۔''[8] مثال کے طور پر ان کے کلام کے نمونے ملاحظہ کیجیے۔

جمال جمال کھل بھل جاسی
جلال جلال مل ایچ تھاسی
جے جس صفت دو مالی ہووے
وہی صفت اس ذات ملاسی

جکری کی روایت کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس شاعری کا مجموعی مزاج ہندوی ہے، جس پر ہندوی اثرات، روایات، صنمیات اور رمزیات کا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ گجرات میں تصوف نے جس طرح سے اپنا رنگ جما کر دلوں پر حکمرانی کی ہے اس کی نوعیت شمالی ہند سے مختلف ہے۔ گہرے ہندوی اثرات نے اسلامی تصوف کے ساتھ مل کر ایک ایسی شکل اختیار کر لی، جو صوفیوں اور شاعروں کے کلام میں نظر آتی ہے، گجری روایت میں موسیقی اور سازوں پر وجد کرنے کا رجحان ملتا ہے، جکری اسی روایت کی پاسداری کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن شاہ علی محمد جیو گام دھنی کے آخری وقت میں اس صنف میں بھی فارسی روایت کے اثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں، جس روایت کو بعد میں خوب محمد چشتی نے پروان چڑھایا۔ اس طرح جکری کی روایت آہستہ آہستہ دم توڑنے لگی اور معدوم ہو گئی۔ اس طرح اردو دنیا ایک ایسی صنف سے محروم ہو گئی جو ساز پر گائی جانے کے ساتھ ساتھ ہندوی روایت کی امین بھی تھی۔

بقول ڈاکٹر حبیب نثار ''اس دور میں جکریاں بہت مقبول تھیں مجالس حال وقال میں قوال مزامیر کے ساتھ گاتے تھے۔ جکریاں ہیئت میں نظم او رخیال کے اعتبار سے غزل ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے جکری کے موضوعات اور ان کے محل استعمال پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جکری (جکری، ذکری کی گجری شکل ہے) میں بنیادی طور پر ذکر خدا، ذکر رسولؐ، ذکر پیرو مرشد، ذکر تجربات باطنی و واردات روحانی کو اس طور پر ایسے اوزان اور ایسے عام فہم الفاظ میں لکھا جاتا تھا کہ اسے گایا بھی جا سکے اور سازوں پر بجایا بھی جا سکے۔ جکری کی حیثیت مختصر گیت یا راگ راگنیوں کے ان بولوں کی تھی جنھیں گا بجا کر لوگوں کے اندر عالم وجد وسرور پیدا کیا جا سکے۔ اس میں عشق ومحبت کے جذبات بھی ہوتے تھے اور ایسے ناصحانہ مضامین بھی جن سے مریدوں اور طالبوں کی ہدایت ہو سکے''۔

مشہور ادبی مؤرخ محمود شیرانی جکری کی اصل کا قیاس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'جکری در اصل ذکر' کی بگڑی شکل ہے۔ اس کا اطلاق ایسی نظموں پر ہوتا ہے جن میں اور مضامین کے علاوہ سلسلے کا شجرہ اور مشائخ کی مدح ہوتی تھی۔ پروفیسر گیان چند جین جکری کے سلسلے میں 'شیرانی کی تاویل' کو صحیح قرار دیتے ہیں اور حقیقت بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔ بقول حافظ محمود شیرانی کتاب چشتیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ ''جکری کے لیے ہندوستانی موسیقی کے چند راگ مخصوص ہیں یعنی للت، بلاول، دیسا کھ، توڑی، سیام بیراری، دھنا سری، اساوری، دیوگیری، پوربی، کلیان، کانڑا، بھاکرہ اور گنڈ۔

جکری گجرات میں مقبول ہونے سے قبل شمال میں معروف تھی چنانچہ حضرت نظام الدین اولیا کو 'جکری' سننے سے حال آیا تھا جس کے متعلق صاحب 'سیر الاولیا' لکھتے ہیں:

''قوال جکری از مولانا وجیہ الدین بصوتے مرق می گفت و غالب ظن من آنست کہ این جکری بود (پلیا بن بہاجی ایسا سکھ سیں باسوں) حضرت سلطان المشائخ را این ہندوی اثر کرد''

اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے جکری کی اپنی روایت اور ہیئت رہی ہے جو کہ موجودہ دور میں تقریباً ختم ہو چکی ہے اور حد یہ ہے اس جانب ہمارے ادیبوں اور ادب پر کام کرنے والوں کا ذہن نہیں جاتا کہ اس پر بھی کچھ کام کیا جا سکے۔ تفصیلی مضمون بہت کم ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ نہیں ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ خال خال دو تین مضامین اس بابت ہیں یا اردو ادب کی تاریخی کتابوں میں مقید ہیں۔ اس طرف تھوڑی بہت تفصیل ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں لکھی ہے۔ جس کا چربہ ایک آدھ لوگوں نے اپنے مضمون میں اتارنے کی کوشش کی ہے۔ جب کہ ہم سب بطور اردو کے طالب علم جانتے ہیں کہ کوئی بھی صنف تب تک زندہ رہتی ہے جب تک اس کے برتنے والے باقی رہتے ہیں۔ ورنہ وہ صنف اپنی موت آپ مر کر تاریخی کتب کی نذر ہو جایا کرتی ہے۔ اور پھر ماسوائے حسرت یاس کے اس صنف کے عالموں کو کچھ نہیں ملتا۔

حواشی وحوالہ:

1. تاریخ ادب اردو، ج ا، جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص 86
2. اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام، مولوی عبد الحق، انجمن ترقی ہند، 2019، ص 63
3. تاریخ ادب اردو، ج 1، جمیل جالبی، ص 88
4. اردو ادب کی تاریخ، ابتدا سے 1857 تک، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2003، ص 60
5. تحفۃ الکرام، ج 1، 79 بحوالہ تاریخ ادب اردو، ج 1، جمیل جالبی، ص 89
6. تاریخ ادب اردو، ج ا، جمیل جالبی، ص 90
7. اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام، مولوی عبدالحق، ص 58-57
8. مقالات حافظ محمود شیرانی، ج 1، مجلس ترقی ادب، لاہور 1987، ص 284
9. جکری: ہیئت و ماخذ از ڈاکٹر حبیب نثار

Amir Muzaffar Bhat
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025

ریحانہ حسن

متون کی تحقیق و تدوین میں خواتین کا کردار

بیسویں صدی عیسویں میں تدوین متن ایک شعبے کی حیثیت سے ادب میں متعارف ہوا۔اس شعبے نے اپنے تہذیبی وتمدنی عرفان کو برقرار رکھنے کے لیے قدیم علمی و ادبی متون کو از سر نو کھنگال کر انھیں اہل ادب کے پیش نظر کیا۔متن کی تدوین ایک مشکل اور صبر آزما کام ہے اس کے لیے نہ صرف وسیع علم،ذوق نگاہی کی ضرورت ہے بلکہ اس شعبے کے لیے صبر اور طویل وقت درکار ہوتا ہے۔اس دشوار گزار گھاٹی میں جہاں مردوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر رشید حسن خان جیسے خدائے تدوین پیدا کیے وہیں سیدہ جعفر اور ایسی ہی متعدد اعلیٰ پایہ کی خواتین بھی پیدا کی ہیں۔

عہد قلی قطب شاہ سے ہی ایسی ہنر مند خواتین کا تذکرہ آتا ہے جن کی پرورش و تربیت نے وجہی، نصرتی، ملک خوشنود اور رستمی جیسے شعرا پیدا کیے۔ان خواتین میں بھاگ متی قلی قطب شاہ کی ملکہ جن کو وجہی نے مشتری کا لقب دیا ہے۔اسی طرح عادل شاہی خاندان کی مشہور ملکہ خدیجہ سلطان اور قلی قطب شاہ کی بیٹی حیات بخشی بیگم خاص ہیں۔ادب کے متعدد شعبوں میں خواتین نے اپنے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔افسانوی، غیر افسانوی، شاعری، تنقید، تحقیق یہاں تک کہ تدوین متن کے میدان میں نہ صرف قدم رکھا بلکہ اپنے قدم جمائے ہیں۔اس سلسلے میں پروفیسر معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

"دکنیات کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس جانب خواتین نے بھی خصوصی دلچسپی لی ہے۔بلکہ یہ واقعہ ہے کہ کسی اور دبستان یا علاقے کو خواتین اہل قلم کی اتنی تعداد میسر نہ آئی۔اس کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ مملکت آصفیہ میں نسوانی تعلیمی ترقی حکومت کی ترجیحات میں ہمیشہ شامل رہی... جامعہ عثمانیہ اور پھر ڈاکٹر زور کی شخصیت اور ان کی مساعی کا بھی یہ اعجاز ہے کہ انھوں نے خواتین میں بھی دکنیات کے مطالعے و تحقیق کا ذوق و شوق عام کر دیا۔لہٰذا متعدد خواتین نے دورانِ تعلیم اور فراغت تعلیم کے بعد بے حد دلچسپی اور مستعدی کے ساتھ دکنیات کے مختلف موضوعات پر معیاری مطالعات و تحقیق کو اپنا وظیفہ بنالیا"[1]

تحقیق کے لیے تدوین کا ہونا لازم نہیں لیکن تدوین متن میں تحقیق کے تمام تر اوصاف کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے،اور اس کے ذریعے متن اور مصنف کے متعلق تمام تحقیقی امور کو پیش کرنا ناگزیر ہے،یوں تدوین کے لیے تحقیقی امور ذریعہ خاص بن جاتے ہیں۔ مدون متن کو مصنف کے ایک ایک لفظ کو شک کی نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کے لیے سو کنویں جھانکنے کے بعد اپنے تنقیدی شعور سے الفاظ کو ترتیب دینا پڑتا ہے۔گو مدون متن کو تحقیقی صلاحیتوں کے ساتھ تنقیدی بصیرت سے بھی بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔ان تمام اوصاف کا مجموعہ ہمارے ادب کو رشید حسن خان، نورالحسن ہاشمی، جمیل جالبی، حنیف نقوی اور تنویر احمد علوی جیسے محققین و مدونین میسر آئے جنھوں نے متون کی ترتیب تنقیدی و تحقیقی شعور کے ساتھ کی وہیں خواتین بھی اس شعبے میں پیش پیش نظر آئیں۔تحقیق و تدوین کی نمائندہ خواتین کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

باقاعدہ تدوین متن کا سلسلہ آزادی کے بعد شروع ہوتا ہے۔خواتین مدونین میں سب سے پہلے ڈاکٹر خالدہ بیگم[2] کا نام آتا ہے ان کا تدوینی کارنامہ اورنگ آباد کے استاد سخن اور سراج اورنگ آبادی کے ہمعصر داؤد اورنگ آبادی کا دیوان ہے۔یہ دیوان مرتبہ کے مختصر و جامع دیباچے کے ساتھ 1958 میں نیشنل فائن پرنٹنگ پریس سے شائع ہوا۔مرتبہ نے متن کی تصحیح و ترتیب دیوان کے تین نسخوں کی مدد سے کی اور غزلیات کو ردیف وار ترتیب دیا۔خواتین کے علم و ادب کی آبیاری میں جامعہ عثمانیہ نے سب سے پہلے اور سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ[3] اسی شعبے کی ایک قابل قدر محقق ہیں۔ تدوین متن میں ان کے متعدد کارنامے سامنے آئے ہیں۔اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے 'اردو نثر کا آغاز وارتقا' کی تحقیق کے دوران بیجاپور کے صوفی شاعر اور اردو کے اولین معمار برہان الدین جانم کی نثری تصنیف 'کلمۃ الحقائق' کی طرف توجہ ہوئی،مرتبہ نے رسالے کو چار نسخوں کی مدد سے مرتب کر کے 1961 میں ادارہ تحقیقات اردو سے شائع کیا ہے۔مرتبہ نے اس پر ایک جامع و مبسوط مقدمہ تحریر کیا، مقدمہ میں مصنف کے سوانح و کوائف، تصانیف اور اسلوب کتاب کا جائزہ پیش کیا ہے۔اس کے بعد 1967 میں مسعود حسین اور شری ڈی رامانج راؤ کی تحریک پر 'دکنی نثر پارے قدیم دور کے دکنی مصنفین کے نثری شہ پاروں کو گنجینۂ فکر، وجدان فن، اور سبد گل کے عنوانات کے ساتھ مرتب کیا۔مرتبہ نے اس پر ایک عالمانہ مقدمہ تحریر کر کے شائع کیا۔نثر پاروں کی تدوین کے ساتھ انھوں نے حافظ عبدالرحمٰن خان احسان کے کلیات کو 1968 میں تصحیح و ترتیب دے کر شائع کیا۔ مرتبہ کا اس دور زریں کے 'جگت استاد احسان' کے کلام کی ترتیب کلاسیکی ادب میں ایک اہم اضافہ ہے احسان نے میر، سودا، غالب اور ذوق تک کا عہد دیکھا اور دربار دہلی کے نامور شعرا ذوق، ممنون اور شاہ نصیر سے معرکے بھی کیے ہیں۔یہ عربی و فارسی کا ماہر، علم عروض کا استاد کہلاتا تھا۔مرتبہ کا یہ اہم کارنامہ کہ اس گمنام استاد شاعر کو اہل ادب سے متعارف کرایا۔

زینت ساجدہ4 ایک بالیدہ شعور کے ساتھ طالب علمی کے زمانے میں ہی ابھر کر سامنے آئیں۔ دوران تعلیم 1947 میں ایک افسانوی مجموعہ جل ترنگ شائع ہوا۔ تدوین متن کے سلسلے میں دو اہم کارنامے انجام دیے ہیں پہلا 'کلیات شاہی' دوسرا 'مثنوی نوسرہار' اول الذکر 1962 میں منظر عام پر آیا۔ کلیات کی ترتیب و تدوین کے ساتھ مرتبہ نے ایک سو چودہ صفحات کا مقدمہ درج کیا ہے۔ مقدمہ کلیات، مرتبہ کی لسانیات پر عمیق نظر کا واضح ثبوت ہے۔ اس میں عادل شاہ ثانی کی حیات اور کلام کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے، ساتھ ہی عہد عادل شاہی کی لسانی خصوصیات اور رسم الخط کا بھی جائزہ پیش کیا ہے۔ قدیم متون کی تدوین جدید کے اہم جزء فرہنگ کا بھی مرتبہ نے اہتمام کیا ہے۔

ان کے پی ایچ ڈی کا مقالہ 'مثنوی نوسرہار' کی تنقیدی تدوین ہے جو 1973 میں پیش کیا ہے۔ مرتبہ نے قدیم ادب کی اس خاص مثنوی، اس کے مصنف اشرف بیابانی کے حالات اور متن سے مماثل دیگر متون کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ متن کی فنی خصوصیات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ترتیب کے دوران غلط روایات کی نشاندہی اور داخلی و خارجی دلائل سے متن کی وضاحت کی ہے۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین ان متون کی ذیل میں لکھتی ہیں:

"یہ لسانی جائزہ قدیم اردو زبان کے متعلق کئی اہم نکات کی نشاندہی کرتا ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ مقالہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اسی لیے وہ تمام اہم معلومات عام قاری کی دست رس میں نہیں ہیں"5

دکنی متون کی تدوین کے علاوہ زینت ساجدہ نے کئی اور کارنامے انجام دیے ہیں ان میں خاص 'حیدرآباد کے ادیب' (دو جلد) تراجم وغیرہ ہیں۔

ساٹھ کی دہائی سے تدوین متن کا کام زور پکڑتا ہے اور ایک اہم نام ثمینہ شوکت کا آتا ہے۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے تحقیق کا آغاز کیا تحقیق کے ساتھ ہی ان کا رجحان تدوین کی طرف بڑھا اور 'مثنوی لطف' موسوم بہ نیرنگ عشق 1962 میں مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ جدید اصول تدوین کے مطابق مرتبہ نے متن کے مختلف نسخے تلاش کر کے متن کی ترتیب و تصحیح کی ہے، اس سلسلے میں متن کے چار نسخے دستیاب ہوئے۔ متن کی ترتیب سے قبل فاضل مرتبہ نے 95 صفحات کا پر مغز مقدمہ تحریر کیا ہے مقدمہ میں لطف کے تمام حالات و کوائف کا تحقیقی تجزیہ پیش کیا ہے۔ تحقیقی مقالے کے ساتھ ساتھ مرتبہ نے تدوینی طریقہ کار کو بھی بہ حسن خوبی پیش کیا۔ متن کی چھان پھٹک میں انھوں نے بڑی سلیقہ مندی سے کام لیا ہے تمام نسخوں کے مقابلے و موازنے کے بعد متن کو مصنف کی منشا کے مطابق پیش کیا ہے۔ مرتبہ کے اس تحقیقی ذوق کی داد پروفیسر عبدالقادر سروری نے پیش لفظ میں دی ہے۔ "ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے بڑی محنت اور ذوق کے ساتھ مثنوی کے سارے نسخوں کا مقابلہ کر کے ایک مستند متن تیار کر لیا"6

مرتبہ کے تحقیقی ذوق کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ 1959 میں ممکنہ مآخذ اور حوالوں کی بنیاد پر مہ لقا بائی چندا کو اردو کی اوّلین صاحب دیوان شاعرہ ثابت کیا ہے۔ اگرچہ بعد میں اسد علی تمنا کی بیگم لطف النساء بیگم پہلی صاحب دیوان شاعرہ قرار پائی اوّل الذکر کا دیوان 1214ھ اور موخرالذکر کا 1213ھ میں منظر عام پر آیا ہے۔

مثنوی لطف پر مرتبہ کو متعدد مشاہیر ادب نے داد تحسین پیش کی ہیں جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی، ماہر لسانیات مدون و محقق پروفیسر مسعود حسین، پروفیسر ہارون خان شیروانی اور گیان چند جین وغیرہ شامل ہیں۔ مرتبہ کا تدوین کے ضمن میں ایک اہم کام 'شکار نامہ' ہے اس متن کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ شکار نامہ کو جموں یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ مرتبہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے حضرت سید بندہ نواز گیسودراز مماثل مثالیئے و رسالہ جنونیہ 1963 میں مرتب کر کے سلسلۂ مطبوعات مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن سے شائع کیا ہے۔ رسالے کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے آخری حصے میں رسالے سے متعلق ضمیمہ شامل کیا ہے۔ ترتیب متن کا اندازہ پروفیسر عبدالقادر سروری کے پیش لفظ میں درج اس بیان سے ہوتا ہے۔

"مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے مختلف نسخوں سے رسالے کے متن کے مقابلے اور اس کی تدوین کے علاوہ اختلاف نسخ اور حوالوں کے اندراجات کے صبر آزما کام کو نہایت حسن خوبی اور جدید ترین طریقہ تحقیق کے اصولوں پر مکمل کیا۔ اس طرح شکار نامہ کا ایک مستند متن ہماری دست رس میں آ گیا ہے"7

پروفیسر سیدہ جعفر8 ہمارے دکنی ادب کے ایک بڑے ذخیرہ کی امین ہیں اس کی وجہ حیدرآباد کی علمی و ادبی فضا ہے اسی فضا کے استفادے سے ان کا شمار ہندستان کی دانشور خواتین کی فہرست میں ہوتا ہے۔ وہ ایک ادیب، انشاپرداز، محقق، نقاد اور مخطوطہ شناس تھیں۔ سرمایہ ادب میں ان کا اضافہ ساٹھ کی دہائی سے شروع ہو کر اپنی آخری عمر تک ہوتا رہا۔ دیگر ادبی کاوشوں کے ساتھ تدوینی کارناموں میں شاہ تراب کی مثنوی 'من سمجھاون' کو چھ مخطوطات کے مقابلے و موازنے سے مدون کر کے ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ سلسلہ مطبوعات ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد سے 1964 میں شائع کیا۔ 1966 میں 'دکنی رباعیاں' اس میں مرتبہ نے 36 شعرا کی رباعیوں کی تدوین میں ان کے اختلافات کو حواشی میں درج کیا ہے۔ حصہ اوّل میں مرتبہ نے فن رباعی پر نہایت جامع بحث کی ہے۔ اس طرح انھوں نے تحقیق اور تدوین کا بہترین امتزاج پیش کیا ہے۔ 1967 میں بیجاپور کے صوفی شاعر سید میراں شاہ ابوالحسن القادری کی مثنوی 'سکھ انجن' کو دو مخطوطات کی مدد سے مرتب کیا اور لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد سے شائع کیا۔ سلسلۂ تدوین جاری رہا اور 1983 میں دبستان گولکنڈہ کی پہلی مثنوی شیخ احمد گجراتی کی 'یوسف و زلیخا' کو مرتبہ نے اپنے 193 صفحات کے بسیط مقدمہ اور فرہنگ کے ساتھ شائع کیا۔ تدوین متن کا اہم ترین کارنامہ 1985 میں کلیات محمد قلی قطب شاہ ہے۔ مرتبہ نے متن کی تصحیح و ترتیب کے ساتھ 281 صفحات کا طویل و بسیط مقدمہ اور ساتھ 53 صفحات کی فرہنگ بھی شامل کی ہے۔ آخر میں ایک ضمیمے کے تحت بارہ غیر مطبوعہ نظمیں درج کی ہیں۔ مرتبہ نے اس مفصل کام کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلے حصے میں حمد، نعت، منقبت، مناجات اور عیدیں وغیرہ درج ہیں۔ حصہ دوم میں اصل متن غزلیات، ریختی، قصائد، رباعیات، قطعہ، مراثی، مثنوی کے علاوہ دو مطلع اور ایک شعر درج ہیں۔ 823 صفحات کا یہ مفصل کام مرتبہ نے جس محنت و مشقت سے کیا ہے اس کا اندازہ کلیات اور اس کے مقدمہ کے مطالعے سے ہی ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد پے در پے قدیم متون کے تدوینی کارنامے منظر عام پر آتے رہے 1986 جنیدی کی مثنوی ماہ پیکر کو حزم و احتیاط سے مرتب کیا اور 70 صفحات کے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ان کے علاوہ کلام قلی قطب، مثنوی جنت سنگار، مثنوی گلدستہ وغیرہ جیسے نمونے پیش کیے۔

تدوین متن کے جس تناور درخت کو دکن نے ثمر دار بنایا اس کی جڑوں کو انیسویں صدی کی علی گڑھ تحریک نے سینچا۔ بانی تحریک نے تدوین کا اوّلین نشان 'آئین اکبری' کی صورت میں پیش کیا۔ بعد میں اسی تحریک کے نامور محقق مولانا شبلی نعمانی نے لطف کے تذکرہ 'گلشن ہند' کی تدوین سے اس روایت کو آگے بڑھایا، یوں علی گڑھ نے ادب کے دیگر شعبہ جات کے ساتھ تدوین کے شعبے میں کارہائے نمایاں پیش کیے۔ علی گڑھ نے مولوی عبدالحق،

نور الحسن نقوی، رشید حسن خان اور حنیف نقوی جیسے مدونین کے ساتھ خواتین مدونین کی بھی پرورش کی جن میں خان شمیم فاطمہ کا نام اہم ہے۔انھوں نے دیوان احسن الدخان کی ترتیب وتدوین کا کام 1974 میں انجام دیا۔مرتبہ نے دیوان پر عالمانہ مقدمہ تحریر کر کے احسن الدخان کی حیات پر روشنی ڈالی۔ متن کے مقابلے و موازنے کے بعد اختلافات کو حواشی میں درج کیا ہے اورآخر میں ایک فرہنگ بھی درج کی ہے۔ 1977 میں کامنی بیگم نے ممتاز محقق و مدون نور الحسن نقوی کے زیر نگرانی 'دیوان میر' جلد دوم رسوم کی ترتیب و تدوین مع مقدمہ،حواشی اور فرہنگ کے ساتھ کی ہے۔ 1981 میں صابرہ بیگم نے اطہر پرویز کے زیر نگرانی حافظ دہلوی کے دیوان کو تدوین وترتیب سے آراستہ کیا۔مرتبہ نے دیوان پر مقدمہ تحریر کیا،متن کے متعلق حواشی اور فرہنگ بھی درج کیے۔ذکیہ جیلانی نے شعبہ اردو علی گڑھ سے نواب یوسف علی خان ناظم کے دیوان کی تنقید و تدوین مع مقدمہ کی ہے۔مرتبہ نے دیوان کی ترتیب میں حواشی اشاریہ اور فرہنگ کا اہتمام کیا ہے۔شعبہ اردو علی گڑھ کے تدوین شدہ ان تمام متون میں مدونین نے تدوین کے جدید اصولوں کو پیش نظر رکھ کر متون کی تصحیح وترتیب کا کام انجام دیا ہے۔

وحید النساء بیگم نے میسور یونیورسٹی سے بی اے اور علی گڑھ سے ایم اے کے بعد تحقیق وتدوین کی طرف توجہ کی۔ تدوین متن میں ان کا اہم اضافہ محبؔ کی مرتب کردہ بیاض 'دیدہ نم' کی ترتیب ہے یہ بیاض بارہویں صدی ہجری کے تقریباً 34 شعرا کے مراثی کا مجموعہ ہے مرتب نے دو اہم شعرا شاہ وردی بیگ محبؔ اور میر محمد ہاشم سالک کے مرثیوں کی تصحیح وترتیب کر کے حیدرآباد سے 1976 میں شائع کیا۔متن سے قبل مرتبہ نے شاہ وردی محبؔ کے متعلق 23 صفحات پر معلومات بہم پہنچائی ہے۔ان کے بعد دوسرے شاعر میر محمد ہاشم سالک کے متعلق مدونہ نے 18 صفحات کا معلومات سے پر مضمون درج کیا،اور آخر میں فرہنگ مراثی محبؔ وسالک چھ صفحات میں درج کی ہے۔آرکاٹ کے ان دونوں صاحب دیوان شعرا کے متعلق حقائق مرتبہ کے تحقیقی ذوق کی دلیل ہے۔مرتبہ خود لکھتی ہے کہ یہ ان کی پہلی تحقیقی وتدوینی کاوش ہے۔

''دیدۂ نم میری تحقیقی کاوشوں کا نقش اول ہے۔ مرثیہ اور بالخصوص دکنی مرثیہ میرا محبوب مضمون رہا ہے۔ پیش نظر بیاض کے دکنی مرثیوں کو محفوظ کرنے کا شوق ایک طویل مدت سے تھا۔'دیدۂ نم' اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔''[9]

مرتبہ بیاض اوراس میں دونوں شعرا کے متعلق بیان کردہ حقائق کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک بہتر سعی ہے۔

تحقیق تدوین میں حمیرا جلیلی ایک اہم نام ملتا ہے۔ انھوں نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مرتبہ قدیم نثری نمونہ 'سب رس' کو از سر نو مرتب کیا۔مرتبہ کو متن کی ترتیب وتدوین میں مولوی عبدالحق کے مرتبہ نسخے کے علاوہ تیرہ نسخے دستیاب ہوئے جن میں سے سات نسخوں کی مدد سے متن کی ترتیب کی۔ مرتبہ نے اس پر ایک عالمانہ مقدمہ تحریر کیا اور 1983 میں شائع کیا ہے۔متن کی بنیاد کتب خانہ سالار جنگ کے نسخے کو بنایا یہ نسخہ مصنف کے سب سے قریبی دور کا تھا۔تدوین کی ذیل میں ان کا دوسرا کارنامہ امین الدین علی اعلیٰ کے نثری رسالہ 'کلمۃ الاسرار' کی تدوین 1997 میں کی ہے۔اس رسالے کو مرتبہ نے چار نسخوں کی مدد سے مرتب کر کے 39 صفحات کا مقدمہ درج کیا ہے۔طویل ومختصر اختلافات کو حواشی میں درج کر کے ایک مختصر فرہنگ اور اصطلاحات تصوف بھی دی ہے۔ تیسرا کارنامہ وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' 2001 کی ترتیب وتدوین ہے۔

اسی کی دہائی تک آتے ہوئے ادب کے تمام شعبوں میں انقلاب آیا۔مغرب نے جہاں تنقید پر اپنا اثر ڈالا وہیں تدوین متن کے اصولوں کی تلاش بھی مغرب سے کی جانے لگی۔ڈاکٹر صبیحہ نسرین شاعر،افسانہ نگار اور دکنی ادب کی محقق و مدون ہیں،دکنی مثنویوں پر ایم فل اور دکنی شاعر شاہ میراں جی شمس العشاق کے فن پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا،اسی تحقیق کے دوران انھیں نیشنل میوزیم کراچی پاکستان سے ایک بیاض میں میراں جی شمس العشاق کی مثنوی 'وصیت النور' دستیاب ہوئی مرتب نے مثنوی کو اپنے مقدمے کے ساتھ 1988 میں مرتب کر کے شائع کیا یہ دکنیات میں ایک اضافہ کیا ہے۔

پروفیسر اشرف رفیع محقق،نقاد،شاعر اور لسانیات پر گہری نظر رکھتی تھیں۔تحقیق میں ان کا اہم کارنامہ لطف النسا امتیاز کا اردو کی پہلی شاعرہ ہونے کا انکشاف ہے۔ دکنیات میں ان کا اہم اضافہ 'دکنی مثنویوں کا انتخاب' 1990 ہے۔یہ انتخاب مرتبہ کے ایک طویل اور عالمانہ مقدمے کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔دوسرا کارنامہ 'تلاش زبان ادب' 1999 میں ترتیب دے کر پیش کیا۔یہ دکنی ادب کے متعدد گوشوں کے انکشافات پر مشتمل نو مضامین کا مجموعہ ہے۔

اکیسویں صدی میں بھی خواتین نے تحقیق وتدوین کے ذریعے اردو زبان و ادب کو وسعت دی ہے۔پدم شری پروفیسر شریف النسا انصاری نے حیدرآباد کی ادبی فضا میں پرورش پائی اور دکنی متون کی تدوین میں ان کا کارنامہ مثنوی شاہنامہ کلیم ہمدانی اور مثنوی تحفہ عاشقاں کی تنقیدی تدوین 2010 ہیں۔مرتبہ نے مقدمے میں مثنوی کے ادبی ولسانی محاسن کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور آخر میں فرہنگ بھی درج کی ہے۔اسی طرح صالحہ بیگم کا مرتبہ 'دیوان باغ' از کاظم علی باغ،فرحت فاطمہ 'دیوان یقین'، فائزہ منصور 'کلیات طالب علی خاں عیش'، یوسف النسا 'مثنوی نہ سپہ درپن'، ڈاکٹر شمیم فاطمہ 'دیوان احسن اللہ خان بیان'، صابرہ بیگم 'دیوان حفیظ دہلوی'، رفیعہ صدیقی 'دیوان سلطان' سیدہ ہاشمی مجیب 'کلیات ایمان' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

قدیم ادب کی تحقیق وتدوین کی اس عظیم تاریخ میں مندرجہ بالا خواتین کے سرسری جائزے سے اس نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے کہ سخت جانفشانی اور دیدہ ریزی کے اس میدان ''بقول رشید حسن خان تدوین دراصل تحقیق کے آگے کی چیز ہے۔''[11] میں خواتین مدونین کی کاوشیں انفرادی اہمیت کی حامل ہیں۔خواتین نے ادبی حقائق کی بازیافت کرنے اور قدیم ادب کی ترتیب وتصحیح میں جس ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے،تدوین متن کی تاریخ اس کو فراموش نہیں کرسکتی۔

حواشی

1. اردو تحقیق صورت حال اور تقاضے، پروفیسر معین الدین عقیل، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، 2008،ص 209
2. دکنی ادب کے محققین و محسنین،(ابتدا تا حال)،ڈاکٹر مسز عسکری صفدر،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی 2012
3. ایضاً
4. ایضاً
5. حیدرآباد میں اردو کا نسائی ادب،ڈاکٹر آمنہ تحسین،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی 2016،ص 243
6. مثنوی لطف موسوم بہ نیرنگ عشق، مرتبہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت، مجلس تحقیقات اردو،حیدرآباد،دکن 962
7. شکار نامہ، حضرت سید حسینی بندہ نواز گیسو دراز، مرتبہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت، مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد 1963،ص 9
8. دکنی ادب کے محققین و محسنین،(ابتدا تا حال)،ڈاکٹر مسز عسکری صفدر،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی 2012
9. دیدۂ نم حصہ اول، مراثی محبؔ وسالک، مرتبہ وحید النسا، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس،حیدرآباد،1976،ص 6

■

Rehana Hassan
Research Fellow, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

صدف فاطمہ

اردو ادب میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی عکاسی

سید عابد حسین 'قومی تہذیب کا مسئلہ' میں زبان کی تشکیل اور اس کے مزاج کے تعین کے بارے میں لکھتے ہیں "مشترکہ زبان کی حیثیت کسی زبان میں اتنی ہی نہیں کہ وہ اس کے افراد کے درمیان تبادلہ خیالات اور اشتراک عمل کا ذریعہ ہے بلکہ وہ اس تہذیبی روایت کے طور پر بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ایک طلسمی شراب ہے جس کے اندر جماعت کے مشترک احساسات جذبات، روایت دستور کی روح کھنچ کر آگئی ہے اور جس کو پی کر جماعت کے افراد ایک ہی کیف میں ڈوب جاتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کسی ملک میں صحیح معنوں میں قومی تہذیب اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سارے ملک کی زبان ایک ہوگئی ہو یا کم سے کم دیگر زبانوں کے ساتھ ایک مشترک زبان بھی پیدا ہو چکی ہو۔"
(اردو کا تہذیبی تناظر اور معاصر تہذیبی صورت حال: شمیم حنفی، پنجاب یونیورسٹی لاہور اورینٹل کالج لاہور 2010، ص 91)

اردو زبان اپنی ساخت میں اس تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہے جو مختلف اقوام نیز مختلف تہذیبوں کی باہم یکجائی سے وجود پذیر ہوئی، ابتدائی شواہد کی روشنی میں اردو زبان کے تشکیل پانے سے لے کر عروج کے عہد تک یعنی 13 ویں صدی سے لے کر 17 ویں صدی تک اردو زبان نے ہندوستان میں تشکیل پانے والی ہر بھاشا سے اپنے چشمے کو سیراب کیا اور ایسی زبان کی صورت میں ہمارے شعور کا حصہ بن گئی جس میں تہذیبی اکائیاں کثرت میں وحدت کا نقش ظاہر کر رہی تھیں۔ 13 ویں صدی میں پائے جانے والے صوفیوں کے ملفوظات اس جانب واضح اشارہ ہیں کہ اردو زبان نے ہندوی رنگ کو اختیار کیا اور اسے معیار اور استحکام بخشا۔

ہر زبان کا ادب مخصوص جغرافیائی حدود کا تابع ہوتا ہے اور یہی جغرافیائی حدود ادب میں خاص طرح کا تاثر پیدا کرتی ہیں جسے ہم آفاقیت کے مد مقابل رکھتے ہیں۔ اردو زبان کے ادب میں سماجی و تہذیبی نقش گری کی تلاش سے قبل یہ سمجھنا لازمی امر ہے کہ اردو زبان نے اپنے تشکیلی عمل میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ مختلف زبانوں اور بولیوں کو اپنایا۔ اس نے اپنے تشکیلی دور میں نا ہی کلیتاً عربی زبان پر انحصار کیا نا ہی سنسکرت کی طرح خود کو دیگر زبانوں کے دھارے سے شامل ہونے سے باز رکھا۔ یہی اشتراک زبان کے ساتھ ساتھ اس میں تخلیق کیے جانے والے ادب کا بھی خاصہ بن گیا۔ اردو ہند آریائی زبان ہے جو ملی جلی ادبی روایت اور کلچر کی پروردہ ہے۔ جو اپنی نقش گری خود کرتی ہے، عوام کی بولی ٹھولی سے مل کر صوفیا کی خانقاہوں میں پرورش پاتی یہ زبان جب ہندوستانی زبان کا روپ دھارتی ہے تو تخلیق کردہ ادب میں اس ملواں صورت کی نقش گری کرتی ہے جس کی مثال دکن سے لے کر شمالی ہند تک کے شعرا کے کلام میں بھری پڑی ہے۔ دکن میں قلی قطب شاہ سے غواصی عادل شاہ شمال میں امیر خسرو سے لے کر ولی، میر، نظیر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال، پریم چند، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین تک ان گنت ادبا نے اس زبان میں داد سخن دی ہے اور وہ اس کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں جس کی پروردہ اردو زبان ہے۔ ہندوستان کی سرزمین نے نوواردان کے لیے فراخدلی اور رواداری کا ثبوت پیش کیا یہی رواداری اردو زبان کی بنت میں بھی سرایت کر گئی چونکہ زبان اور تہذیب ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اس لیے، باہمی یگانگت اور اتحاد کا یہ عمل تخلیق میں بھی نظر آتا ہے۔ ہندوستانی کلچر کی تلاش کرتے ہوئے ہم بیشتر ہولی، دیوالی، شب برات، عید، مہابھارت اور کربلا جیسے موضوعات کا احاطہ کرنے والی نظموں اور غزلوں کی بات کرتے ہیں لیکن کیا تہذیب کی عکاسی محض نظموں تک محدود ہے یا اردو بولنے والے غیر مسلم شعرا کے کلام میں اسلامی رجحانات کی عکاسی اور مسلم شعرا و ادیب کے کلام میں شو، پاربتی، مہابھارت اور دیگر اصنام ہندی کا ذکر۔

ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی تلاش سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ تہذیب کیا ہے۔ تہذیب و کلچر فکر و خیال کی سرگرمی اور احساس سے اثر پذیری کا معاملہ ہے۔ اس میں ماحولیاتی تربیت سے بننے والے ذہن کے علاوہ جغرافیائی حالات ماضی کا ورثہ اور اجتماعی لاشعوریت کی جڑیں پیوست ہوتی ہیں جو کسی بھی ملک کے باشندوں کے طور طریقے اور رسم و رواج وغیرہ یا کسی قوم یا گروہ انسانی کے اعلیٰ مظاہر جو اس کے مذہب، نظام اخلاق، علم و ادب اور فنون میں نظر آتے ہیں ان کے ذریعے آشکار ہوتی ہے، جدلیاتی قوت کی حامل یہ قدریں ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش میں باہم متحارب اور برسرپیکار رہتی ہیں۔ کلچر جب کمزور ہو تو دوسرا اس پر اپنا قبضہ جما لیتا ہے اس کی بہترین مثال آج ہمارے سامنے ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں تہذیبی کثرت جس میں وحدت کا تاثر ہے وہ ایک مدت مدید کے شکست و ریخت کے عمل کے بعد نتھری شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ تہذیب و ثقافت کا مطالعہ بنیادی طور پر انسانی ہستی کی وحدت اور اس کی معاشرتی زندگی کی وحدت کا مطالعہ ہے۔ جس ماحول اور ذہنی فضا میں اس تہذیب کی تشکیل ہوئی اس کی بھی بیک وقت کئی سطحیں اور کئی زاویے ہیں، یہ تہذیب اپنے آپ میں ایک دنیا ہے مختلف رنگوں، ذائقوں، موسموں، اشیا، مناظر اور موجودات کا احاطہ کرنے والی ہندوستانی تہذیب کی کوئی ایک متعین اور مخصوص شکل نہیں شمیم حنفی صاحب اپنے مقالے میں تہذیب کی معرفت جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں وہ کچھ یوں ہے کہ:

"علوم اور ادبیات اور فنون لطیفہ اور اسالیب زندگی کے ملے جلے عناصر سے کسی عہد کی مجموعی تصویر بنتی ہے۔ اسی مزاج کی روشنی میں ہم تہذیب کے بارے میں اپنے تناظر کی تشکیل کرتے ہیں۔" (ایضاً ص 9)

ہر ادبی و تہذیبی روایت کی روح ایک خاص علاقے کی صدیوں کی تاریخ کا شاخسانہ ہوتی ہے۔ جس کا تعلق اپنے علاقے کے جغرافیہ، موسم، ماحول، رسوم و روایات، مظاہر اقدار اور عقائد سب سے ہوتا ہے، ہندوستانی تہذیب کی ہمہ گیریت نے اردو زبان میں بھی یہی لوچ اور کشادہ قلبی پیدا کی جس کے سبب اس زبان میں ایک ساتھ کئی روایتوں کے رنگ شامل ہو گئے جس میں بہمنی عہد میں سنسکرت کے اصول و قواعد کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کا پیچ روایت میں توانائی کا سبب بنتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی بنیاد میں دو قومیں ایک دوسرے پر بہت اثر انداز ہوئیں وہ مغل اور فارس سے آنے والے لوگ تھے یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی ثقافت کو دو تہذیبوں کا سنگم قرار دیا جاتا ہے۔

تہذیبی نقوش شعری کاوشوں میں نظر آتے ہیں، زبان و بیان کے طور طریقے میں نمایاں ہیں نیز حکایات اور افسانوی اسلوب میں جھلکتے اور طرز معاشرت کے بیان میں مترشح

ہیں۔ ہولی دیوالی بسنت مشترکہ تیوہار کی صورت میں ابھرے۔ لباس کی ملی جلی شکل کا اظہار معاشرتی سطح پر تو نظر آتا ہی ہے تخلیقی سطح پر بھی اس کے متعلق کئی نظمیں غزلیں اور میرانیس کے مرثیے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شاعری میں ایسی ان گنت مثالیں ہیں جس کے ذریعے اس تہذیب کا اظہار ہوتا ہے جسے مشترکہ تہذیب کے ضمن میں رکھا گیا ہے ایسی مثالیں اردو شاعری کے ذخیرے میں بہ آسانی دیکھی جاسکتی ہیں۔

تلمیحات کے استعمال سے اردو غزل کا دامن مالا مال ہے گرچہ اولیت فارسی تلمیحات کو ہی حاصل رہی لیکن ولی اور دکنی اردو شاعری نے اس ضمن میں جو خاطر خواہ کوششیں کیں اس سے اردو زبان میں ہندوستانی ادبی اور عوامی تلمیحات کو شامل کیا گیا، استعارے، تشبیہیں، محاوروں کو برتا گیا، ایسی اصناف پر طبع آزمائی کی گئی جنھیں خالصتاً ہندوستانی ہونے کا شرف حاصل ہے مثلاً دوہے، بارہ ماسہ، رتو سنہار، چوپائی، جھولنا شبد اشلوک، ساکھی، گیت، مکرنی و کہہ مکرنی اس کے علاوہ موضوعاتی سطح پر چکی نامہ، سہاگن نامہ، آدمی نامہ، روٹی نامہ وغیرہ سبک ہندی کے نام سے شعری پیرایہ بیان وجود میں آیا غرض کہ زندگی کرنے سے لے کر تخلیقی اظہار کے ہر زاویے پر ہندوستانی تہذیب کا رنگ ہے۔

تہذیب و ثقافت کا اختلاط مزاج، رویے اور فکر کو ایک سمت فراہم کرنے کا کام کرتا ہے جس کا پرتو ادیبوں کی تخلیقات میں بھی جھلکتا ہے میر کے کلام میں تنگ نظری، تعصب اور قوم پرستی کا شائبہ تک نہیں اس کی وجوہ میں وہ رویے ہیں جو مشترکہ تہذیب کے عناصر تھے۔ جہاں مذہبی، مسلکی اور نظریاتی علاحدگی پر زور نہیں وسیع المشربی، قلندری، رواداری کی صفت کو برتا جاتا ہے۔ بڑے بڑے غازی اور سالار ہندوستان کی سرزمین میں قدم رکھتے ہیں رہبانیت اور تصوف کے لبادے کو زیب تن کرتے ہیں تو اس کا سبب یہاں کا روحانی اور فلسفیانہ مزاج بنتا ہے جب میر کہتے ہیں کہ۔

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

یہ وسیع المشربی اور اخلاقی وسعت ہندوستانی ماحول کو اپنے اندر تحلیل کرنے کے سبب سے ہے جس میں فلسفیانہ مزاج کے ساتھ رہبانیت کا دخل رہا ہے۔

نظیر اکبرآبادی کی نظم 'بنجارا نامہ' ہندوستانی تہذیب کا استعارہ ہے جس میں زندگی کی ناپائیداری اور فلسفے کی آمیزش نیز لفظیات کی چاشنی سحر انگیزی پیدا کر رہی ہے۔ یہ متصوفانہ مزاج ہندی مزاج کی عطا ہے۔ جہاں عمل کی اہمیت ہے لیکن خواہش دنیا کبھی غالب نہ رہی یہاں زبان کی سطح پر ایک قوم کے روزمرہ کا اظہار ہے۔

چونکہ تصوف اور بھکتی تحریک کا ہمارے ذہنوں پر اثر انداز ہونا مزاج کی اکائی کا غماز تھا۔ تقریباً اردو کے ہر شاعر نے تصوف کو برتا اس کے سبب کے طور پر دیکھا جائے تو صرف فارسی مزاج ہی ایک وجہ نہیں بلکہ ہندوستان کی سرزمین کا نطفہ بھی شامل ہے جس کے تحت یہ رویے پروان چڑھ سکے تصوف میں بھکتی اور دیگر رہبانی فرقوں کے رنگ بھی چڑھے ہوئے ہیں۔ ولی اورنگ آبادی، فائز دہلوی، سراج اورنگ آبادی، میر تقی میر، مصحفی، میرانیس، میر حسن غرض یہ کہ اٹھارہویں صدی کے شعرا کے کلام میں ہندوستانی تہذیب کے ہر رنگ کا اظہار ہو رہا ہے، میرانیس کے مرثیے کا مطالعہ کر لیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ سرزمین عرب میں وقوع پذیر سانحے کو بیان کرتے ہوئے بھی وہ اس تہذیب کی نقشہ گری کرتے ہیں جو عجمی ہے، شعر میں بیان ہونے والا پیکر ہماری مانوس تہذیب کا ایک حصہ ہے، جنگ پر جاتے ہوئے جوانان کا وداع لینا اسی ہندوستانی تہذیب کی غمازی کرتا ہے دعائیں دینے کا انداز وہی ہے، صحیح سالم وخیر و عافیت سے لوٹ آنے کے لیے دعا میں اٹھنے والے ہاتھ کا انداز مناجات ویسا ہی ہے جو ہماری معاشرت کا جانا پہچانا رویہ ہے۔ جسے ایک تہذیبی اکائی کی صورت میں سمجھا جاسکتا ہے۔

رشتہ داران علی سب ہیں گرفتار محن
شرم کے مارے موئی جاتی ہے اک شب کی دلہن
دم بدم ساس بھی سر پیٹتی ہے ساتھ اس کے
ابھی کنگنا نا کھلا تھا کہ بندھے ہاتھ اس کے
زینب کی یہ دعا ہے کہ اے رب ذو الجلال
بچ جائے اس فساد سے خیر النساء کا لال
بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

یہ دعائیں اور رسمیں ہندوستانی تہذیب کی غماز ہیں جن میں ان رسموں کا حوالہ ہے جو خالصتاً ہمارے یہاں کی پروردہ ہیں۔ لگن دھرنا، کلاوا، آرسی مصحف جہیز اور رخصتی وغیرہ جیسی برتی گئی رسموں کے اظہار کے علاوہ انیس کے مرثیے میں اودھی دوہوں کا رنگ نظر آتا ہے یہ مثال محض یہیں تک محدود نہیں بلکہ مراثی انیس کے علاوہ اردو مثنویوں میں ابھرنے والے قصے داستانوی رنگ کا اظہار قدیم دکنی اور شمال ہند میں تخلیق کی جانے والی مثنویاں غرض یہ کہ ایک طویل شعری روایت ہے جس میں ہندوستانی تہذیب میں رچ بس کر نکلنے والے قصہ کہانیوں کے علاوہ لفظیات استعارے تشبیہیں۔ جن میں رام سیتا، ارجن، ہنومان، شو، پاربتی، کام دیوا اور دیگر کرداروں کے علاوہ محاوروں کا ایک جہان معانی میں ابلا پڑی ہونا، الٹی گنگا بہنا، آنچل میں باندھنا، بھرم رکھنا جگ بیتنا، پلیتھن نکلنا چولی دامن کا ساتھ، شگون دیکھنا جیسے لاتعداد محاورے ہیں جن پر دو تہذیبوں کی ایسی پیوندکاری کی گئی ہے کہ وہ ہماری روایت کا اٹوٹ حصہ بن چکے ہیں جنھیں شعری کاوشوں میں باندھا گیا تو احساس ہوتا ہے کہ روایات اور عقیدے معاشرت میں، جذبے اور رویے کی صورت میں ڈھلنے کے لیے طویل مسافت طے کرنے کے بعد تخلیقی سطح پر اظہار پاتے ہیں مثلاً ولی کے یہ اشعار۔

یودھا جگت کے کیوں نا ڈریں تجھ سوں اے صنم
ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج
کوچہ یار عین کاشی ہے، جوگئی دل وہاں کا باسی ہے
اے صنم تجھ جبیں اپر یہ خال ہندوئے ہردوار باسی ہے

ان میں کچھ محاوروں کی مثال دیکھیے مثلاً شگون دیکھنا جیسی خالص ہندی تہذیب اب ہندستانیت کا رنگ اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے جس میں ہمیں پرایاپن یا اجنبیت کا احساس نہیں کہ یہ تہذیب کی اس صورت کو پیش کرتے ہیں جس میں وقت کا نامیاتی تصور موجود ہے۔

جس جگہ بیٹھے ہیں با دیدہ غم اٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اٹھے ہیں
جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہیئے
کہ اس ظالم کی ہم پر جو گھڑی بیتی سو جگ بیتا

فراق کا اسی قبیل کا شعر بھی ہندوستانی تہذیب کا غماز ہے کہ۔

ترک محبت کرنے والو کون بڑا جگ جیت لیا
عشق سے پہلے کے دن سوچو کون بڑا سکھ ہوتا ہے

مشترک تہذیب کی بنیاد مشترک زبان ہوتی ہے۔ یہ اردو تہذیب دراصل اسی ہندوستانی تہذیب کی پیداوار ہے اسے ایک ہی سکے کے دو رخ کے طور پر سمجھا جاسکتا ہے کہ اردو جسے ایک وقت تک ہندستانی کے نام سے یاد کیا جاتا رہا یہ زبان ایک نئی تہذیب کے وجود میں آنے کا سبب بھی بنی اور اس کی ترویج میں ان تمام اوصاف اور اخلاقی خوبیوں سے خود کو متصف کیا جو اس وقت کے مخلوط سماج میں نمو پا رہے تھے۔ قدیم ہندوستانی تہذیب کے بہت سارے اوصاف اور عناصر کو اپنی حسیت کا حصہ بنا لینے اور بر صغیر کے اسلوب فکر میں اور تہذیبی اقدار میں اردو زبان نے جو وسعت پیدا کی ہے اس کے بیان میں ہم نے بخیلی سے کام لیا ہے۔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو اگر غیر منقسم ہندوستان کی تہذیب کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا کہ اب اس تہذیب کو برتنے اور سنجونے والے رخصت ہو گئے معاشرے اور فرد کی ٹوٹ پھوٹ نے تہذیب کی جگہ لے لی ہے۔

■

Sadaf Fatima
JNU, New Delhi- 110087
Mob.:7752990487

سمیع احمد

پریم چند کی ناول نگاری

ناول ایک ایسا نثری قصہ ہے، جس میں زندگی کی تمام تر سچائیاں تخیل اور فن کی آمیزش کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ناول اور افسانے میں بنیادی فرق یہی ہے کہ افسانے میں زندگی کے کسی ایک رخ کو پیش کیا جاتا ہے، جبکہ ناول میں پوری زندگی کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر نورالحسن نقوی نے بلیغ رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ناول ایک ایسا نثری قصہ ہے، جس میں ہماری حقیقی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہماری امنگیں اور آرزوئیں جھلکتی ہیں، جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہمارے سامنے کیا مشکلیں آتی ہیں اور ہم ان پر کس طرح قابو پاتے ہیں۔ گویا ناول زندگی کی تصویر کشی کا فن ہے۔"

(تاریخ ادب اردو، ص 301، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2007)

اردو ناول کا شمار مغرب سے درآمد ہونے والی اصناف میں کیا جاتا ہے۔ ناول انگریزی اَدب کے راستے اردو زبان میں داخل ہوا اور جب اردو کے قلم کاروں نے انگریزی ناول دیکھے، تو ان کو اس میں اپنے دل کی دنیا نظر آئی، چنانچہ انھوں نے داستان کو خیر باد کہا اور اس کی جگہ ناول کو اپنا لیا۔ ناول اَطالوی زبان کے لفظ 'ناویلا' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی نئے کے ہیں اور اردو والوں کے لیے یہ ایک نئی چیز تھی جسے انھوں نے اپنے فکر وخیال کا مرکز بنایا اور مغربی ادب سے استفادہ کرتے ہوئے مختلف موضوعات پر گراں قدر ناول لکھے۔

ابتدائی زمانے سے ہی قصے، کہانیوں میں انسان کی دلچسپی رہی ہے۔ جب فراغت تھی اور وہ معاش کی فکر سے آزاد تھا تو اسے ماورائی کرداروں کی حیرت انگیز طویل کہانیاں پسند تھیں۔ ان کو ایسے قصے پسند تھے جن میں جنوں، پریوں، دیویوں، بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کا ذکر ہو، تاکہ اس کے تخیل کو خوب سیر کرنے کا موقع ملے، ایسے قصے داستان کہلاتے ہیں لیکن جب زمانے کی ترجیحات بدلیں اور لوگوں کی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہوا، تو خیالی باتوں سے ان کی دلچسپی ختم ہونے لگی اور اس کی جگہ اصلی اور حقیقی دنیا کی باتیں کرنے لگا اور اس طرح داستان کی کوکھ سے ناول نے جنم لیا۔

ناول اور افسانے کے مقابلے میں داستان ایک طویل نثری قصہ ہے جس میں طوالت، تحیر، تجسس، مافوق لفطری عناصر اور ماورائی کرداروں کے محیرالعقول کارنامے س کی خصوصیات میں شامل ہیں لیکن ناول کی دنیا اس کے بالکل برعکس ہے۔ داستان کی دنیا خواب وخیال کی نیا ہے جبکہ زندگی کے مسائل اور متعلقات سے ناول کا گہرا رشتہ ہے۔ ناول میں زندگی کا کینوس پھیلا ہوا ہوتا ہے، اس میں زندگی کا ایک مربوط اور مکمل نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ داستان میں جہاں واقعات پر توجہ دی جاتی ہے، تو ہیں ناول میں کرداروں کی بنت پر زور دیا جاتا ہے۔ یعنی ول کے واقعات افراد کے تابع ہوتے ہیں اور افراد انین قدرت کے پابند۔ داستان میں جہاں خیر وشر کا

> ابتدائی زمانے سے ہی قصے، کہانیوں میں انسان کی دلچسپی رہی ہے، جب فراغت تھی اور وہ معاش کی فکر سے آزاد تھا تو اسے ماورائی کرداروں کی حیرت انگیز طویل کہانیاں پسند تھیں، ان کو ایسے قصے پسند تھے جن میں جنوں، پریوں، دیویوں، بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کا ذکر ہو، تاکہ اس کے تخیل کو خوب سیر کرنے کا موقع ملے، ایسے قصے داستان کہلاتے ہیں لیکن جب زمانے کی ترجیحات بدلیں اور لوگوں کی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہوا، تو خیالی باتوں سے ان کی دلچسپی ختم ہونے لگی اور اس کی جگہ اصلی اور حقیقی دنیا کی باتیں کرنے لگا اور اِس طرح داستان کی کوکھ سے ناول نے جنم لیا۔

تصادم ہوتا ہے، تو وہیں ناول میں افراد کی خارجی اور داخلی کشمکش کی پیش کش ہوتی ہے۔ ناول میں اجتماعی زندگی کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ اس میں مرکزی قصہ تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ بہت سے ذیلی قصے بھی ہوتے ہیں تا کہ زندگی کے متعلق ناول نگار کا مطمحِ نظر واضح ہو سکے۔ فنی اعتبار سے 'قصہ، پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر کشی یا ماحول اور فضا، نقطہ نظر یا نقطہ عروج' ناول کے اجزائے ترکیبی قرار دیے جاتے ہیں۔ لیکن بعد میں کچھ ایسے ناول بھی لکھے گئے جن میں مروجہ اجزائے ترکیبی سے یکسر انحراف کیا گیا۔ بالخصوص جدیدیت کے زیر اثر اردو میں جو ناول لکھے گئے، ان میں قصے، کہانیوں سے بغاوت کی گئی اور کہا گیا کہ ناول میں قصے کا ہونا ضروری نہیں لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔ ناول میں اگر قصہ پن نہ ہو تو اس سے قاری کی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ کوئی فن پارہ لکھتے وقت ناول نگار کے ذہن میں سب سے پہلے کوئی قصہ یا واقعہ آتا ہے جسے وہ تخیل کی آمیزش کے ساتھ صفحہ قرطاس پر اتار دیتا ہے۔ فن کار کی یہ کوشش رہتی ہے کہ اس میں تحیر بھی ہو اور تجسس بھی۔ چنانچہ قارئین کی ساری توجہ اسی پر رہتی ہے کہ کیا ہوا اور آگے کیا ہونے والا ہے۔

اردو ناول کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'مراۃ العروس' (1869) سے ہوتا ہے۔ نذیر احمد کے بعد ناول نگاری کی دنیا میں رتن ناتھ سرشار نے قدم رکھا۔ 'فسانۂ آزاد' ان کا شاہ کار ناول سمجھا جاتا ہے، جس میں انھوں نے لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب وثقافت کو ناول کی اساس بنایا ہے۔ ڈپٹی نذیر اور رتن ناتھ سرشار کے بعد اُردو ناول کے ابتدائی دور میں جو نام واضح طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے، وہ عبدالحلیم شرر کا ہے۔ شرر اس لحاظ سے اردو کے پہلے ناول نگار ہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے ناول میں عشقیہ قصوں کی روایت قائم کی۔ فنی اعتبار سے شرر کے ناول متقدمین میں بہتر ہیں۔ شرر کے بعد ہماری نظر ایک ایسے قلم کار پر ٹھہرتی ہے جس نے اردو ناول کو فنی اعتبار سے مضبوطی عطا کی۔ ہماری مراد ہے مرزا ہادی رسوا۔ مرزا رسوا نے کئی ناول لکھے مگر ان کی شہرت 'امراؤ جان ادا' کی بنیاد پر قائم ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ناول کا فن کسی حد تک پختگی کی طرف مائل ہونے لگا۔ یہی وہ دور ہے جب منشی پریم چند نے ناول کی دنیا میں قدم رکھا۔ پریم چند اردو کے پہلے ناول نگار ہیں، جنھوں نے زمینی مسائل وموضوعات کو ترجیحی طور پر اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ ان کے ناولوں میں ہمیں پلاٹ کی ترتیب میں پختگی دیکھنے کو ملتی ہے اور زبان و بیان بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ صاف اور سلیس معلوم ہوتے ہیں۔

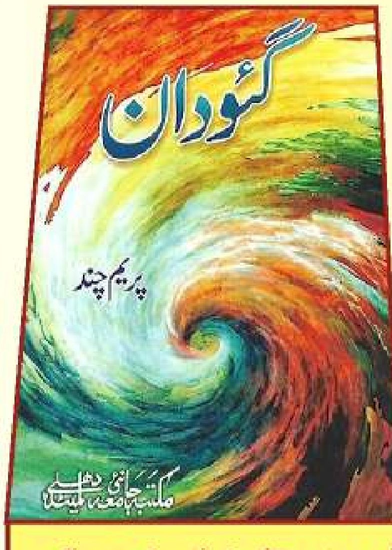

پریم چندکا آخری ناول 'گئودان' ھے جس کا موضوع ھندوستانی کسانوں کی بدحالی اور ان کا استحصال ھے جسے فنی دسترس کے ساتھ پریم چند نے پیش کیا ھے۔ 'گئودان' پریم چند کا شاہ کار ناول سمجھا جاتاھے۔ جسے انھوںنے 1932 میں لکھنا شروع کیا، 1935 میں مکمل ھوا اور 1936 میں منظر عام پر آیا۔ 'گئودان' پھلے ھندی میں لکھا گیاتھا، بعد میں پریم چند نے ھی اسے اردو کا پیرھن عطاکیا۔ 'گئودان' 596 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم ناول ھے۔

پریم چند کا پہلا ناول 'اسرارِ معابد' (8/اکتوبر 1903) بنارس کے ایک ہفتہ وار اخبار 'آوازِ خلق' میں قسط وار چھپنا شروع ہوا۔ دوسرا ناول ہم خرما وہم ثواب (1907)، تیسرا ناول کشنا (1908)، چوتھا ناول جلوۂ ایثار (1912)، پانچواں ناول بازارِ حسن (1917)، چھٹا ناول گوشۂ عافیت (1920)، ساتواں ناول نرملا (1921)، آٹھواں ناول چوگانِ ہستی (1924)، نواں ناول پردۂ مجاز (1925)، دسواں ناول بیوہ (1927)، گیارہ واں ناول غبن (1932)، بارہواں ناول میدانِ عمل (1932) تیرہواں ناول گئودان (1936) شائع ہوا۔ پریم چند کا پہلا ناول 'اسرارِ معابد' اور آخری ناول 'منگل سوتر' دونوں نامکمل ہیں۔ 'اسرارِ معابد' 1903 سے ہفتہ وار اخبار 'آوازِ خلق' میں بالاقساط 1905 تک شائع ہوتا رہا لیکن مکمل ہونے سے قبل ہی ان کی اشاعت روک دی گئی۔ 'منگل سوتر' کو پریم چند نے بسترِ علالت پر لکھنا شروع کیا تھا، لیکن ان کے انتقال کے باعث مکمل نہ ہو سکا۔ 'اسرارِ معابد' کا موضوع عبادت گاہوں میں عوام کے اعتقادات سے فائدہ اٹھا کر ان کا استحصال کرنا ہے۔ 'ہم خرما وہم ثواب' میں بیواؤں کا مسئلہ اور ہندوستانی سماج میں معاشرتی برائیوں کو موضوع بنایا گیا ہے، جبکہ 'جلوۂ ایثار' میں قومی مسائل اور ان کے حل کے لیے قومی خدمت کی اہمیت وافادیت پر زور دیا گیا ہے۔ دراصل یہ ایک سوانحی ناول ہے، جس میں پریم چند نے سوامی وویکا نند کی زندگی اور شخصیت کو ناول کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ 'بازارِ حسن' پریم چند کا پہلا ضخیم ناول ہے، جس کا موضوع سماج پر حسن فروشی کے اثرات کے علاوہ شہر میں رہنے والے متوسط طبقے کے مسائل ہیں۔ 'گوشۂ عافیت' میں دیہاتی زندگی کے بنیادی مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ 'نرملا' میں جہیز کی لعنت اور بے جوڑ شادی سے معاشرے میں پیدا ہونے والی خرابیوں کو انتہائی خوبصورت انداز میں پریم چند نے پیش کیا ہے۔ 'چوگان ہستی' میں اشتراکی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے، جبکہ 'پردۂ مجاز' کا موضوع 'پنر جنم' ہے۔ 'بیوہ' میں بیوہ عورت اور اس کے مسائل کا حل بتایا گیا ہے جبکہ 'غبن' میں عورتوں میں زیورات کے شوق کو دکھایا گیا ہے۔ 'میدانِ عمل' کا موضوع ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی ہے جسے مصنف نے خوبصورتی کے ساتھ ناول کے قالب میں ڈھالا ہے۔ پریم چند کا آخری ناول 'گئودان' ہے جس کا موضوع ہندوستانی کسانوں کی بدحالی اور ان کا استحصال ہے جسے فنی دسترس کے ساتھ پریم چند نے پیش کیا ہے۔ 'گئودان' پریم چند کا شاہ کار ناول سمجھا جاتا ہے۔ جسے انھوں نے 1932 میں لکھنا شروع کیا، 1935 میں مکمل ہوا اور 1936 میں منظر عام پر آیا۔ 'گئودان' پہلے ہندی میں لکھا گیا تھا، بعد میں پریم چند نے ہی اسے اردو کا پیرہن عطا کیا۔ 'گئودان' 596 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم ناول ہے۔ اس کے پلاٹ کو پریم چند نے 36 ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

'گئودان' کا شمار اردو کے بہترین ناولوں میں ہوتا ہے، اس میں سماجی ناانصافی، ظلم وجبر اور استحصال کو فنی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول سے ہندوستان کی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ ہوری اور دھنیا اس کے اہم کردار ہیں جس کے اردگرد ناول کی پوری کہانی گردش کرتی ہے۔ 'گئودان' کا خلاصہ یہ ہے کہ 'ہوری' کا پانچ افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا خاندان ہے۔ اس کی بیوی 'دھنیا'

ہے جو ظلم وزیادتی کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا جذبہ رکھتی ہے۔ ایک بیٹا 'گوبر' اور دو بیٹیاں 'سونا' اور 'روپا' ہیں۔ ہوری کے پاس چند بیگھا زمین ہے جو اس کے خاندان کا گزر بسر کا واحد ذریعہ ہے۔ رات دن کی محنت اور سخت جدوجہد کے باوجود دو وقت کی روٹی مہیا کرنا اس کے لیے مشکل ہے۔ ہوری سیدھا سادا محنت کش انسان ہے، جس کی دیرینہ خواہش یہی ہے کہ وہ 'اپنے دروازے پر ایک گائے کو بندھا دیکھے۔' جہاں پریم چند نے ہوری کو ایک عام کسان دکھایا ہے، وہیں انھوں نے کمال کی فنکاری کا ثبوت دیتے ہوئے ہوری کی صورت میں انسان کے نفسیاتی تضادات کو بھی پیش کیا ہے۔ ہوری اپنی خواہش، غرض اور ضرورت سے مجبور ہو کر مکر وفریب اور خوشامد کا سہارا لیتے ہوئے اپنے ایک ساتھی 'بھولا اہیر' کو دوسری شادی کا لالچ دے کر اس سے ایک گائے حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوتی ہے کیونکہ ہوری کا بھائی 'ہیرا' اس کی خوشی سے حسد کرنے لگتا ہے اور موقع پا کر وہ گائے کو زہر دے دیتا ہے اور ہوری کی خوشی کافور ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف گائے لانے کے سلسلے میں ہوری کے بیٹے 'گوبر' کو بھولا اہیر کی بیٹی 'جھنیا' سے محبت ہو جاتی ہے۔ ایک دن موقع پا کر گوبر 'جھنیا' کو اپنے گھر میں چھوڑ کر ماں باپ کے ڈر سے شہر فرار ہو جاتا ہے۔ جھنیا کو گھر میں رکھنے کی وجہ سے ہوری کی دشواریوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ برادری کے لوگ اور مذہبی ٹھیکیدار اِسے جرم قرار دیتے ہیں اور جرمانے کے طور پر اس کی فصل کی ساری پیداوار پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ ہوری کی مصیبت اپنی انتہا کو اس وقت پہنچ جاتی ہے جب بھولا اہیر اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کے لیے ہوری کا بیل کھول لے جاتا ہے۔ ایسے میں ہوری کے لیے اپنے گھر والوں کے لیے دو وقت کی روٹی کا انتظام مشکل ہو جاتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد گوبر شہر سے کچھ روپے کما کر لوٹتا ہے، جس سے ہوری کو تھوڑی سی راحت ملتی ہے۔ گوبر شہر جا کر اب کسان نہیں رہا بلکہ ایک شہری مزدور بن گیا تھا۔ کسانوں کی اور خاص طور سے اپنے باپ کی حالت دیکھ کر اسے بہت غصہ آتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ زمین دار، ٹھیکیدار اور سرکاری عہدے دار تک غریب کسانوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ مل کر اس سسٹم کو بدلنے کے لیے کوشش کریں، لیکن ہوری اور سارے کسان صبر وقناعت کا دامن مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں، اور دل کی پکار پر لبیک نہیں کہتے۔ پریم چند کے الفاظ میں ان کی معصومیت 'بے حسی' تک پہنچ گئی تھی۔ جس سے دل برداشتہ ہو کر گوبر اپنے بیوی بچے کے ساتھ شہر لوٹ جاتا ہے۔

ہوری کی بیٹیاں اب بڑی ہو چکی ہیں۔ بڑی بیٹی سونا کی شادی کی فکر بھی دامن گیر ہوئی۔ ہوری نے کسی طرح دوسروں سے ادھار لے کر سونا کی شادی کا بندوبست تو کر لیا لیکن اس طرح سے وہ حد درجہ مقروض ہو گیا۔ ہوری کے لیے اب گزر بسر کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ بیل نہ ہونے کی وجہ سے کاشت کاری کرنا ناممکن سا ہو گیا تھا۔ جو زمینیں بچ گئیں تھیں، ان پر ساہوکار گدھ کی نظر لگائے بیٹھے تھے۔ ایسے میں اپنے پرکھوں کی نشانی کو بچائے رکھنے کے لیے اپنی چھوٹی بیٹی روپا کو صرف دو سو روپے کے عوض بوڑھے رام سیوک کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے۔ اتنی دشواریوں کے باوجود ہوری کے مصائب وآلام کا سلسلہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ اپنے قرض کی ادائیگی اور دو وقت کے روٹی کے حصول کے لیے جی جان سے محنت کرتا ہے۔ ایک روز چلچلاتی اور تپتی ہوئی دھوپ میں کھیت پر کام کرنے کی وجہ سے لو کا آتشیں جھونکا اس کا کام تمام کر دیتا ہے اور اس طرح کبھی نہ ختم ہونے والی مصیبتوں اور پریشانیوں سے ہوری ہمیشہ کے لیے نجات پا لیتا ہے۔ اس کی آخری رسومات ادا کرنے کے لیے پنڈت گائے کا دان یعنی 'گئودان' کرنے کے لیے کہتا ہے۔ جو شخص زندگی بھر اپنے گھر پر گائے بندھی ہوئی دیکھنے کا متمنی تھا، وہ اپنی اس ناکام حسرت کے ساتھ ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ مذہبی ٹھیکیدار اور پنڈت ہوری کی بیوی پر دباؤ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی آتما کی شانتی کے لیے گائے دان کرنی ہوگی یعنی وہ 'گئودان' کرے۔ پریم چند اپنے اس ناول کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں:

'دھنیا مشین کی طرح اٹھی آج جو سُتلی بیچی تھی، اس کی بیس آنے پیسے لائی اور ہوری کے ٹھنڈے ہاتھ میں رکھ کر سامنے کھڑے ہوئے داتا دین سے بولی مہراج! گھر میں نہ گائے ہے نہ بچھیا، نہ پیسہ، یہی پیسے ہیں، یہی اِن کا گئودان ہے اور غش کھا کر گر پڑی۔'

بقول علی سردار جعفری: 'پریم چند نے بڑی سچی اور بے رحم حقیقت نگاری سے کام لیا ہے اور ناول کو ہوری کی موت پر اس طرح ختم کیا کہ ایک سناٹا چھا جاتا ہے۔'

پریم چند نے بہت سارے ناول لکھے جن میں 'بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، میدانِ عمل' اور 'گئودان' خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں بھی 'گئودان' ان کے فنی اِرتقا کا نقطۂ عروج ہے گو کہ انقلابی خیالات کی بنیاد پر 'میدان عمل' بھی اہمیت رکھتا ہے۔ احتشام حسین کے خیال میں 'ترقی پسند ادیب اور نقاد پریم چند کو ہمیشہ اپنی صف میں شمار کرتے رہے۔' ترقی پسندوں کی یہ کمزوری صرف پریم چند کے ہی معاملے میں نہیں ہے بلکہ ہر قابل لحاظ ادیب پر یہ لیبل چسپاں کرنے کے لیے وہ ادھار کھائے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ ادب جو زندگی کا ساتھ دے اور جس میں روحِ عصر کارفرما ہو، اچھا ادب ہے، چاہے وہ ترقی پسندی کے 'صحیح' معیار پر پورا اترتا ہو یا نہ ہو اور اس لحاظ سے پریم چند یقیناً اچھے ادیب ہیں اور ان کی تصنیفات اچھے ادب کے زمرے میں آتی ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ پریم چند کا ذہن ارتقا پذیر تھا۔ ان کے افکار و نظریات زمانے کے مسائل اور عصری تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ وہ ہندوستانی عوام کے دکھ درد اور افلاس واضطراب کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ اردو ناول نگاری میں ان کو دیگر ناول نگاروں پر فوقیت حاصل ہے کہ آپ نے دیہی ہندوستان کو اپنے ناول کا موضوع بنایا اور ان کے حقیقی نقشے کو اپنے ناولوں میں فنی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا۔

پریم چند نے ہندوستان کی دیہاتی زندگی کے مطالعے اور دیہاتی لوگوں کو سمجھنے میں اپنی پوری زندگی صرف کر دی۔ وہ خود بنارس کے گرد ونواح کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، وہ دیہات کے رہن سہن، لوگوں کے جذبات وخیالات سے بخوبی واقف تھے۔ اس سے زیادہ یہ کہ وہ احتیاج وافلاس کے تلخ گھونٹ خود پی چکے تھے۔ ان عناصر نے نہ صرف یہ کہ انھیں زندگی کا عرفان عطا کیا بلکہ فنی اعتبار سے حقیقت نگاری کی طرف راغب بھی کر دیا۔

پریم چند انقلابی نہ تھے بلکہ مصلحِ قوم تھے۔ وہ توہم پرستی، چھوت وچھات، مذہبی تعصب اور معاشرتی تفرقہ کے خلاف تھے۔ انھوں نے جابجا ان سماجی خرابیوں کی طرف نشاندہی کی ہے، گو کہ کہیں کہیں وہ اپنے جوش وعمل سے تقدیر پلٹ دینا چاہتے ہیں جیسا کہ 'گئودان' میں ہے لیکن مجموعی طور پر پریم چند ایک اصلاح پسند اور مثالی ناول نگار ہیں۔ انھیں عوام کی غربت اور بدحالی کا پورا احساس ہے مگر اس مسئلے کا حل انھوں نے 'گوشۂ عافیت' میں رام راج کے قیام کی شکل میں ڈھونڈا ہے گو کہ سردار جعفری جیسے ترقی پسند نقاد اس کی تعبیر مارکس کی پرولتاری حکومت کے خواب سے بھی کر سکتے ہیں۔

'گئودان' فنی اعتبار سے پریم چند کا آخری مکمل ناول ہے اور جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ان کے فنی ارتقا کا نقطۂ عروج بھی ہے۔ اس میں مصنف کا شعور، ادراک، مشاہدہ اور فن بھی کچھ اعلیٰ درجے پر ہے۔ بہت سی خامیاں بھی جو نہ صرف اردو ناول کی روایت بن چکی تھیں بلکہ خود پریم چند کی ابتدائی تصانیف میں بھی ملتی ہیں۔ 'گئودان'

میں پریم چند کے آدرش وادی نقطۂ نظر اور بعض نئے تصورات کا امتزاج ملتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس ناول نے انھیں میدانِ سیاست کے شہ سوار کے طور پر ابھارا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ سامراجی حکومت ان کے نظریے کے بالکل برعکس ہے۔ وہ اس کو دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے اس سلسلے میں کوئی مفاہمت اور اصلاح انھیں قبول نہیں۔

پریم چند ایک باشعور قلم کار تھے۔ ان کا ذہن حساس تھا۔ انھوں نے ہندوستانی عوام اور ان کے مصائب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مذہبی اور معاشرتی خامیاں بھی ان کے علم میں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند نے ناول اور افسانے میں مجبور و مقہور اور ستم رسیدہ عوام کی ترجمانی کی اور ان کے مسائل کو پیش کیا، ان کی خامیوں کی نشاندہی کی اور سماج کی دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھیں۔ اس طرح ان کے ناول مقصدیت کے حامل ہیں۔ نذیر احمد اور عبدالحلیم شرر نے بھی بعض مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ناول لکھے لیکن پریم چند کی مقصدیت کا دائرہ زیادہ وسیع ہے۔

پریم چند کے ناول کی دوسری خصوصیت حقیقت نگاری ہے۔ انھوں نے اپنے چاروں طرف مظلومیت، ظلم اور استحصال کا بازار گرم دیکھا، جس کی وجہ سے ان کے حساس ذہن اور فن کی مقصدیت نے انھیں حقیقت نگاری پر مجبور کر دیا۔ بعض جگہوں پر پریم چند کی مثالیت پسندی حقیقت نگاری پر غالب آجاتی ہے لیکن یہ بھی سچائی ہے کہ حقیقت نگاری پریم چند کے ناول و افسانے کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ وہ زندگی کی سچائی کو واضح اور مؤثر انداز میں پیش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ پریم چند کے ناولوں میں اعلیٰ درجے کی مرقع کشی ملتی ہے۔ گاؤں کی مرقع کشی میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ ان میں جا بجا نیاپن اور ذہانت کے عناصر ملتے ہیں۔ مرقع کشی کے سلسلے میں بھی پریم چند کا ذہن سماجی شعور کا ثبوت دیتا ہے جیسے 'گئودان' میں ہوری کے گاؤں کی مرقع کشی کرتے ہوئے انھوں نے واضح طور پر سماج کو ظالم و مظلوم دو طبقے میں بانٹا ہے۔ لیکن کہیں کہیں مرقع کشی کا اعلیٰ معیار برقرار نہیں رہ پاتا۔ مثال کے طور پر 'گئودان' میں شہری زندگی اور مزدوروں کی مرقع کشی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ شاید اس کی وجہ پریم چند کا شہری مسائل سے نسبتاً کم واقف ہونا ہے۔ پریم چند کی کہانی کہنے کا انداز پرانا اور سیدھا سادا ہے لیکن اس کی پیشکش میں وہ مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔ 'گئودان' کی کہانی فنی اعتبار سے مربوط و مکمل ہے۔ اس میں تدریجی ارتقا ہے لیکن یہی بات ان کے دوسرے ناولوں کے بارے میں کلی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ پریم چند انسانی نفسیات سے پوری طرح آگہی رکھتے ہیں، اس لیے کردار نگاری میں انھیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ پریم چند کے ناولوں میں مکالموں کی زبان اور اس کی ادائیگی کا فنکارانہ اظہار ملتا ہے۔ ہر طبقے کی زبان اور اندازِ ادائیگی پر انھیں قدرت حاصل ہے، جو ان کے مکالموں میں حقیقت اور تنوع کا رنگ پیدا کرتا ہے۔ کردار و واقعات کی پیچیدگی، اظہار خیال کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ پریم چند کو دیہاتی باشندوں خصوصاً کسانوں کی زبان پر عبور حاصل ہے۔ خصوصیت کے ساتھ 'گئودان' میں ایسی مرقع کشی کی مثالیں مل جاتی ہیں، جہاں پر الفاظ کی سحر آفرینی اور مکالموں کی فطری برجستگی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ پریم چند کے مکالمے خاصے طویل ہوتے ہیں لیکن ان کے مکالمے بڑے برجستہ اور پر اثر ہوتے ہیں۔ پریم چند اپنے ناولوں میں جزئیات نگاری کے ذریعے تفصیلات کو بیان کرتے ہیں لیکن اس سے وہ کہانی اور کردار کو متحرک بنانے کا کام لیتے ہیں۔ پریم چند کی تحریروں میں ایک متوازن ظرافت ملتی ہے جو فنکارانہ اسلوب کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔ چوگانِ ہستی کو پریم چند نے اپنا بہترین ناول قرار دیا ہے۔ (واضح ہو کہ یہ بات 1934 کی ہے جب گئودان نہیں لکھا گیا تھا) اور حقیقت بھی ہے کہ 'گئودان' کو چھوڑ کر ان کے باقی تمام ناولوں کی بہ نسبت یہ زیادہ فنکارانہ ہے۔ اس عہد کے ملکی مسائل کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کا ہیرو سور داس گاندھی وادی ہے اور اہنسا سے ظلم کا مقابلہ کرتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ آخر میں فتح سچائی کی ہوگی۔ پریم چند کی بڑی خاصیت تھی کہ عام ہندوستانی کسانوں، مزدوروں اور غریب انسانوں کو اپنے ناولوں میں ہیرو بنا کر اور زندگی کی کھردری حقیقتوں کو پیش کر کے اردو ناول کو جو سمت عطا کی ہے، اس پر آج بھی سفر جاری ہے۔ قمر رئیس رقم طراز ہیں:

''پریم چند پہلے ادیب ہیں جنھوں نے ہندوستانی گاؤں کے کسانوں، کھیت، مزدوروں اور ہریجنوں کی عظمت اور وقار کو سمجھا۔ ان کے لیے ادب کے کشادہ دروازے کھولے، انھیں ہیرو بنا کر، ان کے دکھ سکھ کی گاتھا سنا کر اردو کے افسانوی ادب کو نئی وسعتوں اور ایک نئے احساسِ جمال سے آشنا کیا۔ اِس طرح اردو ادب جو اب تک شہر کے اعلیٰ اور متوسط طبقے کی ترجمانی کرتا تھا، سارے ملک کی متحرک زندگی، عوامی تحریکوں، سماجی آویزشوں اور عام انسانوں کے مشغلوں اور معرکوں کا جاندار مرقع بن گیا۔''

(اردو کا افسانوی ادب، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، 1987، ص 127-126،)

منشی پریم چند کی زبان تصنع اور بناوٹ سے یکسر پاک ہے۔ ان کا اسلوب اِنتہائی سادہ اور عام فہم ہے۔ انھوں نے عام بول چال کی زبان میں کسانوں، مزدورں اور مظلوموں کے جذبات و احساسات کو زبان عطا کی ہے۔ پریم چند کی تخلیقی عظمت کی بنیاد یہی ہے کہ انھوں نے وقت کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کیا، اپنے گرد و پیش کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ پریم چند کے ناولوں کے مطالعے کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ گاندھی جی کے فکر و فلسفے سے متاثر تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں ہر سو آزادی کے ترانے گونج رہے تھے اور پورا ملک سراپا احتجاج بنا ہوا تو ایسے میں پریم چند خود کو اس سے کیسے دور رکھتے، چنانچہ انھوں نے انگریزوں کی ملازمت کو خیرباد کہا اور تحریک آزادی کو فکری غذا فراہم کرنے میں منہمک ہوگئے۔ 'میدانِ عمل' پریم چند کا ایسا ہی ناول ہے، جس میں آزادی کی لو کو شرر سے شعلہ بنتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ پریم چند کے ناولوں کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کے ناول ہندوستان کی مٹی، موسم اور آب و ہوا سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ ہندوستان کے دیہات کے جتنے رنگ ہوسکتے ہیں وہ ان کے ناولوں میں دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ بلاشبہ پریم چند اردو کے عظیم ترین ناول نگار بھی ہیں اور جدید ناول کے بنیاد گزار بھی۔

> **پریم چند نے ہندوستان کی دیہاتی زندگی کے مطالعے اور دیہاتی لوگوں کو سمجھنے میں اپنی پوری زندگی صرف کر دی، وہ خود بنارس کے گرد و نواح کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، وہ دیہات کے رہن سہن، لوگوں کے جذبات و خیالات سے بخوبی واقف تھے۔ اس سے زیادہ یہ کہ وہ احتیاج و افلاس کے تلخ گھونٹ خود پی چکے تھے۔ ان عناصر نے نہ صرف یہ کہ انھیں زندگی کا عرفان عطا کیا بلکہ فنی اعتبار سے حقیقت نگاری کی طرف راغب بھی کر دیا۔**

■

Dr. Sami Ahmad
Department Of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025
Mob.: 9818334376

خطبۂ پریم چند
ایک ادبی منشور

عمران عاکف خان

یہ خطبہ محض ایک [رسم اور] تقریر ہی نہ تھا بلکہ نئے عہد کی ادبیات کا مکمل لائحہ عمل بھی تھا،نئی زمینوں اور نئے دیار کی تخلیقات کا ایک دستوری نظام تھا،نو آبادیات کے عمرانیات اور آئین کی اہم دفعہ تھا،اسی طرح نئے زمانے کے اُردو اور ہندی لٹریچر کا ایک *Land Mark* تھا۔جس نے سوتوں کو جھنجھوڑ کر جگا دیا، دیوانوں کو ہوشیار کر دیا، مُردہ ذہنوں میں جان ڈال دی،زنگ زدہ فکروں کو جِلا بخش دی،نئے لکھنے والوں کو نئی راہ اور سمت دکھا دی،ان میں آشا کی جوت جگائی اور امید کی کرن بیدار کر دی، کمزوروں کو توانا کر دیا، مصلحت کوش ادیبوں کو کلمۂ حق بلند کرنے کا حوصلہ اور بوتا عطا کیا۔

نگارستان لکھنؤ میں واقع 'انجمن ترقی پسند مصنّفین' کے پہلے، منعقد کل ہند سطح کے اجلاس کی کارروائی شروع ہوا چاہتی تھی۔ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا تھا، کیونکہ اس کی صدارت، بابائے افسانہ اور اس عہد کے نامور ترین ادیب، 'منشی پریم چند' کر رہے تھے۔

یہ کانفرنس دو دن جاری رہی اور پھر ایک پر مغز، آفاقی خیالات، گہرے اور طویل المدت تجربات، باشعور، بالغ نظر اور جامع افکار پر مشتمل صدارتی خطبے پر اس کا اختتام ہوا۔خطیب کا نام: 'منشی پریم چند' تھا — پریم چند کا یہ خطبہ نہ صرف اس کانفرنس اور تحریک کا دستور و منشور تھا بلکہ ادیبوں کے لیے کیمیائے سعادت اور اکسیر بھی تھا۔

یہ خطبہ محض ایک [رسم اور] تقریر ہی نہ تھا بلکہ نئے عہد کی ادبیات کا مکمل لائحہ عمل بھی تھا، نئی زمینوں اور نئے دیار کی تخلیقات کا ایک دستوری نظام تھا،نو آبادیات کے عمرانیات اور آئین کی اہم دفعہ تھا، اسی طرح نئے زمانے کے اُردو اور ہندی لٹریچر کا ایک Land Mark تھا۔جس نے سوتوں کو جھنجھوڑ کر جگا دیا، دیوانوں کو ہوشیار کر دیا، مُردہ ذہنوں میں جان ڈال دی، زنگ زدہ فکروں کو جلا بخش دی، نئے لکھنے والوں کو نئی راہ اور سمت دکھا دی، ان میں آشا کی جوت جگائی اور امید کی کرن بیدار کر دی، کمزوروں کو توانا کر دیا، مصلحت کوش ادیبوں کو کلمۂ حق بلند کرنے کا حوصلہ اور بوتا عطا کیا۔وقت کا دھارا بدل کر رکھ دیا،غرض ادب کو ایک نیا ذہن اور نیا آہنگ عطا کیا۔

اگر مزید گہرائی سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ خطبۂ صدارت پریم چند کی پوری ادب نگاری کا 'مقدمہ' ہے۔مقدمہ عموماً کتاب کی ابتدا میں ہوتا ہے حالانکہ اس کا اصل مقام کتاب کا آخری حصہ ہے؛ کیونکہ اس میں ساری کتاب کا نچوڑ اور 'حاصل' رہتا ہے۔ساری کتاب کا نچوڑ ظاہر ہے کتاب کی تکمیل کے بعد ہی برآمد ہوتا ہے یا اس تک رسائی اسی صورت میں ممکن ہے جب کتاب کا مکمل مطالعہ کر لیا جائے۔منشی پریم چند نے یہ خطبہ بھی اپنی عمر کے آخری حصے میں بلکہ وفات سے چند ماہ قبل تحریر کیا اور 'اردو' کی ایک عظیم الشان 'کانفرنس' کے تاریخی اجلاس میں پیش کیا تھا۔گویا انھوں نے اپنے عہد اور اپنے ادب کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد، انتہائی عرق ریزی اور محنت سے اسے لکھا تھا۔تو یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح حالی کی شہرہ آفاق کتاب 'مقدمہ شعر و شاعری' اردو شعری تنقید کی پہلی کتاب اور منشورِ شاعری ہے؛ اسی طرح یہ خطبۂ صدارت بھی اردو فکشن یا اُردو نثر کی 'پہلی تنقید' یا کم از کم 'تنقیدی کاوش' کا اولین نقش ضرور قرار دیا جا سکتا ہے اور یہ اس کا حق بھی ہے۔اس سے قبل یا آج تک غالباً اس کو صرف ایک نظریاتی یا فکری تقریر ہی گردانا گیا۔وگرنہ یہ صرف تقریر ہی نہیں بلکہ نثر یا فکشن کی ایسی کسوٹی ہے جس پر فکشن یا نثر کو پرکھا جا سکتا ہے۔اسی طرح اسے ادب کو جانچنے اور ڈھالنے والی ٹکسال بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ خطبہ علم و ادب، سماجیات، سیاسیات، اقتصادیات، عمرانیات، طبعیات و مابعد الطبعیات، جدیدیت، مستقبل کے امکانات اور حال کے مبینہ خدشات کے اظہارات پر مبنی ہے۔اندازہ لگائیے کہ اسے پریم چند نے کس قدر عرق ریزی سے تحریر کیا ہوگا، انداز تو ایسا ہے کہ شعلہ سا لپک جائے ہے اور ایک بھی لفظ ایسا نہیں جسے زائد یا اضافی اور محض عبارت آرائی کہا جا سکے، اعلا درجے کا ڈکشن، عمدہ طرزِ ترتیب اور متناسب سجاوٹ، گویا پریم چند نے اس خطبے میں چاندی جیسے کاغذ پر حرفوں کا سونا پگھلایا ہے،ایک ایک لفظ جیسے چن چن کر ورقِ سفید پر رکھا گیا ہو، یا کسی گلدستے میں نہایت سلیقے سے پھول چن کر سجائے گئے ہوں۔معاً یہ مقالہ تحقیقی اور تنقیدی بھی ہے جس میں معاصر اور ماقبل کی ادبیات پر نہایت متناسب انداز میں تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیقی رموز کا سراغ لگانے کی بھی سعی کی گئی ہے۔نیز مضمون اپنی تکنیک نگارش میں بھی بدرجۂ اتم اور کمال ہے۔

اس خطبے میں چند نکات نہایت تفصیل اور غور طلب، قابل نظر اور قابل وضاحت بھی ہیں۔ان کی وضاحت، توسیع ادب کی نقیب اور ادبی تقاضوں کی تکمیل کی جانب راہ نما ہے۔یہ وضاحتیں اور یہ توسیعات آج کے عہد میں زیادہ اہمیت کی حامل ہو گئی ہیں۔

اس خطبے کا ایک ایک لفظ، ایک ایک نکتہ ایسا ہے جسے سونے سے لکھا جانا چاہیے۔تاہم ان میں بھی چند نکات ایسے ہیں جو وضاحت و صراحت طلب ہیں اور کیونکہ ان میں لامتناہی وسعتیں پنہاں ہیں۔

❖ ''ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقیدِ حیات ہے۔چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی، اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے۔''

یہ مکمل مقولہ، ادب، ادب کی مقصدیت و جواز اور اس کی عمل کاری و عمل داری کی تفصیلات بیان کرتا ہے۔ادب کے 'تنقیدِ حیات' بننے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نرا ناقدِ حیات نا ہو بلکہ اس کا 'محاسب' ہو 'مستفسر' ہو 'نگہبان' ہو، اگر وہ غلط رخ پر چلے تو اسے روکے ٹوکے، اسے اس کی

حدود اور ضابطے، مناہج و مقاصد، انجام و نتائج سے آگاہ کرے۔ اسی وقت ادب صحیح معنوں میں ادب ہوگا۔ پریم چند کی یہ بات کل جس قدر اہم تھی، آج بھی ہے۔

مذکور بالا وضاحتوں کے بعد اس فقرے میں پریم چند کا نظریہ، یہ برآمد ہوتا ہے کہ ادب کا مقصد یا منصب یہ ہو کہ وہ اپنے قاری میں مثبت فکر و نظر پیدا کرے، صحیح مذاق پیدا کرے اور وہ روحانی اور ذہنی تسکین کا موجب بن جائے جس سے قاری میں قوت و حرکت پیدا ہو، کچھ کر گزرنے کی صلاحیت اس میں آجائے اور اس کے ساتھ ہی حسن کا جذبہ بھی جاگے۔ ادب میں وہ کیفیت ہو کہ فن کار اور قاری میں اور حق و باطل میں تمیز کرنے کی قوت پیدا ہو، وہ اچھائی اور برائی میں فرق کر سکے اور جب وہ صداقت کو پالے یا سمجھ لے تو اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے پائے، بلکہ مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال اسی صداقت سے آسکتا ہے۔

❖ ''مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان پر تولتا ہوں۔''

متن کی یہ عبارت آرٹ کو، افادیت کی میزان پر تولنے کی ہدایت کرتی ہے۔ منشی پریم چند تو یہ بات کہتے ہوئے غیر متامل ہیں، مگر عصر حاضر اور ماقبل کے ادیبوں کو اس میں تامل ضرور تھا بلکہ کچھ تحفظات بھی تھے، جو ذاتیات، مفادات، من تراحاجی بگویم کی مجبوری اور ایسے ہی علائم سے عبارت ہے۔ یہ کل بھی ضروری تھا اور آج بھی کہ ہر چیز کی مانند 'آرٹ' کو بھی 'افادیت' کی 'میزان' پر تولنا چاہیے۔ اس وقت آرٹ زندگی کے لیے افادی بن جائے گا اور اس کا مقصد تحریر بھی حاصل ہوگا۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ آرٹ کا تعلق حیاتِ انسانی سے ہے۔ حیات انسانی جو کہ ازل ہے اور ازل کا استعارہ ہے؛ اسی طرح آرٹ، حیات کا استعارہ اور لازمہ ہے۔ صغریٰ اور کبریٰ ملا کر نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ آرٹ حیات ہے اور حیات آرٹ! اور یہ دونوں چیزیں انسان، یعنی روح کے لیے لازمہ ہیں، چنانچہ جس طرح انسان کے جسم سے روح نکل جائے تو وہ لاشہ اور بے جان جسم بن کر رہ جاتا ہے، اسی طرح جب آرٹ کو حیات سے نکال دیا جائے تو وہ بھی لاش اور بے جان بن کر رہ جاتا ہے۔

❖ ''ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔''

یہ جملہ اپنے اندر حرکی قوتیں اور بجلیاں رکھتا ہے۔ اس کا اختصار اس کی طوالت کا غماز ہے۔ پریم چند نے اس کے ذریعے اپنے عہد کے 'معیار حسن' کی قباحتوں اور اصلیتوں کا پردہ چاک کیا ہے نیز اپنے عہد کے عوارض کا تذکرہ کیا ہے، مگر ہمارے عہد میں اس جملے کو ان تمام لوازمات و حقائق سے الگ ہی انداز سے پڑھا جانا چاہیے۔ ہم حسن کہاں دیکھیں؟ ہر اس چیز میں جسے فطرت اور عام صنعت گر نے بھی خوب صورت سانچے میں ڈھال کر بنایا ہے، پہاڑ، جنگل، درختوں، جھرنوں، ندیوں کے مناظر، اسی طرح نقش گری، پینٹنگس، تصاویر، عمارات، مصنوعی سلطنتوں، فن و فکر، اسلوب، انداز بیاں و ترسیل وغیرہ، ان میں بھی حسن دیکھیں اور اسے اپنے ادب و تحریر میں جگہ دیں؟ اگر یہ سوال ہے تو اس کا جواب 'ہاں!' ہے۔ بالکل، امروز کے تقاضوں کے مطابق ہمیں ان سب چیزوں کا ذکر کر کے 'حسن کا معیار' تبدیل کرنا ہوگا اور اسے حسن تسلیم کرنا ہوگا جس کے پیچھے ہر خالق [حقیقی و مصنوعی] کی قدرت و صلاحیت اور خلاقیت و تخلیقیت کارفرما ہے۔ حسن کے متعلق پریم چند کا نظریہ یہ ہے کہ وہ نام ہے توازن اور آہنگ کا۔ ایک اقتباس دیکھیں:

''ہماری ترکیب ہی عناصر کے توازن سے ہوتی ہے اور ہماری روح ہمیشہ اسی توازن اور ہم آہنگی کی تلاش کرتی ہے۔ ادب آرٹسٹ کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے۔ تخریب نہیں وہ ہم میں وفا اور خلوص اور ہمدردی اور انصاف اور مساوات کے جذبات کی نشو و نما کرتی ہے۔ جہاں یہ جذبات ہیں وہیں استحکام ہے، زندگی ہے، جہاں ان کا فقدان ہے وہیں افتراق، خود پروری ہے اور نفرت اور دشمنی ہے اور موت ہے۔''

یہاں پریم چند نے ادب اور ادیب کے باہمی رشتے کو واضح کرتے ہوئے حسن کے متعلق اظہار خیال کیا کہ یہ ایک ادیب یا آرٹسٹ میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرتا ہے، کیوں کہ انسان کی تخلیق بھی اسی ہم آہنگی اور توازن سے کی گئی ہے، اس کی عکاسی برج نرائن چکبست نے کیا خوب کی ہے:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب!
موت کیا ہے انھی اجزا کا پریشاں ہونا!!

چنانچہ انھیں یہ یقین تھا کہ ادب میں یہ قوت ہوتی ہے جو کمزوروں کو توانا اور تونگر بنا سکتی ہے۔

ادیب یا آرٹسٹ جو خود ایک انسان ہوتا ہے؛ اسے چاہیے کہ وفا، خلوص، ہمدردی، محبت، انصاف اور مساوات سے کام لیتے ہوئے، انسانوں کے اندر جھانکے، اس کا مطالعہ کرے، اسے اپنا موضوع خاص بنا کر اس کے افادی اور معروضی پہلوؤں کو منظرِ عام پر لائے اور اسے معراجِ ادب کا شہ سوار بنادے۔ علاوہ ازیں انسان کے مسائل و درد سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد ان کا مناسب اور زود راحت رساں چارہ جوئی بھی کرے۔ نیز اس کے اندر موجود مثبت فکروں سے اپنی تحریروں کو مزین کرے، کیوں کہ یہی زندگی کی علامت ہے اور پریم چند نے اسے زندگی سے تعبیر کیا ہے، جب کہ افتراق، خود پروری، نفرت اور دشمنی کو موت سے تعبیر کیا ہے کیونکہ یہ تخریبی عناصر ہوتے ہیں اور ادب یا حسن، تخریب کے نہیں بلکہ تخلیق کے ضامن ہوتے ہیں۔ جبکہ 'ادب' اور 'حسن' انسان اور آدمیت سے عبارت و مستعار ہیں۔

پریم چند نے ایک فنکار کی نظر سے اپنے معاشرے کو، معاشرے میں رونما ہونے اور پنپنے والے مسائل کو اور، شعوری و غیر شعوری، دانستہ و اتفاقیہ، تبدیلیوں کو، بہ نظر غائر دیکھا اور محسوس کیا تھا، اسے پھر اپنے ادب اور تحریروں کے ذریعے ان کو اس انداز میں پیش کیا کہ وہ خود ان کے محسوسات نہیں رہے بلکہ قاری کے محسوسات بن گئے اور قاری نے اس کو دل و جان سے لگالیا۔

❖ ''ہمیں اپنے ادب کا علمی معیار اونچا کرنا پڑے گا تا کہ وہ زندگی کے ہر شعبے سے بحث کر سکے۔''

ایک ایسی تلقین ہے جو ادب، خود ہمارے لیے اور ہمارے قاری جیسے مثلث کے لیے لازم ہے۔ انداز ایسا ہے جیسے کوئی بزرگ اپنے زیر تربیت بچے کو کچھ مفید باتیں سکھاتا ہے اور زمانہ و دنیا کے اونچ نیچ سمجھاتا ہے۔ پریم چند کا مدعا یہ ہے کہ ہمارے ادب کو وہ مقام ملے جو اس کا حق ہے اور زندگی اس سے مانوس ہو جائے، زندگی کے ہر شعبے پر اس کا اثر ہو اور اس طرح تعمیری تخلیقی ادب بھی منظر عام پر آئے گا۔ یہ عمل اور طریق بقول پریم چند اس لیے بھی ضروری ہے کہ:

❖ ''ہمارا مدعا ملک (وطن) میں ایسی فضا قائم کرنا ہے جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے اور نشو و نما پا سکے۔''

بہر حال منشی پریم چند کے یہ نظریات اور افکار ان کے پورے ادب میں جھلکتے ہیں اور ان کے ادب کا نچوڑ یہ صدارتی خطبہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس بات کو دو لفظوں میں کہا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کو ادب اور ادب کو زندگی بتانا چاہیے۔ ادب اور زندگی الگ الگ نہیں بلکہ انھیں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو بن جانا چاہیے۔

اور پھر اس خطبے کے آخری کلمات، جو اس کا حاصل ہیں، جو اس کا ماحصل ہیں اور جو یہ اعلان کر رہے ہیں کہ ہاں! اب ہمارا ادب نہایت اعلیٰ پائے گا۔

■

Imran Akif Khan
Govt College, Lasman Gargh
Seekar- 332311 (Rajasthan)
Mob.:9911657591
Email.: imranakifkhan@gmail.com

زبان

انسانی خیالات واحساسات کا مجموعہ ہے

عبدالعزیز عرفان

اردو رسائل میں عموماً ان ادبی مباحث اور مسائل پر زیادہ ارتکاز ہوتا ہے جن سے عوام یا معاشرے کا زیادہ گہرا رشتہ نہیں ہوتا۔ اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورت حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورت حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

ج: زبان انسانی خیالات اور احساسات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جب قوم اپنی شناخت، تہذیب اپنا کلچر، اپنا ورثہ، اپنا ادب، نیست ونابود کردیتی ہے وہ قوم زوال پذیر ہوتی ہے اور اس کی زبان کی بھی موت واقع ہوتی ہے۔

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

ج: زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اس کی بقا اور ارتقا ضروری ہے۔ اول الذکر کی ذمے داری اردو داں طبقے پر عائد ہوتی ہے۔ اس کا باشعور اور باوفا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اردو کے لیے اس کی چاہت ضروری ہے۔ اردو داں طبقے کا اردو میں آپسی گفتگو کرنا، گھر، اسکول اور معاشرے میں اس کا ماحول فراہم کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کا ذریعہ تعلیم اردو ہو یا اردو لکھنا پڑھنا جانتا ہو۔ اردو اخبارات اور کتابیں خرید کر پڑھیں۔ اردو کے لیے دامے، قدمے اور سخنے کام کریں۔ اردو ادب کے مسائل حل کریں۔ تکنیک اور انٹرنیٹ سے استفادہ کریں اور اپنی زبان کی تشہیر وغیرہ کریں۔ سرکاری سہولیات سے فیض یاب ہوں۔

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟

ج: زبان کا تہذیب وثقافت سے گہرا رشتہ ہے۔ جس طرح لکھنوی اور کشمیری تہذیب وثقافت اپنی ایک منفرد حیثیت ومقام کے حامل ہیں۔ اس کی جھلک اپنی زبان میں دکھائی دیتی ہے۔ زبان سے ہی تہذیب کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ کسی شاعر نے بہت ہی خوب کہا ہے۔

اپنی زبان ضامن تہذیب قوم ہے
تہذیب کو مٹا دو زبان سوکھ جائیگی

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

ج: بے شک زبان کے ساتھ، انسانی وراثت کا مسئلہ جڑا ہوا ہے۔ زبان کی موت، انسانی وراثت کی موت ہوگی۔

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج: واقعی کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات رونما ہوتے ہیں۔ چونکہ زبان کا عوام سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ زبان کا سماج سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ سماجی عناصر بہت ہی اہم رول ادا کرتے ہیں۔ منفی اثرات زبان کی ترقی اور بقا میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

ج: موجودہ حالات میں اردو زبان کو بہت سے خطرات کا سامنا ہے۔ 'ہندوستان سے انگریز چلے گئے لیکن انگریزیت نہیں گئی۔' اس مقولے سے واقف ہوں گے۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کا بھوت لوگوں کے سر پر سوار ہے۔ غریب بھی ہے تو اپنے بچے کو کونوینٹ اسکول میں داخل کروانا چاہتا ہے۔ ہمیں بچوں کو اردو ذریعہ تعلیم اسکول میں داخل کریں۔ کہیں ذریعہ تعلیم اردو نہ ہونے اور سہولیات نہ ہونے سے اردو داں طبقہ مایوسی کا شکار ہے۔ یہی وجہ انھیں تعلیم سے محروم اور پسماندگی کی جانب متوجہ کرتی ہے۔ لاک ڈاؤن اور کووڈ 19 سے مدارس وکالجز بند ہونے کی وجہ سے طلبا تعلیم سے دور ہوگئے ہیں۔

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: اردو کا مستقبل چند ریاستوں میں روشن ہے۔ اس کی ترویج واشاعت میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے لیکن بیشتر ریاستوں میں اس کی ترقی مدھم ہے۔ اردو زبان کی ترقی وبقا کے راستوں میں رکاوٹیں پیدا کی جارہی ہیں۔ ذریعہ تعلیم اردو کے مدارس اور اردو زبان کی تعلیم کے دروازے بند کیے جارہے ہیں۔ ایک زمانے میں لکھنؤ کی شناخت زبان اور تعلیم سے نمایاں تھی۔ علی گڑھ کے طالب علم کو قابل احترام اور ذہین سمجھا جاتا تھا۔ ملازمت کے لیے اولیت دی جاتی تھی۔ لکھنوی زبان وتہذیب کا نقش ثبت تھا۔ آج وہاں اردو زبان فریاد کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہورہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

ج: زبان کی بنیادی سطح پر کام کرنا ہوگا۔ اردو مضمون اور ذریعہ تعلیم اردو، کا حصول ہو۔ اردو ذریعہ تعلیم کو غریبوں کا اسکول نہ سمجھیں۔ اردو داں طبقہ، اساتذہ، سرپرست حضرات اخبارات ورسائل اور کتابوں کے مطالعے پر توجہ فرمائیں۔ خود پڑھیں اور پڑھائیں۔

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

ج: یہ بھی صحیح ہے کہ اردو کے ادارے زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں۔ مشاعروں، سمیناروں، ویبیناروں، اجلاسوں اور کانفرنسوں کا اہتمام ہورہا ہے۔ اچھا ہے۔ ان کے لیے اکادمیاں اور قومی کونسل تعاون فرماتی ہیں۔ موجودہ حالات میں کچھ کمیاں اور خامیاں دکھائی دیتی ہیں۔

دوسرے یہ بھی نہیں کہہ سکتے ہیں کہ زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت رُک سی گئی ہے۔ اکادمیوں کا کتابوں کی اشاعت کے لیے تعاون بہت کم ہے لیکن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا تعاون کتابوں کی خریداری، مسودوں کی اشاعت، پروجیکٹ منظوری اور تنظیموں کو مالی تعاون دینا قابل ستائش ہے۔ زبان کی حیات ادبی تحریروں پر منحصر ہے۔ اکادمیاں اور دوسرے ادارے مصنّفین اور شعرا کی کتابیں خریدنے اور اشاعت کرنے پر توجہ فرمائیں۔ کتابوں کی اشاعت برابر ہورہی ہے۔

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ج: اس پر گفتگو سے زبان کو یقینی فائدہ پہنچ سکتا ہے اس سے روشن پہلو بھی نکلتے ہیں اور استفادہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

ج: اردو اسکول: 196، تعداد اساتذہ: 1840، طلبا: 63536

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

ج: شہر اورنگ آباد میں کارپوریشن کی تین اردو لائبریریاں ہیں۔ صرف دو مقامی اخبارات اورنگ آباد ٹائمز، ایشیا ایکسپریس اور مقامی انگریزی اور مراٹھی اخبارات کے ساتھ ہی محلّہ لائبریریوں کا اہتمام ہو رہا ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کررہے ہیں؟

ج: شہر اورنگ آباد میں تقریباً پچاس اردو تنظیمیں اور پچاس ادارے اور انجمنیں ہیں لیکن بعض بیدار تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہی فروغ اردو کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ عموماً ادبی نشستوں، مشاعروں، سمیناروں، ویبیناروں اور بزم ادب کی محفلوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ چند ادبا وشعرا ہی تصنیف وتالیف کا کام انجام دیتے ہیں۔

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

ج: شہر اورنگ آباد زمانۂ قدیم سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ آج بھی اردو زبان وادب سے جڑی ہوئی بہت سی شخصیات ہیں جو مختلف اصناف سخن کے تخلیق کار ہیں۔ کثیر الجہت اور کثیر التصانیف ہیں صرف چند حضرات کا اعتراف ریاستی سطح پر کیا گیا۔ ایک ہی شخصیت کا قومی سطح پر اعتراف کیا گیا۔

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کوشش کررہے ہیں؟

ج: میرا تعلق درس وتدریس سے رہا ہے۔ وظیفہ یاب ہونے کے بعد بھی دس سالوں تک درس وتدریس وتعلیمی رہنمائی اور SS.A سے (2004-2021) آج تک منسلک رہا۔ ساتھ ہی اورنگ آباد اکیس سالہ قیام کے دوران ادب اطفال، تانیثی ادب، تحقیق وتاریخ وتنقید، مولانا آزاد، تعلیمی وادبی، تراجم اور موضوعات پر تین درجن کتب منظر عام پر آئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ لکھائی اور پڑھائی کا سلسلہ جاری ہے۔ قومی کونسل کے تینوں ماہناموں میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

ج: (1) اردو داں طبقے کا سرگرم عمل، متحرک، فعال اور بیدار ہونا ضروری ہے۔ جنھیں تعلیم کے ستون کہا جاتا ہے۔ فرائض مکمل کریں۔ (2) اردو سے چاہت رکھیں۔ (3) اپنے بچوں کو اردو میں تعلیم دلوائیں (4) دامے، درمے، قدمے اور سخنے اردو کی مدد کریں (5) اردو زبان وادب کا ذخیرہ بڑھائیں (6) اردو شعرا وادبا کے مسودات شائع کریں، کتابیں خریدیں اور انعامات واعزازات سے نوازیں اور مالی تعاون فراہم کریں۔ ریاستی اکادمیاں بھرپور تعاون کریں (7) اردو زبان ذریعہ تعلیم ہو۔ اسکولس، کالجز اور یونیورسٹیز میں اردو مضمون پڑھایا جائے اور طلبا کو اسکالرشپ اور دیگر سہولیات فراہم کیا جائے۔ ان کے مسائل حل کیے جائیں۔ (8) ریاستی اور مرکزی سرکار اردو اسکولز، کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر توجہ فرمائے۔ اساتذہ اور طلبا کو دی جانے والی سہولیات اور گرانٹ فراہم کرے تاکہ تعلیمی پسماندگی دور ہوسکے۔

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوشش کررہے ہیں؟

ج: اردو رسم الخط کا استعمال زیادہ کریں۔ بچوں کو ان حروف تہجی کو سیکھنے، پڑھنے اور لکھنے کی تاکید کریں۔ اپنے رسم الخط ہی استعمال کریں۔ یہی اردو زبان کی شناخت ہے۔ اردو رسم الخط کی تبدیلی، اردو کے لیے زہر ہلاہل ثابت ہوگی۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد صاحب ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی میں مالیگاؤں کتاب میلے میں کہا تھا رسم الخط کسی بھی زبان کی روح ہوتی ہے۔ روح نہ ہو تو جسم بے معنی ہے۔ لہٰذا اردو کو اس کے اصل رسم الخط سمیت باقی رکھنا اور فروغ دینا ہماری ذمے داری ہے۔ (اردو دنیا فروری 2022، ص 13)

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

ج: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی صورتیں نکل سکتی ہیں۔ مراٹھی، انگریزی اور دیگر زبانوں کے اخبارات اردو شاعروں، اور کتابوں پر تبصرے تحریر کرتے ہیں۔ غزلیں، گیت، ڈرامے وغیرہ علاقائی زبانوں میں شائع کرتے ہیں۔ اس طرح کے کالم اور تحریریں اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

ج: جی ہاں

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

ج: جی ہاں۔ ان شاء اللہ ضرور

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

ج: غیر اردو داں طبقے کو اردو کلاسیس کے ذریعے اردو سکھائی جا سکتی ہے۔ انھیں اردو کے مشاعروں اور اردو محفلوں میں شرکت کی دعوت دی جا سکتی ہے۔ اردو کے متعلق دلچسپی پیدا ہو کر لتا حیا، دپتی مصرا، کرشن چندر اور گوپی چند نارنگ جنم لے سکتے ہیں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج: تین یونیورسٹیز ہیں۔ تقریباً پچاس طلبا کی شرکت ہوگی؟ صرف دو میں ہی شعبہ اردو ہے اور دس کالجز کا شمار ہے۔ جن میں مولانا آزاد کالج، سرسید کالج، نوکھنڈہ کالج اور دیگر ڈی ایڈ، بی ایڈ کالجز میں تقریباً کم وبیش تین ہزار طلبا تعلیم پاتے ہیں۔

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟

ج: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں تعاون کیا جا سکتا ہے۔ یہ سائنس، میڈیا اور انٹرنیٹ کا دور ہے۔ اردو زبان وتہذیب وثقافت اور ڈراموں، کانفرنسوں کے ذریعے ادبی پروگرام کرسکتے ہیں اور ٹی وی اور میڈیا کے ذریعے تشہیر بھی کرسکتے ہیں۔ جس طرح الیکشن کے دنوں میں مدد لی جاتی ہے۔

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ج: ان اسکولوں میں اردو بحیثیت ایک مضمون بھی نہیں اور نہ ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ یہاں اردو کا دروازہ بند ہے۔

■

Dr. Abdul Aziz Irfan
Near Maulana Azad College
National Colony, Plot No.: 34
Aurangabad- 431001 (MS)
Mob.:9890204715

ماجد دیوبندی

غزل کا معتبر لہجہ
ڈاکٹر نسیم نکہت

شاعری ہمارے احساسات کا آئینہ ہے اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر اپنی مختصر سی غزل کے ایک ایک شعر میں ایک کائنات سمو دیتا ہے۔ شاعر اپنا کرب بیان کرتا ہے لیکن اصل میں وہ زمانے کا درد ہوتا ہے۔ زبان کو آسان بنانے کی کوشش میں ہم اس کی ساخت کو کمزور کرنے لگ گئے۔ اس کے باوجود غزل نے نہ اپنا حسن چھوڑا اور نہ اس کی نازکی کم ہوئی۔ غزل میں فکر و فن کے حسین امتزاج کو آگے بڑھاتے ہوئے شعر و ادب کی لطافتوں کو اپنے احساسات کا وسیلہ بنانا بہت اہمیت کی بات ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں مرد شعرا کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی اس نرم و نازک صنف غزل میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔ ہندستان میں تہذیبی اسکول حیدرآباد کی چشم و چراغ 1768 میں پیدا ہونے والی پہلی ہندستانی شاعرہ ماہ لقا چندا ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کا پہلا مجموعہ کلام شائع کیا۔ یہ شاعری ان کو اپنے والد راج کنور سے وراثت میں ملی جو بہادر شاہ ظفر کے کورٹ میں بہادر خاں کے نام سے مشہور تھے۔ ہماری اس صدی میں خاص طور پر ملک کی آزادی سے آج تک شاعرات کی نمائندگی باقاعدہ ہوتی رہی۔ پاکستان میں جن شاعرات کے نام بہت اہمیت کے حامل ہیں ان میں ادا جعفری، گلنار آفریں، زہرہ نگاہ، ریحانہ روحی، صائمہ بخاری، کشور ناہید اور اپنے لہجے، انداز اور سادگی میں پروین شاکر سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ہندستان میں 1901 میں نواب سلطان جہاں بیگم کے بعد عزیز بانو داراب وفا، حیا لکھنوی، بیگم ممتاز مرزا، مسعودہ حیات، نور جہاں ثروت، نسیم مخموری، تسنیم صدیقی، برکھا رانی اور ان میں سب سے معتبر اور خاص نسوانی لہجے کی پہچان ڈاکٹر نسیم نکہت کا نام لیا جا سکتا ہے جن کو ہندستان کی پروین شاکر بھی کہا جاتا ہے۔ افسوس آج وہ ہمارے بیچ نہیں اور مجھے ان کو مرحوم کہتے ہوئے دل پر پتھر رکھ کر یہ تحریر لکھنی پڑ رہی ہے۔

1980 میں سرائے میر ضلع اعظم گڑھ کے ایک مشاعرے میں جس کی نظامت حضرت عمر قریشی فرما رہے تھے میری نسیم نکہت صاحبہ سے پہلی ملاقات تھی۔ غالباً یہ ان کا پہلا مشاعرہ تھا جس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک مضمون میں بھی کیا تھا کہ انھوں نے 1980 میں پہلا مشاعرہ پڑھا تھا۔ حسن کا یہ عالم کہ دیکھیں تو نظر چکرا جائے، اسٹیج پر بیٹھنا ایسا کہ ادب بھی فخر کرے، گفتگو ایسی کہ پھول جھڑ رہے ہوں۔ اس پر ستم یہ کہ جب مائک پر آئیں تو مشاعرہ آسمان کو چھونے لگے اور سامعین دیوانہ وار ان کی شاعری پر تڑپنے لگے۔ ہندستان کے تمام اساتذہ اور بڑے نام اس مشاعرے میں موجود تھے۔ ہر شخص ان کی طرف متوجہ تھا اور ان کی سنجیدگی کی تعریف بہ آواز بلند اور ان کے حسن کی تعریف نیچی نظروں سے کرنے پر مجبور تھا۔ اس کے بعد سے ملاقاتوں کا سلسلہ ابھی تک جاری رہا۔ ابھی ایک ماہ قبل ان سے آخری ملاقات علی گڑھ نمائش کے سالانہ مشاعرے میں ہوئی تھی جہاں انھوں نے سخت علالت کے باوجود اپنا کلام پیش کیا تھا۔ گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے چلنے پھرنے میں بھی دشواری ہو رہی تھی لیکن ضرورت ان کو مشاعروں میں لایا کرتی تھی۔ ہم لوگ دنیا بھر میں ساتھ رہے لیکن ان کی خوش مزاجی اور بزلہ سنجی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہر وقت ہنسنا، مذاق کرنا اور خوبصورت جملوں سے محفل کو باغ باغ کرنا ان کا مزاج تھا۔ علمی خانوادے سے تعلق رکھنے والی یہ شخصیت 10 جون 1958 کو اتر پردیش کے مشہور شہر بارہ بنکی میں پیدا ہوئیں۔ بعد میں لکھنؤ آ گئیں اور اسی کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنا لیا۔ زندگی کی آخری سانس اسی تہذیبی شہر لکھنؤ میں لی۔ تقریباً چالیس سال مشاعروں میں حکومت کرنے کے بعد بھی ان میں ذرا تکبر نہیں تھا۔ آج کے مشاعروں میں شاعرات کے تماشے دیکھ کر افسوس ضرور کرتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ ایک ہمارا زمانہ تھا اور ایک آج کا زمانہ جہاں نہ ادب ہے، نہ تہذیب اور نہ شعر پڑھنے کا سلیقہ۔ بہت سے اردو روزناموں میں کالم لکھا کرتی تھیں۔ ادبی مضامین تو سیکڑوں کی تعداد میں لکھے ہیں۔ عرصہ دراز تک اردو روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' سے بھی منسلک رہیں۔ دنیا بھر میں اپنی پہچان اور خودداری کے ساتھ مشاعرے پڑھے اور کبھی اپنی انا کو ٹھیس نہ پہنچنے دی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ نسیم نکہت نے مشاعروں پر حکومت کی ہے اور اپنی معیاری شاعری سے ادب کو مالا مال کر دیا۔ ان کی اہم تصنیفات میں 'دھواں دھواں' (شاعری 1984)، 'خواب دیکھنے والو' (شاعری 2002)، 'یادوں کے موسم' (شاعری۔ ہندی) اور 'اردو شاعری میں واقعات کربلا' (نثر 2013) بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ان کا تحقیقی مقالہ بھی تھا جو کربلا جیسے اہم موضوع پر لکھا گیا۔

عالمی شہرت یافتہ شاعرہ نسیم نکہت نے کبھی اپنے فکر و فن اور پاکیزگی پر آنچ نہیں آنے دی۔ نثر ہو یا نظم بھرپور لکھا اور خوب لکھا۔ ان کے سیکڑوں اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ حمد، نعت، قصیدہ، مرثیہ، سلام، نعت کے علاوہ موضوعاتی نظمیں لکھنے میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ مختلف موضوعات پر خوب شعر کہتیں۔ ان کا لہجہ نسوانی احساسات اور ایک عورت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھاتا تھا۔ زندگی کے الگ الگ رنگوں پر ان کی شاعری اپنے معیار پر پوری اترتی تھی۔ سکھ، دکھ، رنج والم، خوشی و غم، درد دل، درد جگر، قوت احساس کی معراج ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز تھا۔ ظاہری اور باطنی حواس خمسہ کے ساتھ سماج اور معاشرے کے ہر منفی اور مثبت پہلو پر ان کی نظر تھی۔ تخلیقی ذہانت کے ساتھ انھوں نے جو کچھ لکھا، معیار کا خیال رکھا۔ وہ نادیدہ مناظر کو بھی اپنے الفاظ کی گرفت میں لاکر ایک تصویر بنانے کا فن خوب جانتی تھیں۔ شاعری میں نئی حرکت اور توانائی کا عکس ان کے یہاں جگہ جگہ موجود ہے۔ اتنی شہرت، مقام، عظمت اور غزل کی پہچان کے طور پر اپنا دبدبہ بنانے والی

یہ پیاری شاعرہ زندگی سے ٹوٹ سی گئی تھی۔ اپنے گھر اور کرم فرماؤں کی طرف سے ان کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جو شاید بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کرب کے باوجود وہ شعر کہتیں اور اپنا غم ہلکا کرتیں۔ نمونے کے طور پر ان کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں جن میں ان کا فن، لہجہ اور سنجیدگی کی بھرپور عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔

جو مچھلیوں کو سکھاتا ہے تیرنا نکہت
وہی تو ہے جو مچھیروں کو جال دیتا ہے

ملنا ہے تو آ جیت لے میدان میں ہم کو
ہم اپنے قبیلے سے بغاوت نہیں کرتے

سجدوں کو میرے پھر تری چوکھٹ نصیب ہو
منزل تلک پہنچنے کا رستہ مجھے بھی دے

اردو شاعری میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین نے وقت کے ساتھ چلتے ہوئے اپنی سوچ کو جو نیا جذبہ اور ولولہ بخشا ہے اس نے ایک نئی تاریخ کو جنم دیا اور اس میں گھر کے موضوعات کو غزل کا پیرایہ بخشتے ہوئے نرم و نازک خیالات پیش کیے جو بہت اہم بات ہے۔ آج کے دور میں مردوں کے شانہ بہ شانہ سفر کرتے ہوئے نئے انقلاب کو جنم دینا قابل قدر کام ہے۔ نسوانی احساسات اور گھر آنگن کے مسائل کو غزل بنانا آسان بات نہیں۔ چار دیواری سے نکل کر معاشرے میں اپنی پہچان بنانا معمولی جذبہ نہیں۔ آج کی شاعرہ نے گھر سے بغاوت کر کے ادب اور شاعری کو آگے بڑھایا ہے جن میں نسیم نکہت کا نام بہت اہمیت سے لیا جاتا ہے۔ دبستان لکھنؤ میں چند ایک شاعرات کا نام لیا جا سکتا ہے جنھوں نے اپنی فکر سے ادب کو مالا مال کر دیا۔ نسیم نکہت نے داد و تحسین کی فکر کیے بغیر معیاری اور ادبی روایات کو نبھاتے ہوئے اپنی پہچان بنائی ہے۔ ان کی شاعری میں منصوبہ بندی نہیں بلکہ حقائق کی کارفرمائی دیکھنے کو ملتی ہے جو اس دور کی بہت کم شاعرات کے یہاں ہے۔ تقریباً چالیس سال کے طویل عرصے میں انھوں نے ملک اور بیرون ملک اپنی شاعری کا جادو جگایا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے قاری اور سامع ازخود پیدا کیے۔ کسی کی مرہون منت نہ رہ کر اپنے علم اور شعری کاوشوں سے اپنا لوہا منوایا۔ جس دور میں شاعرات کا مشاعرے میں جانا کچھ خاص اچھا نہ سمجھا جاتا ہو، نسیم نے اپنے حوصلے اور ہمت سے شعر و ادب کی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے خوف کے بتوں کو توڑ کر وقت کی آنکھ سے آنکھ ملا کر اپنا شعری سفر مکمل کیا۔ یوں تو مختلف موضوعات پر انھوں نے شعر کہے لیکن نسوانی جذبات اور نرم و نازک خیالات کو غزل کا لہجہ دیا۔ ان کے یہ اشعار دیکھیں۔

مری آنکھوں سے نیندیں لے کے تم نے رت جگے بخشے
مرے تکیے مرے بستر سے راتیں بات کرتی ہیں

زندگی جیسے بھی جی چاہو گزارو لیکن
آئینہ سامنے آئے تو ندامت بھی نہ ہو

یہ اداس اداس موسم یہ خزاں خزاں فضائیں
وہی زندگی تھی جتنی ترے ساتھ کٹ گئی ہے

شاعر اپنے کلام میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ اپنے عہد کو پیش کرتا ہے جس میں قدم قدم پر راستے کے کانٹوں اور پتھروں پر چل کر تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ کسی کہکشاں کی خواہش نہ کرتے ہوئے اسے صرف اور صرف چلنا آتا ہے اور یہ چلنا اس کو منزل کی طرف لے جانے کا ہنر رکھتا ہے۔ شاعری کیونکہ ادب کا ایک اہم جزو ہے، اس لیے ہر دور کی تاریخ کی جھلکیاں اس دور کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ ہر دور کسی نہ کسی انقلاب سے گزرا ہے۔ شاعر اپنی عقل و فہم کے بل بوتے پر اپنی زندگی میں تبدیلیاں لاتا رہتا ہے۔ نسیم نکہت کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بہر حال ادب کی پاکیزگی کو ملحوظ رکھا ہے ساتھ ہی اپنی شاعری سے ایک پیغام کا کام لیا ہے۔ اس میں ان کو بہت سے کرب، مصائب اور طوفان سے گزرنا پڑا ہے جو ان کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید مایوس ہو کر بیٹھ جاتا لیکن ان کے حوصلے نے ان کو جلا بخشی اور وہ آگے بڑھتی گئیں اور دلیری کے ساتھ نئی نسل خاص طور پر خواتین کو حوصلہ بخشا۔ جس طرح آگ میں تپنے کے بعد سونا کندن بن جاتا ہے، اسی طرح نسیم نکہت نے خود کو گھلا کر زندگی کا وہ روپ پیش کیا ہے جو ایک نیا حوصلہ بخش لائحہ عمل طے کرتا ہے۔ ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اپنے چہرے کو بدلنا تو بہت مشکل ہے
دل بدل جائے گا آئینہ بدل کر دیکھو

مانا کہ میں ہزار فصیلوں میں قید ہوں
لیکن کبھی خلوص سے مجھ کو بلا کے دیکھ

مجھ کو یہ در بدری تو نے ہی بخشی ہے مگر
جب چلی گھر سے تو میں نام ترا لے کے چلی

شاعر کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو جائے لیکن وہ خدائے سخن میر اور غالب کو فراموش نہیں کرتا بلکہ اپنی شاعری میں ان سے استفادہ کرتا ہے۔ عورت کس طرح غزل میں بول سکتی ہے اس کی مثال نسیم کی شاعری سے دی جا سکتی ہے۔ با وقار اور معتبر لہجے سے انھوں نے اردو شاعری میں نسوانی احساسات کو جلا بخشی ہے جو ان کو بہت سوں سے الگ مقام کی حامل شاعرہ بناتا ہے۔ ان کے یہاں بلند حوصلے کی فراوانی ہے جہاں طوفان سے لڑنے کا عجیب جذبہ نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری اور زندگی کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسائل اور مصائب میں الجھنے کی عادی ہو گئی تھیں یہاں تک کہ ان کو خوف تھا کہ اگر یہ طوفان تھم گیا تو شاید ان کی زندگی کی کشتی ڈوب جائے گی۔ زندگی بھر وہ اپنے عزیز و اقارب کے ہاتھوں مصائب کے گرداب میں الجھی رہیں لیکن حوصلہ نہیں چھوڑا اور آگے بڑھتی رہیں حتیٰ کہ ایک منزل پر پہنچ کر دم لیا جہاں ان کا قد ادب اور مشاعروں میں بہت بڑا ہو چکا تھا۔ ان کے یہاں انسان کو انسان دیکھنے کی جو خواہش تھی بھرپور طور پر شاعری بن کر سامنے آئی۔ خود غرضی کے دور میں بھی انھوں نے اپنے وقار پر آنچ نہیں آنے دی اور یک رنگی اور جمود کی رفتار کو روک کر آگے قدم بڑھا کر خود کو زندہ کر دیا۔ نسیم نے اپنے عمل اور شاعری سے یہ ثابت کیا کہ وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور مشکلات کو پیچھے چھوڑ کر ایک نئی دنیا آباد کریں۔ انھیں معلوم تھا کہ بلند حوصلوں کے آگے زندگی کے بڑے سے بڑے طوفان سرنگوں ہو جاتے ہیں اور ایسے ہی جواں حوصلہ رکھنے والوں کا انتظار منزل خود کیا کرتی ہے۔ گرداب میں پھنس کر طوفان کا مقابلہ کرنے والی اس معتبر شاعرہ کو ادب میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اپنے میں جہانِ اضطراب اور ایک جہان آرزو رکھنے والی ظاہری و باطنی، مادی و روحانی، شعوری و لاشعوری، جاگتے اور سوتے بھی ایک ہمہ جہت حرکت رکھنے والی ڈاکٹر نسیم نکہت سب کو مایوس کر کے 29 اپریل 2023 کو اس دنیائے فانی سے چلی گئیں اور اپنے چاہنے والوں کو روتا ہوا غم کے ماحول میں چھوڑ گئیں۔ مضمون کے اختتام پر اُن کے چند مشہور اور خوب صورت اشعار حاضرِ خدمت ہیں۔

غالب کا رنگ میر سا لہجہ مجھے بھی دے
لفظوں سے کھیلنے کا سلیقہ مجھے بھی دے

سفر کا حوصلہ کافی ہے منزل تک پہنچنے کو
مسافر جب اکیلا ہو تو راہیں بات کرتی ہیں

بس احترام میں پنجرے کے پر سمیٹے ہوں
جو پر پسار دوں پنجرے کی تیلیاں اڑ جائیں

Dr. Majid Deobandi
S-3/24, Meezan Road, Jogabai, Jamia Nagar
New Delhi-110025
Mob.: 9810859786

ادب کا مہر و ماہ

پروفیسر شاداب رضی

عبدالباسط حمیدی

شاداب رضی نے 12/جنوری 1955ء میں آنکھیں کھولیں۔ وہ بچپن ہی سے ذہین تھے۔ ربّ قدیر نے انھیں بے پناہ ذہانت وفطانت سے نوازا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آکسفورڈ آف دی ایسٹ (Oxford of the East) کا رخ کیا اور پٹنہ یونیورسٹی سے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کی تعلیم حاصل کی، ایم اے کی تعلیم میں سب سے عمدہ کارکردگی کی بنا پر طلائی تمغے سے نوازے گئے۔ انھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ نگراں اول پروفیسر کلیم الدین احمد کی وفات کے بعد شیدائی جمالیات پروفیسر لطف الرحمٰن کی نگرانی میں مکمل کیا۔ ان کے مقالے کا نام 'اردو تنقید میں نئے رجحانات صوبۂ بہار کے حوالے سے' تھا۔

شاداب رضی مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت مشفق استاذ، بلند پایہ شاعر، معتبر ناقد محقق اور سخنوری کے رمز شناس تھے۔ ان کی باضابطہ ملازمت 1980 میں پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو بھاگلپور یونیورسٹی میں ہوئی اور وہ اسی یونیورسٹی سے پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کے عہدے سے جنوری 2020 میں سبکدوش ہوئے۔ ابتدائی ملازمت سے ہی انہوں نے طلبا کی ہمہ جہت تعلیم وتربیت میں وافر حصہ لیا اور اس کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہے۔ ملازمت سے سبک دوشی جنوری 2020 میں ہوئی، سبکدوشی کے چند مہینوں بعد 13/ستمبر 2020 بہ مقام بھاگلپور اس دار فانی سے دار القرار کے لیے رخصت ہوگئے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

یہ واضح رہے کہ تنقید ہی ان کے درس وتدریس کا موضوع بالخصوص شعبۂ اردو میں رہا۔ تخلیقی اور تنقیدی صلاحیت خداداد تھی۔ ان کی شعری تخلیقات، تنقیدی نگارشات اور تحقیقی مقالے مؤقر جرائد ورسائل آج کل، فکر وتحقیق، اکادمی، شاعر، اوراق، شعر وحکمت، ایوانِ ادب، علی گڑھ میگزین، ادیب وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ کوثر صدیقی نے 'علم ودانش' کے خصوصی شمارے میں نئی غزل کی ایک معتبر آواز، شاداب رضی کو قرار دیا ہے۔ پروفیسر منظر اعجاز نے اپنے مضمون 'نئی غزل میں تلمیحات کی معنوی وسعت' مطبوعہ سہ ماہی فکر وتحقیق نئی غزل نمبر 16/ص 31 میں اسّی کی دہائی سے ترتیب پانے والا غزل کے منظرنامے میں معروف شاعروں کی فہرست پیش کی ہے۔ شاداب رضی کا نام اس میں بھی شامل ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ نکہت ریحانہ خان نے اپنی کتاب، اردو مختصر افسانہ: فنی وتکنیکی مطالعہ صفحہ 93/میں کرشن چندر کے لیے شاداب رضی کے اقتباس کو شامل کر کے اپنے مضمون کو مدلل بنایا ہے۔

پروفیسر شاداب رضی کے شاگردوں کی لمبی فہرست ہے جو مختلف دانش گاہوں میں خرد افروزی کر رہے ہیں اور شمع محفل بنے ہوئے ہیں۔ وہ مختلف یونیورسٹیوں میں موڈریشن بورڈ کے ممبر کے ساتھ پی ایچ ڈی کے ممتحن بھی رہے۔ وہ بہار اردو اکادمی مجلس عاملہ کے رکن بھی تھے۔ ان کی گراں قدر خدمات کے پیش نظر بہار اردو اکادمی پٹنہ نے بھی اعزازیہ کے ساتھ سند اعتراف پیش کیا ہے۔ بھاگلپور کی ادبی تاریخ میں علمی وادبی فضا کی آبیاری کے سلسلے میں حلقۂ ادب بھاگلپور کے صدر پروفیسر شاداب رضی اور سکریٹری حبیب مرشد خاں کی کاوشیں 20ویں صدی کی آخری دہائی میں ناقابل فراموش ہیں جو نہ صرف ادبی سطح پر سرگرم رہے بلکہ اردو کے تحفظ وبقا کے لیے سعی پیہم کرتے رہے۔

'جدیدیت کی جمالیات' پروفیسر لطف الرحمٰن کی تنقیدی تصنیف ہے جو 1993 میں شائع ہوئی۔ اس اہم کتاب کے مرتب پروفیسر شاداب رضی ہیں۔ جس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ یہ کتاب کئی جگہ داخل نصاب ہے۔ انھوں نے کیف عظیم آبادی، پروفیسر سید رفیق الزماں، پروفیسر قمر الہدیٰ وغیرہ کی کتابوں پر تقاریظ وتبصرے لکھے۔ جن کی انفرادیت یہ ہے کہ ان میں فن کار کے پورے تخلیقی رویے کو سمیٹ لینے کے ساتھ ساتھ ان پر مثبت رائے زنی بھی کی ہے۔ مختصر یہ کہ وہ تعمیری تنقید کے حامی تھے۔ تخریب کاری سے ان کو دور دور تک کا واسطہ نہ تھا۔

شاداب رضی نے صحافت سے اپنی ادبی زندگی کی شروعات کی۔ عملی زندگی میں درس وتدریس کو ہی، حرز جاں بنائے رکھا۔ انھوں نے مشاعروں کو بھی اپنی موجودگی سے زینت عطا کی ہے۔ وہ سمپوزیم اور سمینار میں بھی شریک ہوتے رہے۔ گوناگوں حصولیابیاں جہد مسلسل کے بغیر ممکن نہیں۔ ان کی پوری زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی، ان کی شخصیت بلاشبہ خودساز تھی جسے انگریزی میں Self Made سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں پروفیسر شاداب رضی فن شاعری کے رمز شناس اور قادر الکلام شاعر تھے 'خواب دیکھتی آنکھیں' ان کا شعری مجموعہ ہے۔ یہ دھیان رہے کہ اسی نام سے ہما مختار کا ایک ناول بھی ہے۔ انہوں نے اس دشت میں اس وقت سے سیاحی شروع کردی تھی جب وہ گریجویشن میں داخل ہوئے تھے۔ ان کی شعری تخلیقات میں پابند اور معرّیٰ نظموں کے علاوہ آزاد نظمیں بھی ہیں۔ دوہے، گیت، قطعہ اور غزلیات بھی صوری، معنوی محاسن اور غنائیت سے مملو ہیں ان کی غزلیں اور نظمیں ماہنامہ شاعر، سب رس، شب خون، مریخ، زبان وادب اور آج کل وغیرہ ماہناموں کی زینت ہوا کرتی تھیں۔ ایک بلند پایہ شاعر کے شعر وسخن میں جو بھی خوبیاں ہوسکتی ہیں کم وبیش ان کے یہاں موجود ہیں۔ ان کے یہاں ایسے غزلیہ اشعار کی کثرت ہے جو زندگی کے گہرے اور رنگارنگ تجربات کی بنا پر ہمارے شعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔

گم صم گم صم لب یاد آئے　　تم یکلخت غضب یاد آئے
ایک اداسی ہے پہروں سے　　یاد نہیں تم کب یاد آئے
خود کو اکیلا پایا ہوں میں　　محفل میں جب تم یاد آئے
رات میں تل تل دن کی الجھن　　دن میں غبار شب یاد آئے
کم نہ آئے اپنے پیارے　　یاد آنے کو سب یاد آئے
بات چلی جب نام وروں کی　　کچھ بے نام ونسب یاد آئے
تم شاداب رضی کیا جانو　　کیوں بچپن جب تب یاد آئے

ہر تخلیق کار اپنی تخلیق کے رگ و پے میں پیوست رہتا ہے۔ اس کی انفرادیت کی لے میں شب وروز اور عصری زندگی کے تجربے شامل ہوتے ہیں۔ کووڈ-19 پروفیسر شاداب رضی کی آخری شعری تخلیق ہے جو آج کل دسمبر 2020 میں شائع ہوئی۔ یہ منفرد نظم عصرِ حاضر کی زخمی، روح فرسا اور بے یار و مددگار موت سے ہم کنار پوری انسانیت کی پرسوز لے ہے۔ حالات کے تئیں ذہنی بے اطمینانی، موت کی آہٹ، خوف و ہراس اور انتشار کی کیفیت دیکھیے۔

ہلاکت خیز جرثومہ کورونا   زمیں زادوں کی دانش کا کرشمہ ہے

آگے کیا ہی خوب لکھا ہے۔

وجود اس کا ہو جیسے حل طلب کوئی معما/ حقیر اتنا مثال، غیر مرئی نقطۂ فرضی
نہ اس کی شکل و صورت/ قد نہ قامت اور کوئی رنگت
سرے سے جاں نہیں ہوتی/ کسی پر کچھ نہیں واضح
جسارت دیکھیے اس کی/ لیا ہے پنگا اس نے اشرف المخلوق سے
جو ہے خود ہی خلیفہ بحر و بر کا...

کووڈ-19 نظم میں آخر میں شاعر نے تضمین سے بھی کام لیا ہے۔ آخر میں یوں گویا ہوئے۔

شیخ سعدی کی دعا میں ہوں شریک   ایک ذرا سے فرق سے
کریما بہ بخشائے بر حالِ ما   کہ ہستم اسیرِ کمندِ 'وبا'

ان کی شاعری کی ظاہری اور معنوی خوبیاں مندرجہ ذیل اشعار میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

یہ دنیا ایک تازہ کربلا ہے   یہاں ہر سانس میں کربل کتھا ہے
شب مہتاب ہے، گم صُم فضا ہے   تمہاری یاد کا دفتر کھلا ہے
سویرا شام سے پھر جا ملا ہے   دھیان اب تعاقب میں لگا ہے
مرا ممدوح مانگے مدح لمبی   گریز اب کے قصیدے میں سوا ہے
بڑھا جب ہاتھ کوئی دوستی کا   تری یادوں کے ہاتھوں دل دُکھا ہے
جلے خود روشنی اوروں کو بخشے   مرا ہمزاد اک جلتا دیا ہے
ہے کرتب وقت کے ہاتھوں کا یہ بھی   ترے قد سے ترا سایہ بڑا ہے
طلب کی بیل ہے شاداب جتنی   شجر امید کا اتنا جلا ہے

کچھ دوسرے اشعار بھی زینتِ نگاہ ہوں۔

طرب فروز نظاروں سے دور کوسوں دور   جہاں نہ قہقہہ کوئی، نہ کوئی سرگوشی
فقط سکوت کا اک سلسلہ ہے چاروں طرف   فضا کے ہونٹوں پہ ہے ثبت مہر خاموشی
زبان ساز ہے گنگ اور نغمگی چُپ ہے   فضائے شہرِ خموشاں میں زندگی چُپ ہے

شاداب رضی کی شاعری خلوص کا بھی آئینہ دار ہے یعنی انھوں نے جو محسوس کیا اس کو ظاہر کیا اور اس حد تک مقبول بھی ہوئے۔ اسے ہم شعری خلوص یا جذباتی کیفیت کا آئینہ دار کہہ سکتے ہیں۔

انھوں نے جمالیاتی پیانوں کو بھی استعمال کرنے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے ادب کی ادبیت کو، اور اس کی فوقیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور ادب کو افادی اور اجتماعی زاویوں سے پرکھا۔ انھوں نے تنقید ہو یا شاعری، ہمیشہ توازن و اعتدال سے کام لیا۔ چنانچہ ان کی تحریروں اور شعری درون خانوں سے علم کی روشنی چھن چھن کر آتی ہے۔ ان کی تحریروں سے خیر و صداقت کے سرچشمے پھوٹے ہیں۔ انھوں نے ادب کی دونوں شاخوں کو مثبت انداز میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے جو بھی بات کہی ہے۔ اس سے تیقن اور قطعیت کی خوشبو آتی ہے۔

عہد زریں کے معروف شاعر مومن خاں مومن کے شعری طرز ادا سے اردو دنیا محفوظ ہوتی رہی ہے۔ چھوٹوں کی بات کیا، غالب، شیفتہ جیسے سخنوروں نے مومن کے بعض شعروں کو سَراہا ہے۔ اس باب میں شاداب رضی کے افکار تازہ کچھ اس طرح نظر آتے ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

خود کو اکیلا پایا ہوں   محفل میں تم جب یاد آئے

مذکورہ بالا شعر سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہے۔ اس طرح کی مثالوں سے ان کا شعرستان منور ہے۔ سادگی، سہل پسندی ان کی شاعری کے خاص وصف ہیں۔ تکلفات سے انھوں نے بہر حال اپنے دامن کو بچایا ہے۔

شاداب رضی کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ شعرا یا ادبا کا نام لیں اور ان میں شاداب رضی کا نام نہ لیں۔ ان کو چھوڑنا بھی چاہیں تو وہ بزور اپنا حق ہم سے منوالیں گے۔ ان کی شاعری سچ بولنے والوں کی شاعری ہے۔ ہر ہر شعر عطر بیز ہونے کے ساتھ ساتھ نقاب کشا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حقیقت اور صداقت ناصیہ فرسا ہے۔ انھوں نے تصنع سے کام نہیں لیا ہے۔ اس لیے کہ ان کی شاعری کو پڑھتے ہی اس کی تازگی روح تک محسوس ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں تہذیب و متانت کی بھی جلوہ گری ہے۔ انھوں نے شاعری اس طرح کی ہے کہ ہر پڑھنے والا اس کے اچھوتے انداز پر متوجہ ضرور ہوتا ہے اور محض متوجہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔

جس طرح ماسبق شعرا نے اپنی شاعری میں گل کاری کی ہے اسی طرح انھوں نے بھی اپنی شاعری میں گل کاری سے کام لیا ہے، گوکہ کم ہو۔ انھوں نے ہر جگہ کم و بیش شادابی فکر و فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

'خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے' کے پیش نظر یہ بات کہی جارہی ہے کہ آج اگر اردو دنیا پر نظر ڈالی جائے اور دیانت داری سے کام لیا جائے تو یہ صاف نظر آئے گا کہ کہیں تو اردو والوں نے محبت کا مظاہرہ کیا ہے اور کہیں نفرت کا۔ یعنی ادب کی تشریح اپنے من موافق کی ہے۔ مشہور ناقد ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک مقام پر صحیح ہی لکھا ہے کہ ہماری عام عادت ہے کہ جس شاعر کے بارے میں کچھ لکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس سے ایسی محبت کرنے لگتے ہیں کہ اس کی تعریف میں مبالغہ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اس کو سب سے بڑا شاعر قرار دیتے ہیں۔ یہ درست کہ خواہ مخواہ کیڑے نکالنے کی عادت اچھی نہیں، مگر اعزاز بلا استحقاق بھی تو مناسب نہیں۔

ان کی رتبہ شناسی کے معاملے میں اہل نقد و نظر کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ وہ اپنے مجموعی کارنامے کے لحاظ سے نہ صرف اہم شاعر ہیں بلکہ دانشور اور نقاد بھی۔

غرض کہ پروفیسر شاداب رضی کی علمی و ادبی خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔ ان کے ادبی کارنامے پر تحقیق ناگزیر ہے یہ بھی حقیقت ہے کہ بکھرے ہوئے ان کے ادبی کارنامے عدم اشاعت کی وجہ سے انھیں شہرت نہ دلا سکے جس کے وہ مستحق تھے۔ ان کی شاعرانہ بصیرت کو عام کرنے، اور ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کو اجاگر کرنے اور ان کی تحقیقی و تنقیدی نگارشات سے نئی نسل کو روشناس کرانے کے لیے کتابی اشاعت ناگزیر ہے۔ تاکہ ان کو جائز حق مل سکے اور ان کا ادبی تعین طے ہو سکے مزید برآں نئی نسل اس سے استفادہ کر سکے۔ مختصر یہ کہ ادبی دنیا پروفیسر شاداب رضی کی ادبی کاوشوں کو کبھی نہیں بھلا پائے گی اور اردو دنیا ان کو ہمیشہ ایک بلند پایہ شاعر، بالغ نظر محقق، با اثر اور ایماندار استاذ کی شکل میں یاد رکھے گی۔

■

Dr. Abdul Basit Hameedi
Head Dept of Urdu
Patna Womens College
Patna- 800001 (Bihar)

ثمر جہاں

تنویر احمد علوی کی ادبی جہتیں

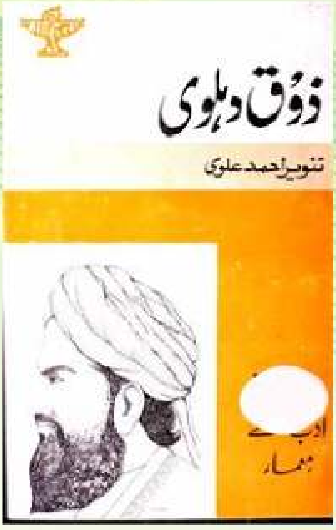

اردو ادب کے اہم محققین، تنقید نگاروں اور دانشوروں میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی (1923-2013) کی شخصیت ہمہ جہت ہے آپ وسیع المطالعہ ذہن کے مالک ہونے کے ساتھ ایک مشفق استاد بھی تھے جو ہمہ وقت ادب کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔ فارسی، عربی، ہندی، پنجابی، سنسکرت اور دیگر قدیم زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ طب یونانی میں گولڈ میڈل حاصل کرنے کے بعد ادب کے کوچے میں قدم رکھا۔

بحیثیت شاعر ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ 19 برس کی عمر میں پہلی نظم کہی' اور ادب کو اوڑھنا بچھونا بنانے کے لیے تحقیق کی راہ میں قدم بڑھایا اور تا زندگی اس راہ پر گامزن رہے۔ آپ کی تحقیقی فکر کا دائرہ بے حد وسیع ہے اور ادب کی مختلف جہتوں کو روشن کرتا ہے۔ بالخصوص تاریخ وتہذیب، تصوف اور مذہبی مطالعے سے آپ کو تا زندگی دلچسپی رہی اسی لیے کبھی بھی کسی ادبی نظریے کے پابند نہیں ہوئے۔ بلکہ معروضی نقطہ نظر سے ادب کا مطالعہ کیا اور پچاس کے قریب تصنیفات تخلیق کیں، جن میں سے بیشتر ابھی اشاعت کی منزل سے نہیں گزری ہیں۔ آپ کی ہر تصنیف ادب میں سنگ میل کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

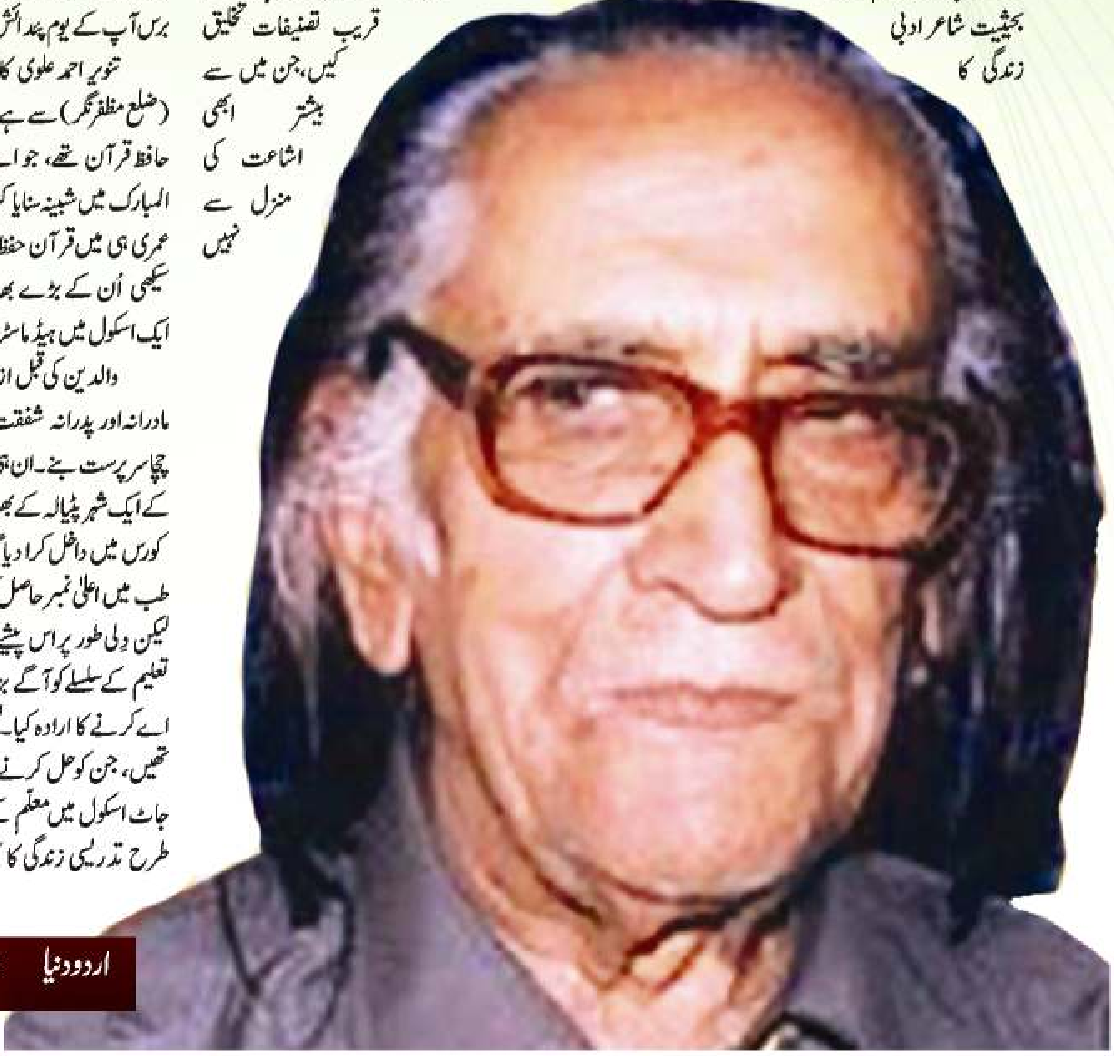

آپ کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔لیکن سرکاری دستاویز، پاسپورٹ اور بینک اکاؤنٹ کی کاپی، پین کارڈ (جو راقم الحروف کو علوی صاحب کے بڑے بیٹے ڈاکٹر نوید اقبال علوی کے توسط سے حاصل ہوا ہے) سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کا یوم پیدائش 16 جولائی 1923 ہے۔ اس مناسبت سے اس برس آپ کے یوم پیدائش کو 100 برس مکمل ہوگئے ہیں۔

تنویر احمد علوی کا تعلق محلہ زیر انصاریان کیرانہ (ضلع مظفرنگر) سے ہے۔ اُن کے والد پیشے سے حکیم اور حافظ قرآن تھے، جو اپنے علاقے کی مسجد میں رمضان المبارک میں شبینہ سنایا کرتے تھے۔تنویر احمد علوی نے کم عمری ہی میں قرآن حفظ کیا اور دیو بند سے فارسی زبان سیکھی اُن کے بڑے بھائی توصیف احمد علوی کیرانہ کے ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔

والدین کی قبل از وقت وفات سے دونوں بھائی مادرانہ اور پدرانہ شفقت سے محروم ہوگئے۔ان کے بعد چچا سرپرست بنے۔ان ہی کے مشورے سے انھیں پنجاب کے ایک شہر پٹیالہ کے بھوپندر طبیہ کالج میں فن طب کے کورس میں داخل کرا دیا گیا۔ تین برس میں آپ نے فن طب میں اعلیٰ نمبر حاصل کر کے خاندان کا نام روشن کیا۔ لیکن دِلی طور پر اس پیشے سے وابستہ نہ ہو پائے اور مزید تعلیم کے سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے بی اے اور ایم اے کرنے کا ارادہ کیا۔لیکن مالی مشکلات راہ میں حائل تھیں، جن کو حل کرنے کے لیے آسارا کے ایک مسلم جاٹ اسکول میں معلّم کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ اس طرح تدریسی زندگی کا آغاز 1945 میں ہوا اور گزرتے

وقت کے ساتھ علمی ڈگری کے حصول کے لیے بھی سخت کوشش وکاوشیں کیں۔ 1947 کا سخت ترین دور بھی آیا، نوکری اور پڑھائی کو قائم رکھنا بھی مشکل رہا لیکن وہ مشکلوں کا سامنا کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔اپنی موجودہ نوکری سے خوش نہیں تھے۔اس لیے 1956 میں پی ایچ ڈی کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔جہاں عزیر صاحب ریسرچ سپروائزر مقرر ہوئے۔

'ذوق،سوانح اور انتقاد' آپ کے مقالے کا موضوع قرار پایا۔ اس وقت تک ذوق کا کوئی مربوط اور مستند دیوان موجود نہ تھا۔ فارسی تذکروں میں ذوق کے ادبی مرتبے کے حوالے سے ذکر ضرور تھا۔لیکن کسی مستند علمی تصنیفی کام کی کمی تھی،جس کے لیے سخت ریاضت اور علمی ذوق کی ضرورت تھی۔یہ اعلا صفات علوی صاحب میں موجود تھیں۔دو برس کی قلیل مدت میں تحقیقی مقالہ مکمل کیا جس کے لیے انتہائی تنگ دستی کی حالت میں لاہور کا سفر بھی کیا اور ذوق کی ذاتی زندگی اور شاعرانہ کلام کے بنیادی ماٰخذ کو یکجا کیا۔لاہور کا یہ سفرنامہ سہارنپور کے ایک جریدے 'بے باک' کو لکھ بھیجا۔جو 1959 کے زمانے میں قسط وار شائع ہوا۔

یہ مقالہ تنویر احمد علوی صاحب کے ادبی سفر میں خشت اول کی حیثیت رکھتا ہے،جس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل ہوئی،جس میں ذوق کی سوانح،شخصیت پر تذکروں،اخبارات ودیگر معاصر شعرا کے حوالے سے مکمل روشنی ڈالی گئی ہے۔اور ذوق بحیثیت غزل گو اور بحیثیت قصیدہ گو کے حوالے سے سیر حاصل بحث کرتے ہوئے ذوق کی زبان وادب کے حوالے سے ادبی خدمات،ذوق کے اثرات بعد کے شعرا (منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، داغ دہلوی، عزیز لکھنوی اور جلال لکھنوی اور مولانا محمد حسین آزاد) کا بھی تفصیلی بیان کیا گیا ہے۔تنویر احمد علوی ذوق پر قلم اٹھانے کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں

''ذوق کو ہمارے نئے نقاد بالعموم اس لیے بھی پسند نہیں کرتے ہیں کہ ان کی غزل گوئی میں ایک خارجی انداز ملتا ہے، جس سے بیزاری کے جذبات آج بہت اہم ہیں۔لیکن یہ خارجی انداز بیان ان ہی کے یہاں نہیں دوسروں کے یہاں بھی ہیں۔اور وہ خود شعرا بھی اس سے بچ نہیں سکتے۔جن کی توجہ 'لفظ' سے زیادہ معنی کی طرف رہی۔'' (مقدمہ ذوق سوانح اور انتقاد)

تنویر احمد علوی کا ذوق کے حوالے سے یہ مستند کام ان کی پہچان بن گیا۔ جسے مجلس ترقی اردو ادب نے شائع کیا۔ جو اس وقت ایک بڑے اعزاز کی بات تھی۔ ذوق کے کام کے دوران ہی علوی صاحب نے تہیہ کرلیا تھا کہ ذوق کے کلیات کے لیے الگ سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔اسی بنیاد پر انھوں نے کلیات ذوق کی تدوین کی جس کی اشاعت بھی مجلس ترقی ادب سے 1967 میں عمل میں آئی۔کچھ وقت بعد کلیات ذوق کو آپ نے ڈی لٹ کی ڈگری کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو جمع کیا اور 20 فروری 1971 کو آپ شعبہ اردو علی گڑھ یونیورسٹی کے ڈی لٹ اسکالر کی ڈگری سے سرفراز ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ ذوق کی زندگی میں ان کا کوئی مربوط دیوان مرتب نہ ہوسکا تھا۔ان کی وفات کے بعد مولوی محمد حسین آزاد اور شیخ اسماعیل،ذوق کا کلام مرتب کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔کہ اچانک غدر ہوگیا۔جس نے دہلی کے زمین وآسمان کو درہم برہم کردیا، مولوی محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر شہید کردیے گئے۔ اور آزاد دہلی سے نکل جانے پر مجبور ہوئے۔ اس وقت ذوق کا جو کلام ان کے پاس تھا اسے متاع عزیز کی طرح

> **تنویر احمد علوی نے غالب کے فارسی خطوط 'پنج آہنگ' کا اردو 'اوراق معانی' کے نام سے پیش کیا ہے۔ اوراق معانی میں غالب کے فارسی خطوط کے اسلوب بیان کی دلکشی قاری کی دلچسپی کو اور بڑھاتی ہے۔**

سے سینے سے لگایا اور 22 افراد خاندان کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔ آزاد دیوان ذوق کو اپنی زندگی میں مرتب کرنا چاہتے تھے لیکن جب اس جانب مائل ہوئے اس وقت ان کی دماغی حالت درست نہ رہی تھی۔تنویر احمد علوی نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

''یہ سوچنا صحیح نہ ہوگا کہ مولانا کے اختلال ذہنی کی اس کیفیت سے پہلے کلیات ذوق کی ترتیب کا کام پورا ہوچکا تھا۔چوں کہ اس رپورٹ میں جوان کی پینشن کے کاغذات کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔ان کے علمی وادبی کارناموں کا ذکر بھی موجود ہے جس میں وہ تصانیف بھی ہیں جو ہنوز زیر تکمیل ہیں۔ان میں دیوان ذوق کا کوئی ذکر موجود نہیں۔''

(کلیات ذوق، ناشر مجلس ترقی ادب لاہور سال اشاعت 1967 ص 57)

تصوف کی تاریخ کے حوالے سے بھی تنویر احمد علوی کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔آپ نے 'صحائف المعرفت' (فارسی)،صوفی بزرگ شاہ عبد الرزاق کی سوانح 'صحیفۂ ابرار (فارسی) (1973) شاہ عبدالرزاق کے تصرفات اور ان کے ملفوظات' مکتوباتِ عالیہ (فارسی)' 1984 شاہ عبد الرزاق کا اردو میں ترجمہ پیش کیا۔یہ تراجم کتب ادارہ مطبوعات نور محمدیہ جھنجھانہ سے شائع ہوئی ہیں۔

معروف صوفی شاعر سنت درشن سنگھ جی کے چار اردو شعری مجموعوں (متاع نور، منزل نور، تلاش نور، جادہ نور) کا تجزیاتی مطالعہ نشانات نور ہے جو تنویر احمد علوی کی تخلیق ہے اور 1996 میں لکھی گئی لیکن کسی سبب منظر عام پر نہ آسکی۔علوی صاحب کے بڑے بیٹے ڈاکٹر نوید اقبال علوی کی معرفت سے راقم الحروف کو اس کتاب کا مسودہ ملا۔جو 2022 کو اشاعت پذیر ہوا۔اس تصنیف کے حوالے سے تنویر احمد علوی کے صوفیانہ خیالات اور مذہبی افکار کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔جن کی ہمہ رنگی انھیں درشن سنگھ جی کی شاعری میں نظر آئی اور انھوں نے درشن سنگھ کی شعری تخلیقات کو اپنی فکری جہت سے اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔

ادبی تحقیق کے حوالے سے آپ کی مستند کتاب 'اصول تحقیق وترتیب متن (1978)' تحقیق کے طلبا کے لیے مشعل راہ ہے۔جسے دہلی یونیورسٹی اور گرونانک یونیورسٹی نے نصاب میں شامل کیا ہے۔اس کے علاوہ اس کتاب کے لاہور (پاکستان) اور ہندوستان میں بھی متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

تنویر احمد علوی نے غالب کے فارسی خطوط 'پنج آہنگ' کا اردو 'اوراق معانی' کے نام سے پیش کیا ہے۔ اوراق معانی میں غالب کے فارسی خطوط کے اسلوب بیان کی دلکشی قاری کی دلچسپی کو اور بڑھاتی ہے۔تنویر احمد علوی ان خطوط کے ترجمے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فارسی الفاظ نے ان کی تخلیقی حسیت اور بے مثال ادبی صلاحیت کے ساتھ مل کر ان خطوط میں جو ایک جہان رنگ وبو پیدا کیا اور سرمایہ، آرائش گفتار بہم پہنچایا اس کو اردو میں منتقل کرنا یوں بھی ایک مشکل کام ہے۔لیکن ان خطوط کے اپنے بحر دلکشی نے مجھے اس پر مجبور کیا۔کہ میں ان کا اردو میں ترجمہ کروں اور اس کے وسیلے سے دوسرے اہل ادب ارباب ذوق اور غالب کے مطالعے سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے اپنی نارسائی کے باوصف رسائی کی صورت پیدا کروں۔''

(پیش لفظ 'اوراق معانی، ناشر اردو اکادمی، دہلی سنہ اشاعت 1992)

ان خطوط کے تراجم کے ذریعے تنویر علوی نے نہ

صرف غالب کی سوانح کے بہت سے مخفی گوشوں تک رسائی حاصل کی بلکہ غالب اکیڈمی کی فرمائش پر انھوں نے ان خطوط کی روشنی میں غالب کی سوانح عمری باضابطہ کتاب کی صورت میں مرتب کردی ہے۔اس کتاب کہ وجہ تحریک پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حیرت اس پر ہوتی ہے کہ پنج آہنگ میں شامل غالب کے خطوط جوان کی زندگی میں ہی چھپ کر سامنے آچکے تھے۔خود یادگار غالب میں ان سے کوئی مصرف نہیں لیا گیا۔نامہ ہائے فارسی کی طباعت پر بھی ایک ثلث صدی کے قریب مدت بیت رہی ہے۔مگر اس کی مثالیں شاذونادر ہی ملتی ہیں کہ غالب کی سوانح اور سیرت کے مطالعہ میں ان سے کوئی خاص استفادہ کیا گیا ہو۔

غالب کے سوانح نگاروں میں غلام رسول مہر نے غالب کے فارسی خطوط سے کافی وشافی طور پر استفادہ کیا۔مگر ان کے یہاں غالب کے سوانحی مسائل پر تاریخی سلسلہ سے گفتگو نہیں آئی۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے 'غالب کی کہانی خود ان کی اپنی زبانی' ایک مختصر کتابچہ کی صورت میں پیش کردی جو سوانح غالب کے سلسلے میں ایک لائق توجہ اور لائق تحسین کام ہے۔اب تک غالب کی جو اہم سوانح عمریاں شائع ہوئی ہیں ان میں یادگار غالب' حیات غالب' اور غالب نامہ شامل ہیں۔''

(دیباچہ غالب کی سوانح عمری خطوط غالب کی روشنی میں)

کلیات شاہ نصیر، کی تدوین کے لیے تنویر احمد علوی نے حیدرآباد دکن کا سفر کیا۔جہاں دیوان نصیر کے دو قلمی مختصر انتخاب کو پیش نظر رکھا۔''نسخہ آصفیہ سب سے قدیم نسخہ ہے جو آصفیہ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے۔اس کے علاوہ نسخہ ادارہ ادبیات، نسخہ پٹیالہ، نسخہ رام پور تھا۔(انتخاب کلیات شاہ نصیر جو 1294ھ میں شائع ہوا تھا)۔تذکروں میں تذکرہ ہندی، تذکرہ مجمع الانتخاب، مجموعہ نغز، عمدہ منتخبہ، عیارالشعرا تذکرہ جگر، ریاض الفصحا، دستورالفصاحت، تذکرہ، گلشن بے خار، طبقات شعرائے ہند، انتخاب داووین، گلدستہ نازنیناں، گلستاں بے خزاں، آثارالصنادید، چمن بے نظیر، گلستان سخن، گلشن ہمیشہ بہار، سخن شعرا، خزینہ العلوم، بزم سخن اور آب حیات کا بغور مطالعہ کیا۔اور ان ہی تذکرات کی بنیاد پر، کلیات شاہ نصیر کی تدوین کے کام کو انجام دیا۔جسے مجلس ترقی ادب لاہور نے چار جلدوں میں شائع کیا۔

ذوق اور غالب کے معاصرین میں ایک اہم فارسی داں امام بخش صہبائی تھے۔دلی میں چیلے کے کوچوں میں رہتے تھے۔فارسی زبان پر گہری دسترس رکھتے تھے۔مرزا

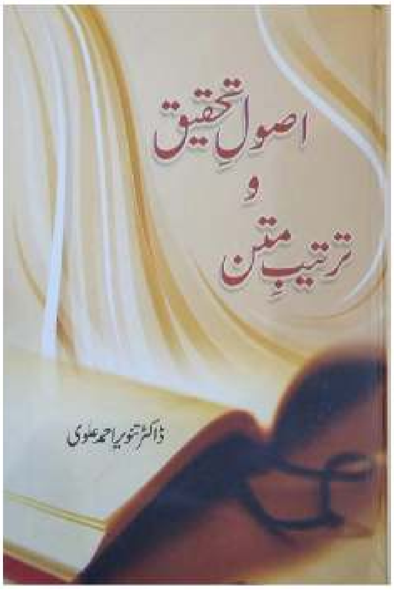

(اسداللہ خاں غالب) انانیت پسندی کے باعث جب دلی کالج کی ملازمت کے لیے راضی نہ ہوئے۔تب یہ ملازمت صہبائی نے قبول کی۔ 1857 کے ہنگامے میں صہبائی اور ان کے اہل خاندان کو شہید کردیا گیا۔صہبائی کا ایک شعری انتخاب 'انتخاب دواوین' ہے۔جو انھوں نے دلی کالج کے پرنسپل بوترو کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ڈیڑھ سو برس قبل دلی کالج کے مطبع سے شائع ہوا تھا۔تنویر احمد علوی کو اس نسخے کی ایک کاپی جامعہ عثمانیہ لائبریری سے حاصل ہوئی۔جو عرصے سے نایاب تھا۔اس اہم نسخے کی اشاعت کے لیے انھوں اہل علم سے مشورہ کیا۔اور 1987 میں دلی یونیورسٹی میں اردوئے معلّٰی سیریز کے تحت اس نسخے کی اشاعت کو منظوری ملی۔اور تنویر احمد علوی کی علمی و تحقیقی نظر کے سبب یہ اہم تصنیف منظر عام پر آئی۔

غالب کی فارسی شاعری کے حوالے سے تنویر احمد علوی کی اہم کتاب 'غالب کی فارسی شاعری تعارف و تنقید' ہے جو غالب کے فارسی، قصائد، فارسی مثنویاں، فارسی تاریخی قطعات، فارسی غزلیات (انتخاب گل رعنا) کا اردو ترجمہ ہے۔بقول تنویر احمد علوی غالب نے اپنے قصائد اور تاریخی قطعات میں اپنی سوانح کے مختلف گوشوں کو بیان کیا ہے، جس سے ان کی زندگی کے کچھ ایسے روشن پہلو سامنے آئے جن پر اب تک ہمارے محققین کی نظر نہیں پہنچی تھی۔اس سلسلے میں ان کا بیان ہے:

''غالب کی فارسی شاعری پر کام نسبتاً کم ہوا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم اور ڈاکٹر وارث کرمانی نے ان کی فارسی غزلیات پر قابل تحسین کام کیا ہے... اب ایسے فارسی جاننے والے کم ہوتے جارہے ہیں جو بے تکلف غالب کے کلام کا مطالعہ کرسکیں۔اور اخذ نتائج ممکن ہو۔اس دشواری نے پچھلی کئی دہائیوں میں ہمیں غالب کے فارسی کلام کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا۔

(دیباچہ غالب کی فارسی شاعری تعارف وتنقید، ناشر غالب اکیڈمی، سال اشاعت 2007)

تنویر علوی صاحب کے ان تحقیقی کاموں کے حوالے سے پروفیسر عبدالحق لکھتے ہیں:

''کسی غالب شناس نے غالب کی سوانح اور کلام کی تدوین پر یکساں کام نہیں کیا۔اور نہ اعتبار حاصل ہوسکا... علوی صاحب کی عبقری نظر دیکھیے۔کہ صرف ذوق ہی نہیں دوسرے معاصر شاہ نصیر پر اتنی ہی توجہ دی' یہی نہیں انھوں نے غالب پر بھی تراجم کے گہر ہائے گراں مایہ پیش کیے۔گویا وہ پورے عہد کے ادب و اسالیب پر اس طرح سے حاوی ہیں جیسے ارض و سما کی خبر رکھنے والا جمشید کا پیالہ جم جسے صورت گر احوال عالم کہا جاتا ہے۔اس دور کی کارشناسی اور کارگزاری کے حال احوال علوی صاحب سے پوچھیے۔''

(ذکر یار مہرباں' ناشر عبدالحق' سال اشاعت 2011 ص 76)

تنویر احمد علوی نہ صرف اردو و فارسی زبان پر عبور رکھتے تھے بلکہ ہندی ادب کا بھی آپ نے گہرائی سے مطالعہ کیا۔بالخصوص کلاسیکی ہندی شعرا کالی داس، سورداس، چندر بردائی، کبیر، جائسی اور دیگر مذہبی رہنماؤں کی شخصیت اور صوفی بزرگوں کی ادبی و علمی خدمات کا آپ نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔بالخصوص تاریخ وتہذیب کی روشنی میں ایک نئے زاویہ فکر سے آپ نے اردو و ہندی ادب میں اضافہ کیا۔

کالی داس کی شہرہ آفاق سنسکرت میں لکھی تصنیف 'میگھ دوت' کے یوں تو ہندی زبان میں کئی تراجم ہوچکے ہیں۔لیکن علوی صاحب نے میگھ دوت کو ہندوستانی تہذیب کے آئینے میں دیکھا جہاں انسانی احساسات و جذبات میں صداقت تھی۔کالی داس کی اس تخلیق کی معنویت کے اظہار کے لیے آپ نے ہندی زبان کا سہارا لیا اور قدیم ہندوستان کے تہذیبی پس منظر کو ہندی لفظوں کی معنویت کے ذریعے 'پریے سندیش' کے نام سے 1984 میں پیش کیا۔

اس کے علاوہ آپ نے اپ بھرنش کے زمانے کی شعری تخلیق سندیش راسک از عبدالرحمان کا اردو ترجمہ پیش کیا۔یہ ترجمہ نوائے ادب، ممبئی کے میگزین میں اکتوبر 1985 میں شائع ہوا ہے۔یہ ایک فراق زدہ عورت کی کہانی ہے جو اپنے شوہر کی تلاش میں اسے ڈھونڈنے نکل پڑتی ہے راستے میں ایک راہ گیر سے اپنے شوہر کا پتہ معلوم کرتی ہے۔اس فراق زدہ عورت کے موسم کے اعتبار سے

احساسات وجذبات ہی اس شعری تخلیق کا محور ہیں۔

ہندوستانی لوک ادب کے فروغ میں بارہ ماسہ (سال کے بارہ مہینے) کے گیت ایک اہم مقام رکھتے ہیں جس میں دیہات کی شادی شدہ عورتیں اپنے شوہر کے دور جانے پر اس کے فراق میں اپنے دلی احساسات وجذبات کا اظہار اپنی سکھیوں سے کرتی ہیں یہ عوامی شعری تخلیق ہے۔ جو ہندوستان کے مختلف قصبات اور دیہات میں گائے جاتے ہیں جس سے قدیم ہندوستان کی تہذیبی و لسانی فضا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اردو میں تنویر احمد علوی نے تیرہ بارہ ماسوں تک رسائی حاصل کی جسے انھوں نے 'بارہ ماسہ روایت اور متن' کے نام سے پیش کیا۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں

''اس روایت کا تنقیدی وتہذیبی مطالعہ اردو میں علاقائی روایتوں کے اثر ونفوذ اور مقامی سطح پر لسانی رشتوں کے تانے بانے کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے جس پر ابھی تک ہماری ادبی تنقید اور لسانیاتی مطالعہ میں توجہ نہیں دی جا سکی۔''

(پیش لفظ، بارہ ماسہ روایت اور متن، ناشر اردو اکادمی، دہلی 1988)

تنویر احمد علوی کا ایک اہم علمی کام ہندی فارسی فرہنگ کی ترتیب ہے۔ جو پانچ ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔ اسے سینٹرل دہلی ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ آر کے پورم نے 1997 میں شائع کیا ہے۔ یہ علوی صاحب کی کئی برسوں کی محنت وکاوش کا ثمرہ ہے۔ اور اہل ادب کی نظروں سے اوجھل ہے۔ ہندی فارسی فرہنگ کے پیش لفظ میں لکھا ہے۔

''پرست ہندی فارسی کوش کا نرمان کندریے ہندی نیدیشالیے کی نئی کوش یوجناؤں کے تحت کیا گیا ہے۔ اس یوجنا کا پرمکھ ادیش بھارت اور پڑوسی دیشوں کے بیچ سدبھاو اور میتری پورن سمبندھوں کو سندر بنانے کے لیے اور وچارک آدان پرداھان کے لیے سانشید دو بھاشا کوش بنانا ہے۔ فارسی بھاشا کے ودوان پروفیسر تنویر احمد علوی نے سمیں سمیں پر نیدیشالیے کو اپنا ساکریے سیوگ دیا۔ نیدیشالیے اس یوگ دان کے لیے ان کا اتینذ ابھاری ہے۔ (دیباچہ۔ ہندی فارسی فرہنگ)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا ایک اہم اور قابل ذکر کام نور اللغات کی اشاعت ثانی کی تصحیح وتدوین کرنا اور اس کا مقدمہ لکھنا ہے۔ نور اللغات اردو کی مستند اور ضخیم لغت ہے۔ اس کی پہلی جلد کے صفحات کی تعداد 781 ہے۔ دوسری جلد کی 641 ہے۔ جلد سوم کی 698 ہے۔ جلد چہارم کی تعداد 1040 ہے۔ یہ چار جلدوں پر مشتمل کام 1998 میں ترقی اردو بیورو (موجودہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) سے منظر عام پر آیا۔

نور اللغات کے پیش لفظ میں تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

''مولینا نور الحسن کاکوری، جو محسن کاکوری کے فرزند ارجمند تھے۔ ان کی یہ محنت اور ہمت قابل داد ہے۔ جس کے ساتھ انھوں نے ان چار ضخیم جلدوں کی تیاری کا ڈول ڈالا اور اپنے محدود مالی اور انسانی وسائل کے ساتھ اب اتنے بڑے کام کو انجام دیا۔ جس کی ترقی اردو بیورو کی طرف سے دوبارہ کتابت، کتابت شدہ اوراق کی تصحیح اور پھر اس پر دوبارہ تبارہ نظر ثانی میں ایک لمبی مدت بیت گئی۔ بنیادی طور پر پرچوں کا کام مجھ ناچیز کے سپرد کیا گیا۔ اس لیے اس میں جو تاخیر ہوئی اس کی ذمے داری راقم الحروف پر ہے۔ دوسرے دوستوں نے اس سلسلے میں جو میری مدد کی ہے۔ اس کے لیے میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔'' (پیش لفظ، نور اللغات، ترقی اردو بیورو 1989)

تنویر احمد علوی کو تاریخ وتہذیب سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے گراں قدر مقالے منظر عام پر آچکے ہیں جو دلی کی قدیم تاریخ وتہذیب کے علاوہ 'ہندوستان اور جنوبی مغربی ایشیا تک کی تاریخ پر مبنی ہے اس سلسلے میں ہندوستان کی تاریخی عمارتوں کے حوالے سے مختصر کتاب 'ہماری تاریخی عمارتیں' 'تاریخ محمودی، دلی کالج کے زمانے میں مجلہ 'شاہجہان آباد نمبر' اور جنوب مغربی ایشیا میں ہمارا تہذیبی سرمایہ' ہے۔ جو مرحوم حکیم عبد الحمید صاحب کے کہنے پر لکھی گئی۔ ہندوستانی تاریخ و تہذیب پر روشنی ڈالتے ہوئے تنویر احمد علوی لکھتے ہیں۔

''ہم جس کو ہندوستانی تہذیب کہتے ہیں۔ یہ صدیوں کی نہیں 'ہزاروں برس کی تمدنی تاریخ اور ثقافتی انداز نظر کا نتیجہ ہے۔ یہ دراوڑ اور آریائی قبیلوں ہی کی تاریخ کی آویزش اور آمیزش کی تاریخ نہیں ہے۔ عرب وعجم ترک وتاتار اور افغان نسلوں سے بھی اس کا گہرا رشتہ ہے۔

کئی اعتبار سے ہم ہندوستان اور ایران کی تاریخ کو ایک دوسرے کے ساتھ گنگا جمنا کے دھاروں کی طرح بہتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اور تروینی میں جس طرح تیسری دھارا سرسوتی آکر مل جاتی ہے اسی طرح عرب اسلامی تہذیب کے سرچشمے کو ہم یہاں گنگا، جمنا، کرشنا اور گوداوری کی سر زمین پر بہتا ہوا پاتے ہیں۔''

(پیش لفظ، جنوب مغربی ایشیا میں ہمارا تہذیبی ورثہ، تنویر احمد علوی سال اشاعت 2000)

تنویر احمد علوی کے دو شعری مجموعے 'لمحوں کی خوشبو' (1988) اور رقص لمحات (1998) منظر عام پر آئے۔ جن میں آزادی سے قبل کے زمانے کی اردو و فارسی نظمیں، غزلیں شامل ہیں، جو انھوں نے 1945 کے زمانے سے لے کر 1997 تک لکھیں۔ ان میں شامل بیشتر نظمیں تاریخی وتہذیبی پس منظر کے ساتھ مختلف شخصیات پر بھی لکھی گئی ہیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ تنویر احمد علوی نے علمی وتحقیقی کاوشوں سے نہ صرف ذوق اور شاہ نصیر کے کلیات کی تحقیق وتدوین کر کے ادب کے سرمائے میں اضافہ کیا۔ بلکہ غالب شناسی کے حوالے سے بھی آپ کی چار مستند کتابیں منظر عام پر آئیں جو غالب شناسی میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے 76 مقالات کو راقم الحروف نے 'تنویر احمد علوی کا جہان معانی' کے عنوان سے دو جلدوں میں یکجا کیا ہے اور تیسری جلد اشاعت کی منزل میں ہے۔ تصوف اور تاریخ وتہذیب کے حوالے سے بھی آپ کی گراں قدر کتابیں بیش بہا سرمایہ ہیں۔ اپنے 70 برس کے ادبی سفر میں آپ نے کئی نسلوں کی ذہنی آبیاری کی۔ اور درجنوں شاگردوں نے آپ کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی۔ تازندگی شہرت دوام کی پروا کیے بغیر آپ نے ادب کی بے لوث خدمت کی۔ آپ کی علمی خدمات کا وہ اعتراف نہیں کیا گیا جس سے آپ کی ہمہ جہت شخصیت کے علمی پہلو روشن ہو سکے۔ آپ کی ہر تصنیف ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو آپ کے تخلیقی ذہن اور برسہا برس کے مطالعہ فکر کا نتیجہ ہے۔ آپ کی ادبی خدمات ادب میں کوہ نور کی سی ہے۔ جس کی آب وتاب سے عہد حاضر اور آنے والے زمانے کے بھی اہل علم مستفید ہوتے رہیں گے۔

کتابیات

1. ذوق سوانح اور انتقاد، انجمن ترقی اردو لاہور، 1963
2. دیوان ذوق، ترقی اردو بیورو، 1980
3. اوراق معانی، اردو اکادمی، دہلی، 1992
4. غالب کی فارسی شاعری تعارف وتنقید، غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین، دہلی، 2007
5. کلیات شاہ نصیر، مجلس ترقی ادب لاہور، 1971
6. ذکر یار مہرباں، عبد الحق، 2011
7. غالب کے خطوط، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، 2004
8. خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح، عمری، غالب اکیڈمی، حضرت نظام الدین اولیاء، 2004
9. ذوق دہلوی (مونوگراف)، ساہتیہ اکادمی دہلی، 1992
10. انتخاب دواوین، دہلی یونیورسٹی، 1987
11. انتخاب ذوق، مکتبہ جامعہ، 2011

Dr. Samar Jahan
House No: 2051 Kucha Chelan
Dariya Ganj
New Delhi- 110006

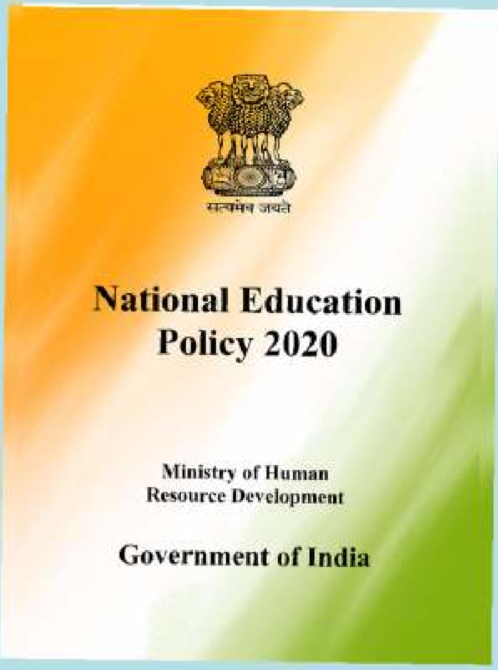

شفاعت احمد

نئی قومی تعلیمی پالیسی کا متوقع سماجی کردار

انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں تعلیم کی غیر معمولی اہمیت ہے اور جغرافیائی و قومی تفریقوں سے پرے تمام دنیا میں تعلیم کو انسان کی مادی، ذہنی و تہذیبی ترقی کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے وطن عزیز میں بھی تعلیم و تعلم کی ہزاروں سالہ قدیم روایت رہی ہے، سیکھنے سکھانے کا ایک مستحکم نظام ہمیشہ سے ہمارے یہاں پایا جاتا ہے۔ گرو یعنی استاد کے احترام اور عزت کا جو کلچر ہمارے ملک میں پایا جاتا ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ استاد شاگردوں اور طالب علموں کو صرف پڑھاتا نہیں بلکہ وہ طلبا کی شکل میں پوری قوم کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے اور قوم کا مستقبل بناتا ہے۔ اس طرح تعلیم ہمارے یہاں محض ایک پروفیشن نہیں ہے بلکہ یہ مقصد زندگی اور اعلیٰ نصب العین کا حامل ایک فریضہ ہے۔ جس کے اثرات کا دائرہ انسان کی پروفیشنل زندگی سے لے کر اس کے روزمرہ اعمال واخلاق اور اطوار و کردار تک وسیع ہے۔

جب ہندوستان انگریزوں سے آزاد ہوا تو کئی شعبوں میں ہمیں بہت گمبھیر چیلنجز کا سامنا تھا، ان میں سے ایک اہم شعبہ تعلیم کا تھا، کیونکہ آزادی اور بٹوارے کے بعد ملک میں جو بہت بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہوئی اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ سرحد کے اس پار سے یہاں آئے اور یہاں سے سرحد کے اس پار گئے، اس کی وجہ سے نہ صرف ہندوستانی آبادی کی نوعیت و کیفیت میں بدلاؤ واقع ہوا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ملک کی مجموعی ثقافتی، سماجی، معاشی و تعلیمی صورت حال میں بھی بڑی تبدیلی واقع ہوئی، انگریزی دور حکومت میں یوں بھی ہندوستان میں خواندگی کی شرح بہت معمولی تھی اور محض 21 فیصد ہندوستانی تعلیم یافتہ تھے۔ ایسے میں ملک کے معماروں کے سامنے دوسرے شعبوں کے ساتھ تعلیم کی صورت حال کو بہتر کرنے کا بہت اہم مسئلہ درپیش تھا۔ جس کے لیے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے بڑی غیر معمولی اور اہم کوششیں کیں، ان کی سربراہی میں کئی نہایت کارگر تعلیمی منصوبوں پر کام کیا گیا اور متعدد اہم ادارے قائم کیے گئے۔ اس کے بعد کوٹھاری کمیشن کی سفارشات اور رپورٹ کے نتیجے میں 1968 میں پہلی تعلیمی پالیسی تیار کی گئی، جبکہ دوسری تعلیمی پالیسی کی تیاری 1986 میں عمل میں آئی اور 1992 میں اسے پھر سے اپڈیٹ کیا گیا۔ ان دونوں تعلیمی پالیسیوں کا ہدف یہ تھا کہ ملک کے تمام بچوں کے لیے تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے اور مختلف سماجی طبقات کے مابین خصوصاً حصول تعلیم کے حق کے سلسلے میں برابری اور مساوات کو یقینی بنایا جائے۔ یہ پالیسیاں نگراں ڈھانچے اور نظام کے قیام، اس کی عوام تک رسائی، تعلیم و تعلم کو معیاری بنانے اور بلاتفریق تمام شہریوں تک تعلیم کو پہنچانے میں کامیاب رہیں۔ رفتہ رفتہ شعبۂ تعلیم میں ترقی ہوتی رہی اور ساتھ ہی مختلف چیلنجز بھی سامنے آتے رہے۔ پھر صورت حال ایسی ہوگئی کہ تعلیم کو اعلیٰ گریڈ اور امتیازی پوزیشن کے حصول تک محدود کیا جانے لگا، تاکہ روزگار کے حصول میں زیادہ سے زیادہ معاون ثابت ہو، تعلیم کا مطلب محض یہ ہوگیا کہ خوب جانکاریاں حاصل کی جائیں اور ان جانکاریوں کو سماج میں نافذ کرنے یا انھیں عملی طور پر برتنے کی اہمیت کم ہوتی گئی۔

حالانکہ علم اور تعلیم کا سماج سے ایک گہرا ربط ہے۔ چوں کہ طلبا کا تعلق سماج سے ہی ہوتا ہے، چاہے وہ ابتدائی سطح کے طلبا ہوں یا اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے ہوں، اس لیے فطری طور پر تعلیم اور سماج کے درمیان ایک گہرا ربط پیدا ہوجاتا ہے، جسے مضبوط رکھنا ضروری ہے۔

سماج اور تعلیمی اداروں کے تعلق کی ایک دوسری نوعیت بھی ہے، جس کا تعلق تعلیمی اداروں کے قیام، اس کی ظاہری تعمیر و تشکیل، اس کے انفراسٹرکچر اور دیگر تعلیمی و تعمیری وسائل سے ہے۔ اس لیے کہ یہ ادارے سماج کے تعاون سے ہی قائم ہوتے ہیں، چاہے سرکاری تعلیمی ادارے ہوں یا نجی اسکول اور تعلیمی ادارے ہوں۔ تعلیم کی افادیت کا سارا دار و مدار بھی سماج سے ہی جڑا ہوا ہے، کیونکہ اس کے اثرات سماج پر ہی مرتب ہوتے ہیں۔ اگر تعلیم اچھی، مفید اور کارگر ہے تو اس کا خوشگوار اثر سماج کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہوتا ہے اور مجموعی طور پر معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے، جبکہ اگر تعلیم یا تعلیمی نظام میں نقص ہے تو اس کا منفی اثر بھی سماج کو ہی جھیلنا پڑتا ہے، جس کے نتیجے میں معاشرے کی ترقی کی رفتار دھیمی ہو جاتی ہے اور معاشرے کے افراد مختلف قسم کی اخلاقی و سماجی برائیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے سماج اور تعلیم دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا، البتہ دونوں میں مضبوط ربط اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب سماج اپنے منصوبوں اور خدمات کے ذریعے تعلیمی سرگرمیوں اور اداروں کو اپنائے، انھیں بہتری کی طرف گامزن کرنے میں حصہ لے اور ان کے نظام میں پختگی پیدا کرنے کی کوشش کرے، اس کے نتیجے میں خود معاشرہ بااختیار بنے گا اور ہر شعبے میں اس کی کارکردگی پہلے سے بہتر ہوتی جائے گی۔ سماج کو چاہیے کہ اسکولوں کی تعمیر و ترقی اور نگراں کمیٹیوں میں حصہ لے کر ان کی افادیت کو یقینی بنائے اور مختلف سطح کے تعلیمی ادارے رضاکارانہ کوششوں کے ذریعے سماج کے ساتھ مل کر کام کریں۔

یہی وجہ ہے کہ قومی تعلیمی پالیسی 2020 کی سفارشات وتجاویز تعلیم میں سماج کی حصے داری کو تعلیم کا ایک داخلی اور ضروری عنصر بتاتی ہیں۔ یہ سفارشات ادارہ جاتی سطح پر سماج کی حصے داری کو بڑھانے کے زیادہ مواقع فراہم کرتی ہیں اور تعلیمی اداروں کو پہلے سے زیادہ لچک دار، خود مختار اور طاقت ور بناتی ہیں۔ لچک اور خود مختاری کے حامل ادارے معاشرے کے ساتھ باہمی ربط پیدا کرنے کے مقصد سے مختلف پروگراموں کو ڈیزائن اور تیار کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ 2020 کی تعلیمی پالیسی کے تمام پہلو ہمیں اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ ان کے پس منظر میں سماجی انصاف اور سماجی تبدیلی کا ہدف کارفرما ہے اور تعلیم اسے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ نئی قومی تعلیمی پالیسی میں تعلیم میں سماجی کردار کو واضح اور ضمنی دونوں طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے جو واضح ہیں، ان میں آنگن واڑیوں کو شعبہ تعلیم کے دائرے میں لانا، مختلف سطح کی مہارتوں کو تعلیم سے مربوط کرنا، تعلیم کو جامع اور کثیر شعبہ جاتی بنانا، تجربات کے ذریعے سیکھنے پر توجہ مرکوز کرنا، خود مختاری کی فضا پیدا کرنا، نتیجہ خیز تحقیق پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے تعلیم کے مرکزی موضوع سے مقامی مہارتوں کو مربوط کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

قومی تعلیمی پالیسی ایک عوامی تعلیمی نظام کا تصور پیش کرتی ہے، جس میں لوگوں کی انفرادی و اجتماعی شمولیت ہو۔ سماج اسکول ایجوکیشن کا ایک لازمی حصہ ہے اور اس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ایسے شواہد موجود ہیں کہ گاؤں کے اسکول اسی وقت مؤثر طریقے سے کام کرتے ہیں، جب مقامی کمیونٹی فعال ہو اور اسکولوں کے کاموں میں حصہ لیتی ہو۔ شروعاتی بچپن کی دیکھ بھال اور تعلیم کے بارے میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں کہا گیا ہے کہ آنگن واڑی مکمل طور پر ایک دوسرے سے مربوط اور گروپ بند ہوں گے اور بچوں کے والدین اور اساتذہ کو اسکول کے پروگراموں میں شرکت کے لیے مدعو کیا جائے گا۔ گزشتہ سالوں میں آنگن واڑیوں نے ماں اور بچے کے تغذیے پر بھی توجہ مرکوز کی ہے، ان کا تعلیم کے ساتھ ارتباط والدین کی مدد کرنے اور ضروری تغذیے اور صحت کی دیکھ بھال کے ساتھ سماج کو ابتدائی تعلیم فراہم کرنے کے لائق بناتا ہے۔

کلسٹر اسکولوں کا نظریہ اسکولوں کی تعمیر اور سیکھنے کو بڑھانے میں سماج کے کردار کو سامنے لاتا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کی سفارش کے مطابق ایک اسکول کمپلیکس پڑوسی اسکولوں کا ایک گروپ بنائے گا۔ اس سے مختلف اسکولوں کے اساتذہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور سیکھنے و جسمانی وسائل کی مناسب تقسیم کے علاوہ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اسکول کمپلیکس کے آس پاس مختلف سماجی طبقات موجود ہوں گے۔ جو اسکول کلسٹرز کے نظم و نسق اور انتظام کا خیال رکھ سکتے ہیں۔

اس پالیسی میں غیر سرکاری سماجی تنظیموں کی اسکولوں کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے کے لیے حوصلہ افزائی کی گئی ہے، کیونکہ اسکولوں کے نظم و نسق اور ترقی میں سماجی حصے داری والے اسکول مفید نتائج کے حصول میں زیادہ کارگر ثابت ہوسکتے ہیں۔ اسکول کی ترقی میں سماج کی شرکت کارکردگی اور نتائج کے حوالے سے اسکول کی بہتری میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ تعلیمی پالیسی سیکھنے کو مزید مؤثر بنانے اور بنیادی خواندگی کے حصول میں سماج، سابق طلبا اور رضاکاروں کی شرکت کی سفارش کرتی ہے۔ اسکول کے بنیادی ڈھانچے کی غیر استعمال شدہ صلاحیت کو استعمال کرنے اور کمیونٹی کے لیے سماجی، فکری اور رضاکارانہ سرگرمیوں کو فروغ دینے کے مقصد سے یہ تعلیمی پالیسی 'سماجک چیتنا کیندر' کے قیام کی تجویز پیش کرتی ہے، جو خارجی اوقات میں سماجی ہم آہنگی کو فروغ دے سکتا ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی ایک عوامی تعلیمی نظام کا تصور پیش کرتی ہے، جس میں لوگوں کی انفرادی و اجتماعی شمولیت ہو۔ سماج اسکول ایجوکیشن کا ایک لازمی حصہ ہے اور اس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ایسے شواہد موجود ہیں کہ گاؤں کے اسکول اسی وقت مؤثر طریقے سے کام کرتے ہیں، جب مقامی کمیونٹی فعال ہو اور اسکولوں کے کاموں میں حصہ لیتی ہو۔شروعاتی بچپن کی دیکھ بھال اور تعلیم کے بارے میںقومی تعلیمی پالیسی 2020 میں کہا گیا ہے کہ آنگن واڑی مکمل طور پر ایک دوسرے سے مربوط اور گروپ بند ہوں گے اور بچوں کے والدین اور اساتذہ کو اسکول کے پروگراموں میں شرکت کے لیے مدعو کیا جائے گا۔گزشتہ سالوں میں آنگن واڑیوں نے ماں اور بچے کے تغذیے پر بھی توجہ مرکوز کی ہے، ان کا تعلیم کے ساتھ ارتباط والدین کی مدد کرنے اور ضروری تغذیے اور صحت کی دیکھ بھال کے ساتھ سماج کو ابتدائی تعلیم فراہم کرنے کے لائق بناتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں یہ پالیسی سماجی ذمے داری اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں سماج کی حصے داری کو فروغ دینے والے کئی اہم عناصر پر مشتمل ہے۔ اعلیٰ تعلیم میں سماجی حصے داری نظریاتی تصورات اور ان پر عمل کے درمیان فاصلے کو ختم کرتی ہے۔ تعلیم اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتی، جب تک کہ معاشرے کے حقیقی مسائل کی

نشان دہی اور ان کا حل فراہم نہ کرے۔ یہ صرف اعلیٰ تعلیمی اداروں اور سماجی طبقات کے درمیان گہرے ربط کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ تعلیم اور سماج کے درمیان ایک اہم رشتہ ہے، اس لیے تعلیم کو حقیقی مسائل کا حل تلاش کرنے میں معاشرے میں اپنا مطلوبہ کردار ادا کرنا ہوگا اور اس کے نتیجے میں معاشرے کو نصاب تعلیم کی تشکیل، تعلیم اور تحقیق میں سہولت فراہم کرنے میں اداروں کی مدد کرنی ہوگی۔

نئی تعلیمی پالیسی کی ایک اہم سفارش اعلیٰ تعلیم کو وسیع البنیاد اور جامع بنانا بھی ہے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کو اعلیٰ تعلیم کے کثیر شعبہ جاتی اداروں کی صورت اختیار کرنی ہوگی، جہاں انڈر گریجویٹ اور گریجویٹ پروگرام معیاری تدریس، تحقیق اور سماجی حصے داری کے ساتھ پیش کیا جائے۔ کثیر شعبہ جاتی نقطہ نظر کورسز کو لچک دار اور اختراعی نصاب کے ساتھ معاشرے کی ضروریات سے منسلک کرتا ہے۔ سیکھنے کو وسیع البنیاد بنانے کے لیے کمیونٹی سروس، ماحولیاتی تعلیم اور قدر پر مبنی تعلیم سے متعلق شعبوں میں مختلف کورسز تجویز کیے گئے ہیں اور موسمیاتی تبدیلی، آلودگی، فضلہ کے انتظام، صفائی، حیاتیاتی تنوع کے تحفظ، حیاتیاتی وسائل اور حیاتیاتی تنوع کے انتظام، جنگلات اور جنگلی جانداروں کے تحفظ، پائیدار ترقی اور زندگی کے شعبوں میں مختلف پروجیکٹس کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ قدر پر مبنی تعلیم میں انسانی، اخلاقی، آئینی اور عالم گیر انسانی اقدار کے ساتھ ساتھ زندگی کی مہارتوں کا فروغ، مثلاً خدمت سے متعلق اسباق اور کمیونٹی سروس کے پروگراموں میں شرکت بھی شامل ہے۔ طلبا کو مقامی صنعتوں، کاروباروں، فنکاروں، دستکاری کے ماہر افراد وغیرہ کے ساتھ انٹرن شپ کے مواقع فراہم کیے جائیں گے، ساتھ ہی ساتھ فیکلٹی اور محققین کے ساتھ ان کے اپنے یا دیگر اعلیٰ تعلیمی اداروں کے ساتھ ریسرچ انٹرن شپ کے مواقع فراہم کیے جائیں گے، تاکہ طلبا کھیلوں، ثقافت، ماحولیاتی کلبوں اور کمیونٹی سروس کے پروجیکٹس کے ذریعے سیکھ کر بہتر عملی کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں۔ نئی تعلیمی پالیسی گلوبل سٹیزن شپ ایجوکیشن کے مطابق سیکھنے والوں کو با اختیار بنانے کی بھی سفارش کرتی ہے، تاکہ طلبا عالمی مسائل سے آگاہ اور باخبر رہ سکیں اور زیادہ پرامن، روادار، جامع، محفوظ اور پائیدار سماج کے فروغ میں فعال کردار ادا کر سکیں۔

اس پالیسی کی تجاویز کو لاگو کرنے کی کوشش کے ضمن میں حکومت اور متعلقہ ادارے قومی سطح پر اور متعلقہ ریاستوں کی سطح پر رہنما خطوط تیار کرنے میں مشغول ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) نے خاص طور پر اعلیٰ تعلیمی اداروں میں سماج کی حصے داری کو بڑھانے کے لیے قومی درسیاتی فریم ورک اور رہنما خطوط (2020) بھی تیار کیے ہیں۔ 'اُنت بھارت ابھیان' کے تحت طلبا کو دیہی طبقات سے مربوط کرنے کے لیے کورسز اور نصاب تیار کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ وزارت تعلیم نے مہاتما گاندھی نیشنل کونسل آف رورل ایجوکیشن کو 'سویم' پلیٹ فارم پر 'سماجی ذمے داری اور سماج کی حصے داری کو فروغ دینے' کے عنوان سے بڑے پیمانے پر اوپن آن لائن کورسز تیار کرنے اور چلانے کا کام بھی سونپا ہے۔

سماجی حصے داری کی معنویت و افادیت انتظامیہ، تعلیم، تحقیق اور ادارہ جاتی ترقی میں سماج کو شامل کرنے جیسے تعلیمی اداروں کی ترجیحات پر منحصر ہے۔ اس پالیسی نے اداروں کے لیے معاشرے کا لازمی حصہ بننے، وسائل حاصل کرنے اور پورے سماج کو تعلیم یافتہ بنانے کی راہ ہموار کی ہے۔ یہ تعلیمی پالیسی اس بارے میں پوری وضاحت

نئی تعلیمی پالیسی کی ایک اہم سفارش اعلیٰ تعلیم کو وسیع البنیاد اور جامع بنانا بھی ہے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کو اعلیٰ تعلیم کے کثیر شعبہ جاتی اداروں کی صورت اختیار کرنی ہوگی، جہاں انڈر گریجویٹ اور گریجویٹ پروگرام معیاری تدریس، تحقیق اور سماجی حصے داری کے ساتھ پیش کیا جائے۔ کثیر شعبہ جاتی نقطہ نظر کورسز کو لچک دار اور اختراعی نصاب کے ساتھ معاشرے کی ضروریات سے منسلک کرتا ہے۔

کرتی ہے کہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو سماج کی بہتر حصے داری کے لیے کیا کرنا ہے اور یہ کیوں ضروری ہے۔ اب یہ اداروں کی ذمے داری ہے کہ وہ پالیسی کی طرف سے متعین کردہ ہدایات کے مطابق آگے بڑھیں۔

فی الحال چیلنج یہ ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں سماجی حصے داری کی حقیقی روح پیدا کرنے اور فعال طریقے سے اس کے عمل درآمد کو کیسے آگے بڑھایا جائے۔ وژن، مشن، اہداف اور ادارہ جاتی منصوبوں میں اس کو شامل کرکے سماجی حصے داری کو ادارہ جاتی سطح تک پہنچانا ہوگا۔ درس و تدریس اور تحقیق کے دیگر شعبوں کے ساتھ سماج کی حصے داری کو مربوط کرنے کے لیے ادارہ جاتی میکانزم تیار کرنا ہوگا۔ ساتھ ہی عمل درآمد کے دوران اداروں کی نگرانی کی بھی ضرورت ہے۔ دستیاب رہنمائی، حکومت اور انتظامی اداروں کی جانب سے متوقع رہنما خطوط کی روشنی میں اداروں کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ یہ ہے کہ وہ فعال طریقے سے کام کریں اور اپنی سطح پر سماجی حصے داری کے منصوبے کو عمل درآمد کریں۔ اداروں کے پاس سماجی حصے داری کو یقینی بنانے کے لیے تین آپشن ہیں۔ پہلا: حکومت کی طرف سے ہدایات حاصل کرنا اور ان کے مطابق عمل درآمد کرنا۔ دوم: پالیسیوں کی روح کے مطابق عمل درآمد کی سمت میں کام کرنے کے لیے ٹیم ترتیب دے کر منصوبے بنانا اور کمیونٹی اسٹیک ہولڈرز کو شامل کرکے حکومت اور دیگر متعلقہ اداروں کی ہدایات کے ساتھ یا ان کے بغیر ان پر عمل درآمد کرنا۔ تیسرا: نئی تعلیمی پالیسی سے آگے سوچتے ہوئے سماج کو تعلیمی اداروں سے قریب لانے کے لیے نئے طریقے دریافت کرنا۔ تعلیمی ادارے ہی معاشرے کے اندر باہمی ارتباط پیدا کر سکتے ہیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اداروں کو اسٹیک ہولڈرز کے درمیان یہ احساس پیدا کرنا ہوگا کہ وہ معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں اور معاشرے کو ان اداروں کے قریب لانا ہوگا، تاکہ ان کی ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔

نئی تعلیمی پالیسی تعلیم کے ذریعے سماجی رابطے کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ سرکاری محکموں، اداروں، این جی اوز اور دیگر تنظیموں کا کردار ان اہداف کو حاصل کرنے، ایک مناسب ماحول پیدا کرنے اور افراد کو آپس میں رابطہ قائم کرنے کا موقع فراہم کرنے میں اہم ہے۔ یہ پالیسی سیکھنے کے عمل کے منطقی نتیجے کے حصول پر بھی توجہ مرکوز کرتی ہے، جو صرف معلومات جمع کرنا نہیں ہے، بلکہ معاشرے میں ایک مستحکم علمی و فکری ماحول پیدا کرنا ہے، جو تخیل اور نظریے کے عملی اطلاق کو ممکن بنائے اور معاشرتی ضروریات میں اس کے استعمال کو آسان کرے۔ نئی تعلیمی پالیسی کے پس پشت دراصل معاشرے اور تعلیم کے درمیان پائے جانے والے فاصلے کو ختم کرنے کا نظریہ کارفرما ہے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ تعلیم کو معاشرے اور سماج کا اس طرح حصہ بنا دیا جائے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہو جائیں اور اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ سماج تعلیمی اداروں کی سرگرمیوں میں براہ راست حصہ لے اور تعلیمی ادارے مختلف سطحوں پر سماج کو خود سے جوڑے رکھنے کی کوشش کریں۔ یہ تعلیم کی افادیت کے لیے بھی ضروری ہے اور سماجی ترقی میں بھی اس کا خاصا اہم کردار ہے۔

■

Dr. Shafayat Ahmad
Associate Professor
MANUU, College of Teacher Education,
Darbhanga-846001 (Bihar)

دیوان حنان خان

جاں نثار اختر

حیات وخدمات

جاں نثار اختر 8 فروری 1914 کو گوالیار میں پیدا ہوئے، ان کا آبائی وطن گہوارۂ علم وادب خیرآباد ہے۔ علامہ عبدالحق خیرآبادی، علامہ فضل حق خیرآبادی اور سید احمد حسین خیرآبادی کا تعلق اسی خانوادے سے ہے۔آپ کے والد افتخار حسین مضطر خیرآبادی اس خاندان کی مشہور ادبی شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔خاندانی تعلیم وتعلم پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس گھرانے میں مرد وعورت دونوں میں تعلیم وتعلم کی ایک قدیم روایت رہی ہے۔ دادی سیدالنساء بیگم خود ایک شاعرہ تھیں اور حرماں تخلص کرتی تھیں۔

عام رواج کے مطابق جاں نثار اختر کی ابتدائی تعلیم گوالیار میں ہوئی اور وکٹوریہ ہائی اسکول گوالیار سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔علی گڑھ انٹرمیڈیٹ کالج سے ایف ایس سی اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے بی اے (آنرس اردو) اور ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ دوران تعلیم ہی وکٹوریہ کالج گوالیار میں بطور لکچرر تقرر ہو گیا اس لیے پی ایچ ڈی کی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ 1936 میں ترقی پسند تحریک کا باضابطہ اعلان کیا گیا تو جہاں اس دور کے مشہور شعراء، ادبا اور ارباب ذوق نے اس کے منشور کی حمایت کی وہیں زبان وادب سے وابستہ نوجوان طالب علموں نے بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور عملی طور پر اپنی زندگی میں برتنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جاں نثار اختر ترقی پسند تحریک کے انھیں نوجوان متوالوں کی ایک اہم کڑی ہیں۔

اسرار الحق مجاز، اختر حسین رائے پوری، سبط حسن، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، آل احمد سرور، معین احسن جذبی، علی سردار جعفری اور سعادت حسن منٹو وغیرہ جیسے نامور ترقی پسند ادیبوں سے وابستگی اور ان کی صحبتوں نے ان کے فکری اور فنی میلانات کو زندگی اور شاعری کی راہیں متعین کرنے میں مدد کی۔ اسرار الحق مجاز کی بہن صفیہ سے عقد کے بعد انھیں ایک نئی زندگی ملی۔ دوستوں کے علاوہ ہم عمر اور ہم فکر شریک حیات انسانی زندگی میں کسی نعمت سے کم نہیں۔ صفیہ کی شکل میں جاں نثار کو ایک ہمدرد اور غمگسار بیوی ملی جو ہر وقت دور رہ کر بھی ساتھ رہنے کی کوشش کرتی تھی۔

جاں نثار کے سوانحی حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے، لیکن ملازمت کی زندگی نے دونوں کو ایک دوسرے سے ایک عرصۂ دراز تک دور رکھا۔ اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد قریب ہوتے ہوئے بھی دور رہے۔ جاں نثار اختر جب گوالیار میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے تو صفیہ علی گڑھ میں اسی فرض منصبی سے منسلک تھیں۔ حالانکہ ان دونوں کی خواہش تھی کوئی ایسا موقع مل جائے کہ دونوں علی گڑھ ہی میں ملازمت کرتے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور تقسیم ملک کا ہنگامہ سر پر آ کھڑا ہوا۔ جاں نثار اپنے ایک خط میں صفیہ کو لکھتے ہیں:

... علی گڑھ میں کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی تو بہت امکان ہے کہ یہاں کی ملازمت میں اس حال میں بھی چھوڑ دوں پھر دیکھا جائے گا۔ لشکر اب میرے لیے قطعی ناقابل برداشت ہے، غربت کی آرزو وطن کی محبت پر غالب آ رہی ہے۔ مجھے ذرا سا بھی ذہنی سکون نہیں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ میرا اس طرح ملازمت ترک کر کے نکل کھڑا ہونا عقلمندی کی بات نہ ہوگی لیکن پھر بھی دل کو تنہا چھوڑنے کے سوا کچھ اور بنتا نظر نہیں آتا۔

ستایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے

یہ مصرعہ میں نے غم روزگار کو غم جاناں بنانے کے شوق میں نہیں لکھا ہے۔ بلکہ اس میں بہت کچھ حقیقت بھی ہے صفیہ! میں اب گوالیار نہیں رہ سکتا اور نہیں رہوں گا۔

(خاموش آواز، ص 10)

خط کے اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاں نثار کی خواہش تھی کہ انھیں بھی علی گڑھ ہی میں ملازمت مل جاتی، تو دونوں ایک ساتھ رہتے۔ لیکن تقسیم ملک کی وجہ سے رونما ہونے والے فسادات نے ملکی منظر نامے کو یک سر بدل کر رکھ دیا۔ گوالیار میں فوجی گشت بڑھ گئی اور لوگوں میں خوف وہراس کا ایک ماحول برپا ہوگیا۔ اس لیے جاں نثار گوالیار سے ملازمت ترک کرکے بھوپال چلے گئے۔ چند پس وپیش[1] اور باہمی خط وکتابت کے بعد صفیہ بھی بھوپال چلی گئیں اور دونوں حمیدیہ کالج بھوپال میں درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے۔ اس طرح جاں نثار اختر اور صفیہ کو ایک ساتھ رہنے کا موقع تو میسر آیا۔ لیکن ان دنوں ترقی پسند تحریک سے وابستہ لوگوں پر حکومت کی نگاہ سخت تھی؛ جاں نثار انجمن ترقی پسند مصنّفین بھوپال کے صدر تھے اس لیے حکومت کا زور تھا کہ کوئی بھی سرکاری ملازم ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہ رہے۔ اتنی آسانی ضرور تھی کہ اگر وہ ترقی پسندی سے علاحدگی اختیار کرلے تو وہ ملازمت میں رہ سکتا ہے۔ جاں نثار کو یہ بات قطعی گوارہ نہ تھی کہ وہ اپنے فکر وخیال سے علاحدگی اختیار کریں اس لیے وہ بھوپال سے ممبئی چلے گئے اور سرکاری ملازمت سے دستبردار ہوگئے۔ جاں نثار کے نام صفیہ اختر کے ایک خط کا یہ اقتباس دیکھیں:

شدید انتظار کے بعد خط ملا استعفیٰ میں آج پرنسپل کے پاس نہ پہنچا سکی وہ جا چکا تھا۔ کل صبح لے جاؤں گی۔ تم نے استعفیٰ دے دیا اچھا کیا ایک طویل ذہنی کشمکش کا خاتمہ یونہی ممکن تھا اگر چہ دوری جانب بھوپال کی زندگی کی سہولتیں اور کالج کی ملازمت کشش انگیز تھی۔ میری طبیعت کی کمزوری سمجھو یا کچھ بھی میرے لیے یہ فیصلہ مشکل ہوتا، بہر حال تم نے اپنے عزم کا ثبوت دیا اور سچ جانو میں تمھاری فوقیت کے احساس سے سر جھکا دینے پر تیار ہوں۔ (زیر لب، ص 16-15)

مذکورہ بالا دونوں خطوط[2] کے اقتباسات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جاں نثار اور صفیہ دونوں کی خواہش تھی کی ایک ساتھ رہ کر عام خوش گوار زندگی گزاری جائے اور مل کر زندگی کے خوشگوار مراحل کا تجربہ کیا جائے۔ لیکن مقدر پر کس کا زور ہے، جو ہونا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ ایک بار پھر دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے، جس کی سب بڑی وجہ جاں نثار اختر کی ترقی پسندی کے اصول سے عدم مفاہمت تھی۔ ان کے نزدیک زمانے کا دردان کے ذاتی دوروغم سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ بیوی اور بچوں سے دوری وجدائی کا غم، غریبوں، محتاجوں اور بے کسوں کے آلام ومصائب کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ نظم 'زندگی' کے چند بند دیکھیں جو ان کے فکری اور ذہنی میلان کی وضاحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اشعار دیکھیں۔

تیر افلاس سے کتنوں کے کلیجے ہیں فگار
کتنے سینوں میں ہے گھٹتی ہوئی آہوں کا غبار
کتنے چہرے نظر آتے ہیں تبسم کا مزار
اک نظر بھول کے اس سمت بھی دیکھا ہوتا
کچھ محبت کے سوا اور بھی سوچا ہوتا
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم
رنج غربت کے سوا جبر کے پہلو بھی تو ہیں
جو چھلکتے نہیں آنکھوں سے وہ آنسو بھی تو ہیں
زخم کھائے ہوئے مزدور کے بازو بھی تو ہیں
خاک اور خون میں غلطاں ہیں نظارے کتنے
قلب انساں میں دہکتے ہیں شرارے کتنے
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

(نظم — زندگی، تار گریباں، ص 70)

یقیناً حق کی راہ میں رکاوٹیں اور دشواریاں پیش آتی ہیں جس کی وجہ سے مختلف النوع مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ جاں نثار اختر کی زندگی میں یہ رکاوٹیں بارہا حائل ہوئیں۔ لیکن دوستوں اور ہندوستانی مزاج بیوی صفیہ اختر نے ہر موڑ پر ساتھ دیا۔ شوہر سے اخراجات کا تقاضا کرنے کے بجائے وہ خود جاں نثار کی مالی معاونت کرتی رہیں۔ تاکہ جاں نثار کو ان کی زندگی میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ خط کا ایک اقتباس دیکھیں:

"تمھیں کل ہی پیسہ روانہ کروں گی، تمھیں اس طرف سے واقعتاً سخت تکلف ہوگی، بے تکلف ہر ضرورت اور ہر پریشانی سے مطلع کرتے رہو۔ ہاں عصمت آپا کے یہاں ایک آدھ ماہ گزارا کرلو تو اچھا ہے۔ شاہد سے تمھارا پرانا خلوص ہے اور عصمت آپا کو تمھارے CAUSE سے خلوص ہے، ظاہر ہے کہ ان لوگوں پر تم کبھی بار نہ ہوگے۔ اس طرح سے سوچنا تمھاری زیادتی ہوگی۔"

(زیر لب، ص 16-15)

خط کے اقتباس پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی قیام کے دوران جاں نثار کی آمدنی ضرورت پورا کرنے کے لیے کافی نہ تھی، اس لیے زیادہ تر معاشی بحران کا سامنا رہتا تھا۔ صفیہ اپنی تنخواہ سے کچھ رقم انھیں بھیج دیا کرتی تھیں۔ محققین نے لکھا ہے کہ جب صفیہ اختر کو اپنی موت کا احساس ہونے لگا تو انھوں نے جاں نثار کو لکھنؤ بلایا لیکن جاں نثار کے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ وہ فوری طور پر لکھنؤ کا سفر کرسکتے۔ حالانکہ خط ملتے ہی انھوں نے لکھنؤ کے لیے جانے کا ارادہ کیا اور بقایا جات کے تقاضوں کے بعد صرف کرایے کی رقم اکٹھا کرسکے۔ صفیہ کے انتقال کے دو دن بعد لکھنؤ پہنچے اور جنازے میں بھی شرکت نہ کرسکے۔

صفیہ کے خطوط کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی ایک برہن بن کر رہ گئی تھی۔ جس میں بسنت اور بہار کا موسم، کوئل اور پپیہے کی آواز ان کے تن من میں شعلے بھڑکاتی تھی، تنہائی کی ناگن ڈستی تھی، لیکن ان سب کے باوجود وہ جاں نثار اختر کے فکری اور ذہنی میلان کو جانتی اور سمجھتی تھیں اس لیے انھیں اپنے جسمانی عیش ونشاط، رومان اور زندگی کی مسرتوں کو قربان کرنے کے باوجود خوش رہنے اور شوہر کی ہمت بڑھانے کی کوشش کرتی تھیں۔ صفیہ کے خط کے دو مختصر اقتباس دیکھیں:

"اچھے اختر! تم میں اتنے عزیز کیوں ہو؟ جانتی ہوں کہ میری اس محبت میں دیوانگی کا بڑا حصہ ہے، جی چاہتا ہے کہ دنیا کی ہر مصلحت کو ٹھکرا کر تمھیں چاہوں لیکن پھر تمھیں چاہنے ہی سے تو مجھے دنیا کی ہر مصلحت بھی حاصل ہوجاتی ہے۔ مجھے بھوپال کا لمحہ لمحہ بھاری ہو رہا ہے۔ دن پہاڑ سے لمبے معلوم ہوتے ہیں۔ اپریل بھی آچکے تم کب آؤگے؟" (زیر لب، ص 32)

ایک دوسرا خط دیکھیں:

"اختر! تم میری طرف سے پریشان نہ ہو۔ سوچو اگر ہمیں جسمانی عیش میسر بھی ہوتا تو ان حالات کے اندر ذہنی سکون کہاں مل جاتا؟ سکون تو انھی لوگوں کو حاصل ہے جو قطعی طور پر بے حس ہوچکے ہیں۔ مجھے کوئی تکلیف تکلیف نہیں معلوم ہوگی۔ اگر مجھے اس کا یقین رہا کہ وہ کسی اعلی مقصد کے لیے اٹھائی جارہی ہے تم میرے قدم مضبوط پاؤگے۔ میں تمھارا ساتھ دینے سے کبھی نہ تھک سکوں گی۔ اس لیے کہ مجھے تمھاری محبت حاصل ہے۔"

(6 فروری 1950، زیر لب، ص 30)

1 صفیہ کی خواہش تھی کہ کراچی کوچ کر جائیں اور وہاں انھیں ملازمت کی امید بھی تھی، لیکن جاں نثار کے اصرار کے بعد وہ بھی علی گڑھ سے بھوپال پہنچ گئیں۔

2 یعنی جس خط میں گوالیار کی ملازمت ترک کرنے کا ذکر ہے اور دوسرا جس میں جاں نثار کا استعفیٰ پرنسپل کو پہنچانے کی بات کی گئی ہے۔

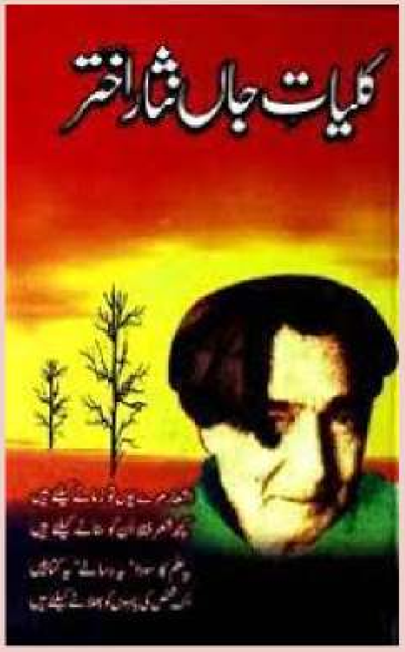

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات پر غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ جاں نثار اختر نے قوم، ملک، غریبوں محتاجوں اور مزدوروں کے لیے اپنے عیش و مسرت اور خوش حالی کو قربان کردیا تھا۔ جس میں ان کی بیوی صفیہ اختر بھی شانہ بشانہ، قدم بقدم ذہنی، فکری اور معاشی طور پر مدد کرتی رہتی تھی۔ اب اس پس منظر پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جاں نثار کا کرب ذاتی ہونے کے باوجود آفاقی نوعیت کا ہے۔ انھوں نے وقت کے جبر اور غلامی کی زنجیر کو توڑنے کے لیے ہر طرح کی مشکلات کا ڈٹ کر سامنا کیا اور کہیں کسی مسئلے کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئے۔ کرشن چندر جاں نثار اختر کے نام اپنے خط میں ان کے حقیقی فکری اور ذہنی رجحان کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

صفیہ کے انتقال پر جو نظم تم نے کہی ہے میرا خیال ہے اردو میں اس نوع کی بہت کم نظمیں کہی گئی ہیں۔ یہ تو نہ نوحہ ہے نہ مرثیہ ہے نہ مرنے والی کا قصیدہ ہے، اس نظم پر تمھارے ذاتی غم کی چلمن تو پڑی ہوئی ہے لیکن اس چلمن کے پیچھے ایک پورا ہندوستانی گھر آباد ہے، مجھے اس نظم میں ایک ایسے سماج کی بنیاد نظر آتی ہے جو ابھی ہے نہیں، لیکن جسے ہونا ہے، اس نظم میں انسان اور زندگی سے ایک ایسی بھرپور محبت پائی جاتی ہے کہ موت اپنے کامیاب ترین لمحوں میں زندگی سے ہراساں نظر آتی ہے اور جدائی کے آخری کربناک ثانیوں میں بھی وصال کا شبہ ہوتا ہے۔ جیسے صفیہ کا ہاتھ اب بھی تمہارے ہاتھ میں ہے۔

(زیر لب ص 11-10 (کرشن چندر کا خط-جاں نثار کے نام)

جاں نثار اختر نے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہتے ہوئے ہندوستانی سماج، معاشرے اور ادب کی خدمت کی ہے اس کا مکمل احاطہ کسی ایک مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔

لیکن ان کی حیات وخدمات پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی زندگی کے ان کارناموں کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ جس سے ان کی زندگی وابستہ رہی ہے۔ ادبی خدمات میں پچھلے پہر، سلاسل/ تار گریباں، جاوداں، گھر آنگن، نذر بتاں اور 'خاک دل' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ قومی نظموں کے انتخاب پر مبنی 'ہندوستان ہمارا' (دو جلدیں میں) ان کی مرتبہ کتاب ہے۔ 'خاموش آواز' ان کے خطوط کا مجموعہ ہے۔

رشید انجم صاحب کی تحقیق کے مطابق جاں نثار اختر نے 1948 سے 1976 تک تقریباً 77 فلموں میں 300 سے زائد گانے لکھے ہیں جو آج بھی اپنی معنویت اور چاشنی سے لوگوں کے دلوں کو چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جن میں چند کے نام اس طرح ہیں:

1 تیری محفل سے اٹھ کر تیرے دیوانے کہاں جائیں
حسینہ

2 اپنا تو زمانے میں اتنا ہی فسانہ ہے
کچھ ہم بھی دیوانے تھے کچھ دل بھی دوانہ ہے
اپنا انداز

3 میری نیندوں میں تم، میرے خوابوں میں تم
ہو گئے ہم تمہاری محبت میں گم
نیا انداز

4 یوں مسکرا کے سامنے آیا نہ کیجیے
دل لے کے میرے دل کو جلایا نہ کیجیے
قیدی

5 بیکسی حد سے جب گزر جائے
کوئی اے دل جیے کہ مر جائے
کلپنا

6 اے دلربا نظریں ملا کچھ تو ملے غم کا صلہ
رستم سہراب

وغیرہ۔

بنیادی طور پر جاں نثار ترقی پسند تحریک کے علم بردار ہیں ان کے یہاں وہی سارے مضامین در آئے ہیں جو ترقی پسند تحریک کے منشور کے طور پر کارفرما تھے۔ اس حوالے سے ان کی نظم زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم، میں ان کے گیت گاتا ہوں، مسافر کہیں راہ مت بھول جانا وغیرہ بے حد اہم ہیں۔ ان اشعار پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں گل وبلبل اور نسرین ونسترن کے بجائے مزدور، محتاجگی، افلاس، آنسو اور بھوک، بغاوت، ظالم، تیغ، استحصال وغیرہ کو مضمون کے طور پر برتا گیا ہے۔ جس سے کہیں آزادی کے متوالوں کے دلوں کو طاقت ملتی ہے تو کہیں استقامت اور عزم وحوصلہ۔

ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوگا کہ ان کے یہاں محض شعری رسومیات کے مطالعے کی آگہی اور صنائع وبدائع کی کرشمہ سازی نہیں، بلکہ اس میں ان کی ذات، شخصیت اور زندگی اپنے نشیب وفراز کے ساتھ مدغم ہے۔ ان کے یہاں لفظی شعبدہ بازی کے بجائے لفظوں میں معانی کا دریا رواں ہے۔ زندگی کی حقیقت، مناظر کی دلفریبی، نفسیات کی باریکی اور رومان کی رعنائی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔

مختصر طور پہ کہا جاسکتا ہے کہ جاں نثار کی زندگی اور تخلیقی سرشت گوناگوں عوامل وعناصر سے تشکیل پذیر ہے۔ وہ خیر آباد کی مٹی اور اپنے والد مضطر خیر آبادی کے نمائندہ ہیں۔ گوالیار میں بچپن اور علی گڑھ میں نوجوانی کے ایام گزارے جن سے ان کی فکری اور تخلیقی صلاحیت پروان چڑھی۔ چند برسوں تک معلمی کے پیشے سے جڑے رہے لیکن آزاد طبع کے مالک کب کسی کی سنتے ہیں۔ ترقی پسندی کے طفیل میں ملازمت کو خیر آباد کہا۔ فلمی دنیا سے وابستگی نے ان کے مزاج کو مزید آزاد اور اشتراکی نظریے کا حامل بنایا۔

ان کی زندگی کا باریکی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حقیقی معنوں میں سماجی ناہمواری اور غریبوں پر ظلم وجبر کی مخالفت ہی ان کی آزادی اور حقیقت پسندی ہے۔ لیکن ان سب سے الگ ان کی زندگی کا ایک خوبصورت اور لطیف پہلو ان کی رومان پسندی بھی ہے۔ جس کا اظہار ان کی کچھ نظموں اور زیادہ تر صفیہ اختر اور خدیجہ اختر کے نام لکھے گئے خطوط میں ملتا ہے۔ نظم 'گرلس کالج کی لاری' اور 'مسافر' کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ ان کے دل اور دماغ کے شعری اظہاریے کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

مراجع ومصادر

1 جاوداں: جاں نثار اختر، ادارۂ ادب وزندگی، بائیکلہ، ممبئی 1950
2 خاموش آواز: جاں نثار اختر، مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی، 1981
3 گھر آنگن: جاں نثار اختر، مکتبہ شاہراہ دہلی، 1971
4 نذر بتاں: جاں نثار اختر، اسٹار پبلی کیشنز، دہلی
5 تار گریباں: جاں نثار اختر، اسٹار پبلی کیشنز، دہلی
6 پچھلے پہر: جاں نثار اختر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی 1986
7 جاں نثار اختر شخص اور شاعر: آفاق حسین
8 جاں نثار اختر حیات وفن: ڈاکٹر کشور سلطانہ

Dr. Deewan Hannan Khan
Professor of Urdu
Deptt. of Education in Languages
NCERT, Sri Aurobindo Marg
New Delhi- 110016
Mob.: dhkhan.ncert@nic.in

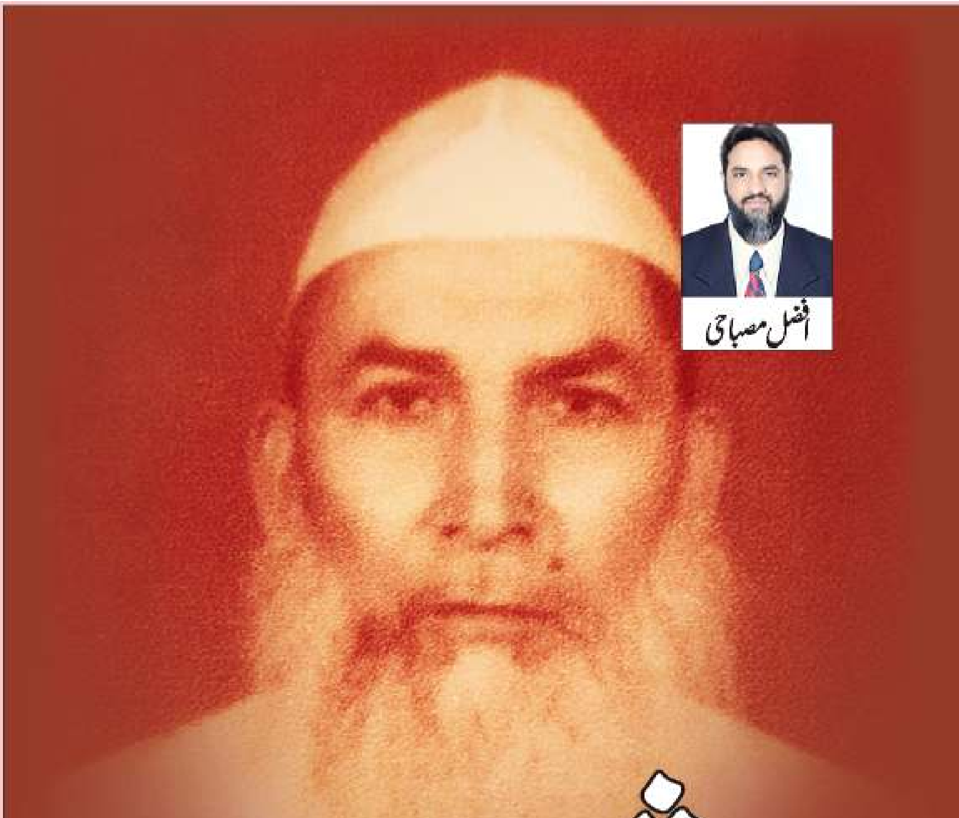

افضل مصباحی

علامہ شبنم کمالی کی غزل گوئی

شعری اصناف میں غزل کو اہم مقام حاصل ہے۔ اس میں انسانی جذبات اور قلبی واردات کو ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ تغزل اور غنائیت اس کی اہم خصوصیت ہے۔ انسانی جذبوں اور تجربوں کی جیسی رنگارنگی اس صنف میں دکھائی دیتی ہے؛ کسی اور صنف میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی لیے عام طور پر غزل کسی موضوع کی پابند نہیں ہوتی۔ اس کا ہر شعر اپنے آپ میں مکمل ہوتا ہے۔ اس میں مطلع، حسن مطلع، قافیہ اور ردیف وغیرہ کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔

علامہ شبنم کمالی کی غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کی غزلوں کا معیار ہر نہج سے کافی بلند ہے۔ انھوں نے انسانی جذبات کی ترجمانی انتہائی اچھوتے اور دلکش انداز میں کی ہے۔ تغزل اور غنائیت جو غزل کی اہم خصوصیات میں شامل ہیں؛ وہ شبنم کمالی کی غزلوں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی غزلوں کو ترنم کے ساتھ مشاعروں میں پڑھتے تھے اور محفل میں جان ڈال دیتے تھے۔ ان کی شعری خصوصیات کے ضمن میں پروفیسر محمد حسن کا یہ قول اہمیت کا حامل ہے: ''مولانا کی معروف دینی شخصیت اور ان کے سحر انگیز ترنم کا اثر تھا (کہ انھوں نے سامعین کا دل جیت لیا)، لیکن میں اس میں ایک تیسرا پہلو بھی دیکھتا ہوں اور وہ ہے شبنم کمالی کے کلام کی تازگی اور ان کا اپنا مخصوص رنگ و آہنگ۔''

شبنم کمالی کے شعری مجموعوں کے نام کچھ اس طرح ہیں: انوار عقیدت (1964)، فردوس عقیدت (1965)، ریاض عقیدت (1976)، ضیائے عقیدت (1980)، نوائے دل (1980)، آؤ گیت گائیں (1985)، تنویر خیال (1994)، صہبائے عقیدت (1996)۔ ان میں سے صرف 'نوائے دل' ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے، جب کہ 'تنویر خیال' میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔ 'آؤ گیت گائیں' بچوں کے لیے شعری مجموعہ ہے۔ انوار عقیدت، فردوس عقیدت، ریاض عقیدت، ضیائے عقیدت اور صہبائے عقیدت نعتیہ مجموعے ہیں۔ گویا شبنم کمالی نے غزلوں سے زیادہ نعت میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی غزلیں دوم درجے کی ہیں۔ ان کی غزلوں کا معیار بہت بلند ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پروفیسر طلحہ رضوی برق کی رائے بے حد اہم ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

''مولانا شبنم کمالی فطرۃً غزل کے شاعر ہیں اور انھوں نے اپنی بے شمار غزلوں میں اپنی نمایاں انفرادیت کو بروئے کار لایا ہے۔ دبستان بہار کے معاصر شعرا میں ان کے کلام کی یہی خوبیاں ان کا مقام محفوظ کرتی ہیں۔''[1]

شبنم کمالی کی غزلوں کا مجموعہ 'نوائے دل' 1980 میں منظر عام پر آیا۔ اس میں کل 60 غزلیں ہیں۔ یہ وہ غزلیں ہیں جو انھوں نے 1980 میں کہی۔ 'نوائے دل' میں 'اظہار حقیقت' کرتے ہوئے خود شبنم کمالی رقم طراز ہیں:

''اس حقیقت سے مجھے انکار نہیں کہ میرے مشغلوں میں سے ایک شاعری بھی ہے۔ چونکہ میرے مشاغل و مصروفیات کی فہرست طویل ہے؛ اس لیے فرصت و موقع ملنے پر کبھی کبھی رات میں دو گھنٹہ شعر گوئی میں صرف کرتا ہوں۔ اسی مدت میں دو غزلیں مکمل ہو جاتی ہیں، ورنہ ایک میں تو کسی شک کی گنجائش نہیں۔ میری یہ زود گوئی گرچہ شاعری میں مستحسن امر نہیں لیکن یہ میری مجبوری ہے، کیونکہ میں مکمل طور سے خالی الذہن ہو کر پھر دوسرے کاموں میں لگ جاتا ہوں جو اس سے زیادہ اہم ہے۔

تیس برسوں سے میدان شاعری میں میرا اشہب قلم تیز گامی سے رواں ہے، کبھی تسلسل کے ساتھ کبھی طویل وقفہ کے ساتھ...... میری غزلوں، نظموں اور نعتیہ

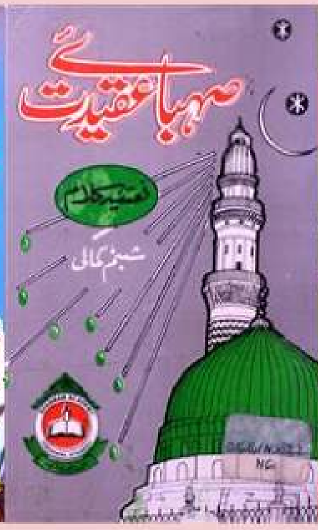

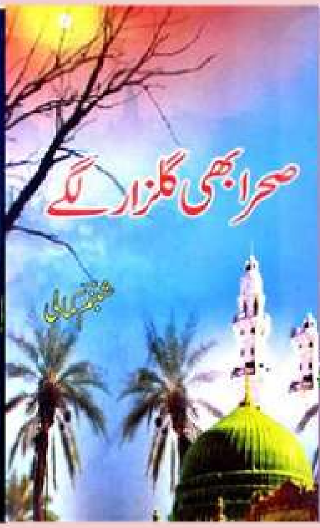

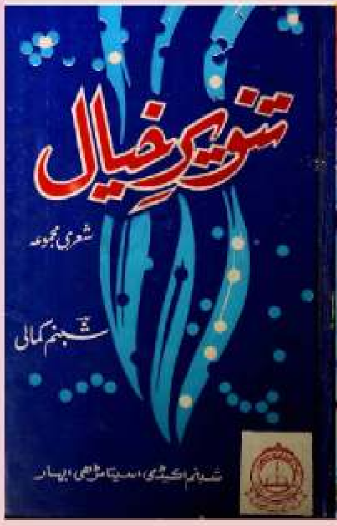

کلاموں کی تعداد تیرہ سو سے تجاوز کر رہی ہے...... ایسے عالم میں خیال ہوا کہ نمونہ کے طور پر چند غزلیں کتابی صورت میں پیش کردوں، اس کے لیے بھی میں نے اپنی آسانی کی خاطر یہی پسند کیا کہ سال رواں یعنی 1980 میں کہی گئی ساٹھ غزلیں ہی اہل نظر اور صاحب قدر کی آنکھوں سے گزار دوں۔"

مذکورہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ 1951 کے آس پاس شبنم کمالی کے تخلیقی سفر کا آغاز ہوا، وہ زود گو شاعر تھے، محض دو گھنٹے میں دو غزلیں کہہ لینے کی صلاحیت ان کے اندر موجود تھی، ساتھ ہی غزلوں، نظموں اور نعتیہ کلاموں کی تعداد تیرہ سو سے زائد ہے۔ اس سے ان کی شاعرانہ عظمت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ 'نوائے دل' میں 'اظہار حقیقت' کے عنوان کے تحت انھوں نے جو شعر نقل کیا ہے؛ اس سے ان کی غزلوں کے معیار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

ٹیس زخموں کی مرے، ان کے جگر تک پہنچے
پھر وہ آہیں بھریں، میں ان کا تماشہ دیکھوں

ساٹھ غزلوں پر مشتمل اس مجموعۂ کلام 'نوائے دل' کو دیوان کی حیثیت حاصل ہے۔ الف سے ے تک صرف 'ث ڈ ژ اور ع' کو چھوڑ کر تمام حروف تہجی کی ردیفوں میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے؛ جو ان کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ اس مجموعہ کلام میں شامل پہلی غزل کے چند اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

ڈھونڈنے پر بھی نہ مجھ کو کوئی ویرانہ ملا
جس جگہ پہنچا، وہاں پہلے سے دیوانہ ملا
میں نے جب الٹا کتاب زیست کا کوئی ورق
درد میں ڈوبی ہوئی فرقت کا افسانہ ملا
اپنی بستی سے ہوا ہے آج جب میرا گذر
اجنبی چہرہ لیے ہر شخص بیگانہ ملا
بے رخی کی دھوپ میں جلتا رہا تشنہ بہ لب
یوں تو کہنے کو مجھے بھی ایک پیمانہ ملا
بجلیوں کے دور میں ہے یوں اندھیروں کا ہجوم
رات بھر بے چین گھر میں ایک پروانہ ملا
زندگی اک درد ہے اور موت آہِ ناتمام
کہہ رہا تھا راہ میں جو مجھ کو فرزانہ ملا
ہے یہی اس کے لیے شبنم متاعِ زندگی
ہاتھ میں پتھر لیے جو کوئی دیوانہ ملا

شبنم کمالی کی غزلیہ شاعری کا طرۂ امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے روایت اور جدت دونوں کے امتزاج سے شاعری کی عمارت کھڑی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں کلاسیکی آداب کے ساتھ ساتھ جدید خیالات بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ترقی پسندوں میں وہ ترقی پسند تسلیم کیے جاتے ہیں، جدیدیت میں جدید؛ یہاں تک کہ جس رجحان کو مابعد جدیدیت کہا جاتا ہے؛ وہ ان کی شاعری میں پہلے سے موجود تھا۔ اس لیے ان کی شاعری کو کسی ایک رجحان سے خاص کرنا ان کے فن کو محدود کرنے کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

نہ دل میرا، نہ غم میرا، نہ میری زندگی میری
جہاں کو درس عبرت دے رہی ہے بے کسی میری
سنی روداد غم میری کہاں تم نے چمن والو!
کہا جو کچھ بھی میں نے وہ فقط تمہید تھی میری

شبنم کمالی کی شاعری کا ایک اہم جزو حسن مقطع ہے۔ انھوں نے تخلص 'شبنم' کا استعمال مقطع کے شعر میں جس خوبصورتی اور فنکاری کے ساتھ کیا ہے؛ وہ اردو شاعری میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ سچائی یہ ہے کہ جو بڑا فنکار ہوتا ہے؛ وہ اپنے تخلص کا استعمال اس طرح کرتا ہے کہ اس سے ایک طرف اس کا معنوی حسن دوبالا ہو جاتا ہے تو دوسری طرف کلام کی دلکشی میں بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔ 'شبنم' تخلص اپنے آپ میں بہت ہی نفیس، دلکش، معنی خیز، پہلودار اور اثر دار ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کا استعمال کہاں کہاں اور کیسے کیسے کیا ہے؛ اس کی چند مثالیں یہاں پیش کر رہا ہوں۔ اس سے ان کی فنکارانہ صلاحیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ ملاحظہ فرمائیں مقطع کے چند اشعار۔

میں قطرۂ شبنم ہوں، پھر میری حقیقت کیا
آنسو کی طرح کوئی پلکوں سے گرا دے گا

یہاں 'شبنم' کی جگہ کسی دوسرے لفظ کا استعمال کیا جاتا تو ایسی معنویت پیدا نہیں ہوتی؛ جو لفظ 'شبنم' سے پیدا ہو رہی ہے۔

جلا کے راکھ جو شبنم کرے گلستاں کو
تمہاری آہوں میں ایسا شرر نہیں ملتا

گلستاں کو جلا کر 'شبنم' کرنے کا استعارہ خوب ہے۔

کوئی سمجھے موتی تجھ کو، کوئی کہے پانی کی بوند
قدرت سے پایا ہے شبنم، تو نے کیسا روپ
شبنم تمہارا حوصلہ بے شک بلند ہے مگر
ہوگی نہ آنسوؤں سے اب فطرتِ شر الٹ پلٹ
لکھ دیا شبنم تری قسمت کے ساتھ
جب پڑا آنکھوں میں اشکوں کا رواج
تیری آنکھوں سے شبنم جو آنسو گرا
بن گیا راہ میں کہکشاں کی طرح
وادیِ زیست میں اس طرح ہر دم شبنم
جیسے میدان میں اڑتا ہو اکیلا کاغذ
رات بھر شبنم ترے رونے کا مقصد ہے یہی
کر رہے ہیں تیرے آنسو پھر کسی کا انتظار
روکتے ہیں راہِ شبنم، دل کو ملتا ہے سکوں
ہے کہیں پھولوں سے بہتر آج خاروں میں خلوص
اہل دل شبنم چمن سے کب کے رخصت ہو چکے
پھر کرے گا کون تیری دل بری کا کچھ لحاظ

کسی بڑے فنکار کے کلام کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ

شبنم صاحب بہ یک وقت عالم دین، اسلامی اقدار کے امین، اسلاف کے نقوش کے تابعدار، نعتیہ شاعری میں عقیدت وشریعت کے مابین فصل کے علم برداراور غزلیہ شاعری میں روایات اور اخلاقی وسماجی واصلاحی اقدارکے پاسداررہے۔ آپ نے مایوسی اور اداسی کے منفی رویوں کے برخلاف اپنی شاعری کے ذریعہ صحت مند انسانی تصورات، تفکرات اور محسوسات کی ترجمانی کی ہے۔ آپ کی نظرمعاشرے کے مختلف گوشوں پر اور شعبوں پرتھی۔ آپ شاداں وفرحاں اور روحانی واخلاقی اور تہذیبی وتمدنی اعتبارسے منزہ سماج کی تعمیر و تشکیل میں دانشوران قوم وملت کی ذمے داری کااحساس رکھتے تھے۔ جوآپ کی شاعری اورنثری ادب میں صاف دکھائی پڑتی ہے۔

اس کی معنویت ہر دور میں برقرار رہتی ہے۔شبنم کمالی کے کلام کی معنویت کا بھی یہی عالم ہے۔جس زمانے میں انھوں نے اپنا کلام پیش کیا؛وہ اس وقت کے لیے بھی موزوں تھااورآج بھی اس کی معنویت برقرار ہے، بلکہ جن مسائل کا احاطہ انھوں نے اپنی شاعری میں کیا ہے؛وہ من وعن آج کے مسائل پر صادق آتے ہیں۔

شبنم کمالی غزلوں میں کبھی سماج میں رسہ کشی، تو کبھی دوستوں کی عداوت، کبھی اپنی بے کسی، تو کبھی فانی زندگی کی روداد، کبھی آپسی میل جول اورعزم محکم، تو کبھی غریبوں کی اندوہناک حالت کی کہانی اور کبھی اسلاف کی پیروی اور دنیا سے بے رغبتی جیسے موضوعات ومشاہدات پیش کرتے ہیں۔ملاحظہ ہوں چند اشعار۔

ہیں کسب زر میں بھی پریشاں، اسی کو سمجھے ہیں دین وایماں
مگر سمجھتے نہیں یہ ناداں کہ زندگی جاوداں نہیں ہے
دب کے رہ جاتا وہ ناکامیوں کے بوجھ میں
جس بشر میں عزم راسخ جذبۂ پیہم نہیں

شبنم کمالی کی غزل گوئی پر بحث اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی ہے جب تک ان کے مجموعۂ کلام 'تنویر خیال' کی فنی خوبیوں کے حوالے سے گفتگو نہ کی جائے۔ اس مجموعۂ کلام میں غزل کے ساتھ آخر میں کچھ نظمیں بھی شامل ہیں۔اس مجموعے کی فنی خوبیوں کے بارے میں پروفیسر فاروق احمد صدیقی تحریر کرتے ہیں:

''......اور جب نعتیہ شاعری کے کئی مجموعے چھپ چکے تو پھر وہ بالکل خشوع وخضوع کے ساتھ عروس غزل کی مشاطگی میں مصروف ہوگئے۔جس کے نتیجے میں 1980 میں ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ 'نوائے دل' کے نام سے شائع ہوا۔اس مجموعے کی ایک خاص بات جو اس دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے ؛وہ یہ کہ اس کی ترتیب دیتے وقت دواوین کا روایتی حسن ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ یعنی اس میں ث ڈ ژ ع حروف کو چھوڑ کر بقیہ تمام حروف پر ختم ہونے والی ردیف کا استعمال ہوا ہے۔لیکن پیش نظر مجموعہ (تنویر خیال) میں تو ث ڈ اور ع حروف کی ردیفوں میں بھی طبع آزمائیاں کرکے انھوں نے اپنی غیر معمولی اختراعی صلاحیتوں کا ثبوت فراہم کیا ہے۔صرف ژ کی ردیف میں کوئی غزل نہیں ہے۔اس طرح یہ مجموعہ بھی مکمل دیوان کا نمونہ پیش کرتا ہے۔''[2]

پروفیسر فاروق صدیقی ان کی غزلیہ شاعری کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

''ان کی غزلیہ شاعری کے تعلق سے جو مجموعی تاثر قائم ہوتا ہے وہ یہ کہ اس کا پیرہن روایت اور جدت کے تار حریر دو رنگ سے تیار ہوا ہے۔یعنی ان کی شاعری ایک طرف روایت سے ہم آہنگ ہے تو دوسری طرف اس نے اپنے دروازے اور کھڑکیاں تازہ ہواؤں کے لیے کھلا رکھا ہے''[3]

شبنم کمالی نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا تھا۔ان کی غزلوں کی زبان سادہ، سلیس اور غیر معمولی رواں ہے۔

جنبش خار سے وہ شعر میں ڈھل جاتا ہے
قلب پر ہوتا ہے جس روز بھی الہام نیا
جب سے آنکھوں میں وہ سمائے ہیں
رنگ پھیکا ہے ماہ کامل کا

شبنم کمالی کی غزلوں میں تنوع کا حسن غالب ہے۔ انھوں نے بامقصد شاعری کے جلوے بکھیرے ہیں۔ تغزل اور شعریت کا خوبصورت امتزاج اور فکر وخیال کی اعلیٰ پروازان کی غزلیہ شاعری کو بام عروج تک پہنچا دیتی ہے۔ملاحظہ فرمائیں یہ اشعار۔

پھیر لیں آنکھیں خود ہی مجھ سے، یہ بھی تم نے خوب کیا
موت نے بھی اب موقع پایا، مجھ سے آنکھ ملانے کا
منزل عشق کی راہ سے بے خبر، رہ کے جو طے کرے زندگی کا سفر
جلوۂ حسن سے ہوگا محروم تر، لاکھ سر اس زمیں پر جھکا تا رہے
اپنے جذب دروں پر یقیں ہے مجھے تیز ہوگی اگر ساز الفت کی لے
چاند بن کے مرے گھر میں آجاؤگے، ذرہ ذرہ کو پھر جگمگاؤگے تم

اور یہ شعر دیکھیں۔

ساقی تجھ سے آنکھ لڑانا، رندوں کو مقصود نہیں
میخانوں کو ڈھونڈ رہے ہیں، آنکھوں کے پیمانوں میں

شبنم کمالی اپنی غزلیہ شاعری میں نئی نئی زمینیں بھی تلاش کرتے ہیں اور مضامین نو کے جلوے بکھیرتے ہیں۔ استعارہ اور تشبیہات کا خوبصورت استعمال کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں یہ اشعار۔

وہ میری بزم میں یوں نقاب کے ساتھ
ہو جیسے ابر کا ٹکڑا بھی ماہتاب کے ساتھ
دھڑکنیں دل کی بڑھ جاتی ہیں، آنکھیں بند ہیں
ہے تصور میں کسی کی صورت شاہانہ آج

شبنم کمالی کی شخصیت اور فن کے تعلق سے محمد قمرالدین نانپوری کی یہ رائے بے حد اہم ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''شبنم صاحب بہ یک وقت عالم دین، اسلامی اقدار کے امین، اسلاف کے نقوش کے تابعدار، نعتیہ شاعری میں عقیدت وشریعت کے مابین فصل کے علم برداراور غزلیہ شاعری میں روایات اور اخلاقی وسماجی واصلاحی اقدار کے پاسدار رہے۔آپ نے مایوسی اور اداسی کے منفی رویوں کے برخلاف اپنی شاعری کے ذریعہ صحت مند انسانی تصورات، تفکرات اور محسوسات کی ترجمانی کی ہے۔آپ کی نظر معاشرے کے مختلف گوشوں پر اور شعبوں پر تھی۔ آپ شاداں وفرحاں اور روحانی واخلاقی اور تہذیبی وتمدنی اعتبار سے منزہ سماج کی تعمیر وتشکیل میں دانشوران قوم وملت کی ذمے داری کا احساس رکھتے تھے۔ جو آپ کی شاعری اور نثری ادب میں صاف دکھائی پڑتی ہے۔''[4]

مجموعی طور پر شبنم کمالی ایک بڑے فنکار تھے۔نظم، نعت اور غزل تینوں میں ان کی فنی صلاحیت روز روشن کی طرح واضح ہے۔انھوں نے اپنی شاعری کے توسط سے سماج کی اصلاح کا کام بھی کیا، سماج پر طنز بھی کیا، روحانی، اخلاقی اور تہذیبی وتمدنی اعتبار سے منزہ سماج کی تعمیر وتشکیل کی کوشش بھی کی اور اردو زبان وادب اور فن پاروں میں گراں قدر اضافہ بھی کیا۔

حواشی

1 تنویر خیال: شبنم کمالی، ص18
2 ایضاً، ص5
3 ایضاً، ص7
4 علامہ شبنم کمالی حیات وخدمات: ڈاکٹر محمد قمرالدین نانپوری، صائمہ پبلی کیشن، پٹنہ، ص9

■

Dr. Afzal Misbahi
Assistant Professor & Section Incharge of Urdu,
MMV, Banaras Hindu University
Varanasi-221005 (UP)
Mob.:9810358883
E-mail: afzalmisbahi@gmail.com

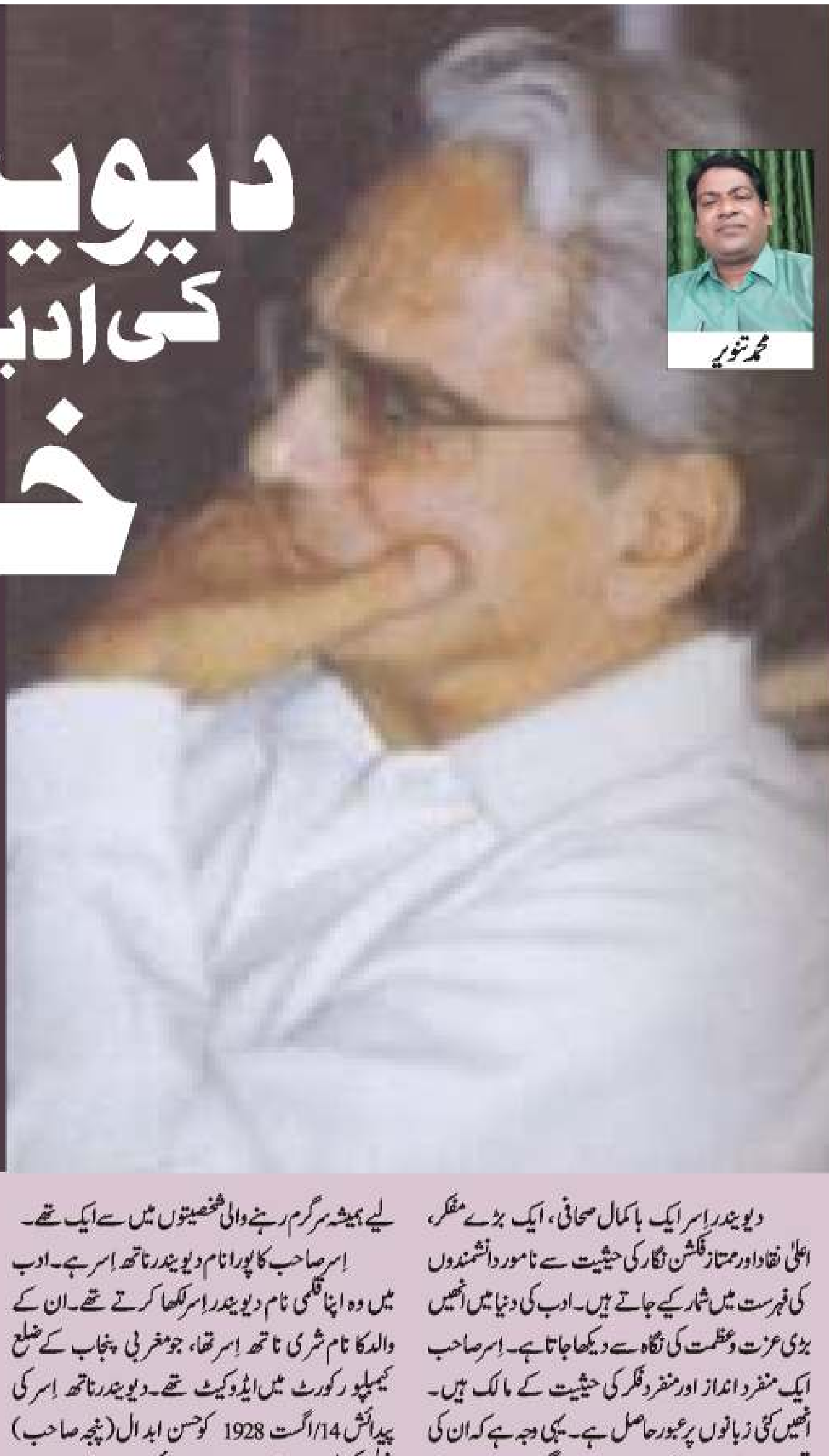

دیویندر اِسر کی ادبی اور صحافتی خدمات

محمد تنویر

اسر صاحب بہت ہی خوش مزاج، خوش اخلاق اور نرم طبیعت کے انسان تھے۔ وہ اپنی باتوں کو بہت سلیقے سے کہا کرتے تھے۔ ہمارے ملک ہندوستان کی جنگ آزادی کے لیے ہورہی جدوجہد کے حامی اور کئی تحریکوں میں ذہنی اور عملی طور پر شامل تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ایک ' کلچرفورم' نام کا ادارہ بھی قائم کیا۔ وہ ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے ہمیشہ سرگرم رہنے والی شخصیتوں میں سے ایک تھے۔

دیویندر اِسر ایک باکمال صحافی، ایک بڑے مفکر، اعلیٰ نقاد اور ممتاز فکشن نگار کی حیثیت سے نامور دانشمندوں کی فہرست میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ادب کی دنیا میں انھیں بڑی عزت و عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اِسر صاحب ایک منفرد انداز اور منفرد فکر کی حیثیت کے مالک ہیں۔ انھیں کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں اردو کے علاوہ ہندی، انگریزی اور پنجابی زبانوں کے لفظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ دیویندر اِسر ایک اچھے افسانہ نگار، ناول نگار، تنقید نگار اور محقق کے ساتھ ساتھ اچھے مترجم بھی ہیں۔ اِسر صاحب بہت ہی خوش مزاج، خوش اخلاق اور نرم طبیعت کے انسان تھے۔ وہ اپنی باتوں کو بہت سلیقے سے کہا کرتے تھے۔ ہمارے ملک ہندوستان کی جنگ آزادی کے لیے ہورہی جدوجہد کے حامی اور کئی تحریکوں میں ذہنی اور عملی طور پر شامل تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ایک ' کلچرفورم' نام کا ادارہ بھی قائم کیا۔ وہ ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے ہمیشہ سرگرم رہنے والی شخصیتوں میں سے ایک تھے۔

اِسر صاحب کا پورا نام دیویندر ناتھ اِسر ہے۔ ادب میں وہ اپنا قلمی نام دیویندر اِسر لکھا کرتے تھے۔ ان کے والد کا نام شری ناتھ اِسر تھا، جو مغربی پنجاب کے ضلع کیمبلپور کورٹ میں ایڈوکیٹ تھے۔ دیویندر ناتھ اِسر کی پیدائش 14/اگست 1928 کو حسن ابدال (پنجہ صاحب) ضلع کیمبلپور، مغربی پنجاب میں ہوئی اور 01/نومبر 2012 کو نئی دہلی میں وفات پائی۔ انھوں نے گریجویشن کی تعلیم 1947 میں گورنمنٹ کالج، پنجاب یونیورسٹی مغربی پنجاب سے حاصل کی۔ 1949 میں الہ آباد یونیورسٹی اترپردیش کے شعبہ معاشیات سے پوسٹ گریجویشن کی تعلیم حاصل کی اور بی ایڈ کی ٹریننگ 1953 میں دہلی یونیورسٹی سے لی۔ اور ماس کمیونی کیشن کی ڈگری 1974 میں کارنیل یونیورسٹی امریکہ سے حاصل کی۔ اس کے بعد تاحیات درس و تدریس اور ادب کی تخلیق و صحافت کی خدمت میں مصروف رہے۔ ہمارے ملک ہندوستان کی جنگ آزادی کے لیے ہورہی جدو جہد اور چل رہی تحریکوں میں عملی اور ادبی طور پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس جدوجہد کی وجہ سے انھیں جیل بھی جانا پڑا۔

ادبی تخلیق کار کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ اِسر صاحب کے یہاں ترقی پسند تحریک سے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ اس کی مثال خصوصاً ان کے افسانوں کے مجموعہ 'پرندے اب کیوں نہیں اڑتے' اور ناولٹ 'خوشبو بن کے لوٹیں گے' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

دیویندر اِسر ترقی پسند تحریک کے مثبت اثرات کا کبھی بھی انکار نہیں کرتے لیکن وہ اشتراکیت کے مبلغ بھی نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے ان کے خیر خواہ ادبی دوست نند کشور وکرم نے اپنے ایک مضمون میں اِسر صاحب کے ایک انٹرویو کا بہت ہی عمدہ حوالہ دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے ایک انٹرویو میں مجھ سے کہا تھا کہ:

''وہ اشتراکیت سے نہیں بلکہ سیاست سے ہی بیزار ہوگئے ہیں۔ اور وہ ہر قسم کے بند نظریات اور اقتدار کی

سیاست کی مخالفت کرتے ہیں، کیونکہ یہ فرد کو مانی پولیٹ (Manage) کرتے ہیں۔ اور وہ انسان کی مانی پولیشن خواہ وہ سیاسی ہو یا معاشی، مذہبی ہو یا دلت برادری کی، اس کی تائید نہیں کر سکتے۔"

(ایک دانشور ایک مفکر: دیویندر اسر، 2013، مرتب، نند کشور وکرم، ص: 32)

دیویندر اسر کی پہچان ایک بڑے صحافی کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ادیب، محقق اور فکشن نگار کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ جدیدیت، مابعد مابعد جدیدیت کی باتیں کرتے اور انھیں خیالوں میں گم رہتے تھے۔ مستقبل میں ہونے والے حالات اور نئے نئے تجربات وایجادات کی قیاس آرائیاں کرتے رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اس گہما گہمی کے دور میں اطلاعات ومعلومات کی فراہمی کے سبب ایک طرف تو معاشرے حقیقت پسندی اور عقلیت کے حامل ہو رہے ہیں تو دوسری طرف ہماری قدیم روایات نے بھی ہمیں جکڑ رکھا ہے۔ آج ہماری تمام خواہشیں اور ضرورتیں ذرائع ترسیل وابلاغ کے تابع ہو گئی ہیں۔ عوامی ذرائع ابلاغ اور ترسیل کے حوالے سے انھوں نے ایک بہت ہی اہم اور جامع کتاب بھی لکھی ہے۔ جس میں جدیدیت اور مابعد مابعد جدیدیت کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ انھوں نے یہ کتاب انگریزی زبان میں "Mass Media and Development Communication" کے نام سے تصنیف کی۔ جس کا اردو زبان میں ترجمہ 'عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر وترقی' کے عنوان سے ڈاکٹر شاہد پرویز نے کیا ہے۔ یہ کتاب ترسیل وابلاغ کے عنوان پر بنیادی نوعیت کی ہے۔ اس کتاب میں ترسیل وابلاغ کے تمام تر نظریات، ترسیلی عمل، ذرائع ابلاغ، تہذیب وثقافت، سماجی تبدیلی اور تعمیر وترقی وغیرہ کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ادیب اور ممتاز صحافی کی حیثیت رکھنے والے دیویندر اسر کو لگتا تھا کہ ہندوستانی ادیبوں میں وہ اپنے اس سفر میں تنہا ہیں۔ انھیں لگتا تھا کہ یہ تنہائی، یہ اجنبی زندگی کا ڈھنگ، ایک خاص طرح سے زندگی اور ادب سے متعلق سوچنا ادیب کا حصول ہوتا ہے۔ ادیب کا یہ حصول جب تخلیق میں شامل ہوتا ہے تو وہ ادیب ممتاز بن جاتا ہے اور اس کی تخلیق ایک شاہکار اور لاجواب۔ ان کا ماننا تھا کہ:

"تخلیق کے لیے خود کو مٹا دینا پڑتا ہے مگر اپنی خواہش کو چھوڑنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ حصولِ لذت کی خواہش فن کار خود سے ہٹا کر تخلیق سے وابستہ کر دیتا ہے۔ اس طرح تخلیق اس کی شخصیت کا ایک بنیادی جزو بن جاتی ہے لیکن وہ اپنی جس خواہش کو چھوڑ دیتا ہے، اس کی تخلیق اسے پھر حاصل کر لیتی ہے۔"

(ادب اور جدید ذہن، 1968، اسر ص 152)

تخلیق کی تعریف کرتے ہوئے اسر صاحب اپنی رائے کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

"تخلیق ایک ایسا تحریری عمل ہے جو جلسے، جلوسوں، نعروں، نقاروں، فتوے فرمانوں کے شور وغل میں بھی چلتا رہتا ہے۔ اور اپنی آزادی تحریر کو بنائے رکھتا ہے۔"

(ایک دانشور ایک مفکر: دیویندر اسر، 2013، مرتب نند کشور وکرم، ص 63)

اردو ادب کے حوالے سے دیویندر اسر نے بہت سے تحقیقی وادبی کام کیے ہیں جو ان کے تخیل کے اعتبار سے بالکل منفرد ہیں۔ اسر صاحب نے ادبی زندگی کا آغاز مضمون نگاری سے کیا تھا۔ انھوں نے تقریباً ایک درجن سے زائد کتابیں، کہانیاں، مضامین اور تبصرے وغیرہ لکھے۔ انھوں نے 'ارتقا' کے عنوان سے ایک اردو رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ مگر وہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ اسر صاحب نے بعض مضامین اور کتابوں کے ترجمے بھی کیے جن میں ایک اہم کتاب جے پرکاش نارائن کی تصنیف ہے۔ جو 1977 میں لکھی ان کی ایک ڈائری ہے، جسے جے پرکاش نارائن نے جیل میں رہ کر 'میری جیل ڈائری' کے عنوان سے لکھی تھی۔ اسر صاحب کی پہلی کہانی 'چوری' 1946 میں۔ پہلا مضمون 'آرٹ کا سائنٹفک نظریہ' 1946 میں، پہلا ڈرامہ 'بھوکے دیوتا' 1947 میں، پہلی ہندی کہانی 'پرتی کریا' 1948 میں اور آخری کہانی 'مسٹر روسو' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اسر صاحب کی بعض تصنیفات کا ذکر کرنا بھی لازمی سمجھتا ہوں جو درج ذیل ہیں گیت اور انگارے (1952)، شیشوں کا مسیحا (1955)، فکر اور ادب (1958)، ادب اور نفسیات (1963)، ادب اور جدید ذہن (1968)، کینوس کا صحرا (1983)، مستقبل کے روبرو (1986)، خوشبو بن کے لوٹیں گے (1988)، پرندے اب کیوں نہیں اڑتے (1992)، ادب کی آبرو (1996) وغیرہ۔ دیویندر اسر نے صحافت کے موضوع پر انگریزی میں ایک کتاب "Mass Media and Development Communication" سال 2002 میں لکھی۔

دیویندر اسر اردو ادب کی خدمت کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں اور اردو صحافت کی دنیا میں بھی گراں قدر اضافہ کیا جو قابلِ قدر ہے۔ اتنے وسیع پیمانے پر ثقافتی مکالمہ قائم کرنے کی کوشش اسر صاحب ہی کر سکتے تھے۔ ہاں اگر ان سے آگے کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ باقر مہدی اور زاہد ڈار کا ہے۔ ان کے علاوہ اردو میں کوئی اور شخصیت نظر نہیں آتی۔ اسر صاحب کو اردو اور ہندی ادب کو نئی فکر وتحقیق سے روشناس کرانے اور صحافت میں جدیدیت اور مابعد مابعد جدیدیت سے متعلق نئے نئے رجحانات وخیالات کو پیش کرنے کی وجہ سے کئی بڑے انعام واکرام سے بھی نوازا گیا۔

دیویندر اسر نے صحافت کے علاوہ تنقید اور فکشن کے میدان میں بھی بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے گیت اور انگارے، شیشوں کا مسیحا، کینوس کا صحرا اور "پرندے اب کیوں نہیں اڑتے"۔ ناولٹ 'خوشبو بن کے لوٹیں گے'۔ اور تنقیدی تصانیف فکر اور ادب، ادب اور نفسیات، ادب اور جدید ذہن، مستقبل کے روبرو، ادب کی آبرو۔ اور 'نئی صدی اور ادب'

اردو ادب کے حوالے سے دیویندر اسر نے بہت سے تحقیقی وادبی کام کیے ہیں جو ان کے تخیل کے اعتبار سے بالکل منفرد ہیں۔ اسر صاحب نے ادبی زندگی کا آغاز مضمون نگاری سے کیا تھا۔ انھوں نے تقریباً ایک درجن سے زائد کتابیں، کہانیاں، مضامین اور تبصرے وغیرہ لکھے۔ انھوں نے 'ارتقا' کے عنوان سے ایک اردو رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ مگر وہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔

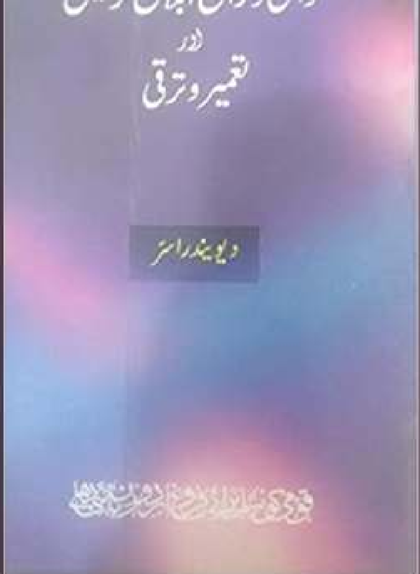

کی ادبی دنیامیں بڑی پذیرائی ہوئی۔ افسانوں کا مجموعہ 'پرندے اب کیوں نہیں اڑتے' اور ناولٹ 'خوشبو بن کے لوٹیں گے' میں ترقی پسندی اور جدیدیت کا امتزاج واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ممتاز محقق وقار عظیم اِسر صاحب کی انفرادی فکر اور تخیل پردازی کو دیکھتے ہوئے افسانوں کے حوالے سے اپنی تحقیقی تصنیف 'داستان سے افسانے تک' میں رقمطراز ہیں:

''دیویندر اِسر ہمارے ان گنتی کے افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے زندگی کی تلخیوں اور اس کے انتشار و اضطراب سے گھبرا کر تصور اور تخیل کی دنیا میں پناہ لینے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے اس انتشار و اضطراب کا مقابلہ بڑی پامردی سے کیا ہے۔ ان کی نظر زندگی کی چھوٹی چھوٹی برائیوں پر بھی ہے۔ لیکن ان کا عقیدہ ہے کی برائیاں پورے نظام کو بدلے بغیر پوری نہیں ہوسکتیں۔''

(ایضاً، ص:11)

''ادیب تو تخیل سے تخلیق کرتا ہے، ہم تخیلی ادب کی بات کرتے ہیں نا کہ علوم کی۔ ذاتی تجربے کی نا کہ خارجی مناظر کی۔ اس لیے ہمیں الیکٹرانکس سے کیا لینا دینا۔ انسانی ذہن اور احساس کو محدود کرتا ہے۔ یہ ایسے ہی جیسے کہ کچھ ادیب یہ دعوے کرتے ہیں وہ دوسرے ادیبوں کی تحریریں اس لیے نہیں پڑھتے کہ ان کی اورجنلیٹی ختم ہوجائے گی۔ میرا خطاب ایسے عظیم ادیبوں سے نہیں بلکہ ان سے ہے جو تجربے اور علم کے دائرے کو گہرا اور وسیع کرنا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہر نیا علم، نیا واقعہ، نئی اطلاع، دریافت یا تحقیق تخیل، احساس اور فکر کو وسعت اور گہرائی عطا کرتی ہے۔''

(مستقبل کے روبرو، 1986، اِسر، ص 120)

دیویندر اِسر صاحب نے بطور مہمان استاد جواہر لعل نہرو یونیورسٹی (جے این یو) اور جامعہ ملیہ اسلامیہ (جے ایم آئی) میں اردو میڈیا کے حوالے سے خصوصی کلاسیں لیں ہیں۔ ان کے یہاں تخیل پردازی اِس حد تک تھی کہ میڈیا کی کلاس میں وہ اپنے طلبہ کو ہمیشہ نئے نئے تجربات و ایجادات اور اطلاعات و معلومات اور نئی کھوج وخبر وغیرہ کی فراہمی سے متعلق آگاہ کیا کرتے تھے۔ مستقبل میں ہونے والی تکنالوجی اور مشینوں کی ایجادات کے امکانات کی طرف اشارہ بھی کیا کرتے تھے۔ تقریباً دو دہائی سے بھی قبل انھوں نے کہا تھا کہ:

'' ایک وقت آئے گا جب سائنس خوب ترقی کرے گی اور اس ترقی سے دنیا بہت بدل جائے گی۔ گاؤں اور شہر اس قدر ترقی یافتہ ہوں گے کہ ہر ہاتھ میں تکنالوجی کی ڈور نظر آئے گی۔ آج یہ جو بڑی بڑی مشینیں، نئی نئی تکنالوجی اور الیکٹرانک چیزیں جیسے گھڑی، کیمرا، ریڈیو، لاوڈاسپیکر، فوٹو کاپی کی مشینیں، اکسرے کی مشینیں، ایم آر آئی کی مشینیں، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، موبائل، آئی فون، بلوٹوتھ اور بعض مختلف ترقی یافتہ ڈوائیس وغیرہ سب سمٹ کر بہت چھوٹے اور استعمال کرنے میں بہت آسان ہو جائیں گے۔ اس قدر چھوٹے کہ لوگ اسے اپنے ہاتھوں کی کلائیوں میں گھڑی کی طرح اور انگلیوں میں انگوٹھی کے نگینے کی طرح پہنا کریں گے۔ بعض تو اتنے چھوٹے ہوں گے کہ اسے کان کے سراخ اور انگلیوں کے ناخون پر پالش کے مانند استعمال کریں گے۔''

(درس وتدریس کے وقت کلاس روم میں، اسر، 2004)

ہم دیکھتے ہیں کہ آج وہی زمانہ آگیا ہے اور اِسر صاحب کی کہی ہوئی باتیں اور قیاس آرائیاں سچ ہوتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ترسیل وابلاغ میں سب سے تیز کوئی ذرائع کام کرتا ہے تو وہ 'افواہ' ہے۔ افواہ کے ذریعے کوئی بات سچی ہو یا جھوٹی برق رفتاری سے عوام الناس تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کی تصدیق کے ہونے تک 'افواہ' معاشرے کو اپنے گرفت میں لے لیتی ہے اور عوام اس منفی یا مثبت افواہ کا اثر بہت جلد قبول کر لیتی ہے۔ جب تک اس افواہ کی صداقت کا پتہ چلتا ہے تب تک قاصد اپنا مقصد پورا کر چکا ہوتا ہے۔ آج ہم اِطلاعاتی تکنالوجی کے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ ہماری زندگی اور معاشرے کا کوئی بھی گوشہ باقی نہیں جو انفارمیشن تکنالوجی سے متاثر نہ ہو۔ مثال کے طور پر جیسے۔ گھر ہو یا دفتر، اسکول ہو یا کالج، یونیورسٹی ہو یا انسٹی ٹیوشن، انڈسٹری ہو یا فیکٹری، معیشت ہو یا ثقافت، کھیل کود ہو یا تفریح، فن ہو یا کوئی سرکاری محکمہ ہر جگہ جدید تکنالوجی حاوی ہوتی جارہی ہے اور ہمارا کام آسان ہوتا جارہا ہے۔ تکنالوجی نے تعلیم کی دنیا میں بھی بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ انٹرنیٹ کی ایجاد سے عالمی نظام بالکل بدل گیا ہے ایسا لگتا ہے کہ ساری دنیا گھر کے اندر سمٹ آئی ہے۔ 'کرلو دنیا مٹھی میں' کا نعرہ بھی سچ ہوتا نظر آرہا ہے۔ ہر طرح کی انفارمیشن برق رفتاری سے ایک کلک پر گھر بیٹھے ہم تک پہونچ جاتی ہے۔ اسر صاحب لکھتے ہیں:

''تکنالوجی سے فرار ممکن نہیں۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکا نہیں جاسکتا۔ لیکن اس کی رفتار اور سمت کا تعین کیا جاسکتا ہے اور یہ تبھی ممکن ہے، جب ہم تکنالوجی کو سائنسدانوں اور حکمرانوں کے ہاتھوں سے نکال کر نوعِ انسانی کا مشترکہ سرمایہ قرار دیں اور اسے انسان کی مادی اور روحانی زندگی کی بہتری کے لیے استعمال میں لائیں۔ نہ کہ اس کے خلاف واویلا مچا کر اپنی بے بسی اور لاعلمی کا ثبوت دیں۔''

(مستقبل کے روبرو، 1986، اسر، ص:117)

انٹرنیٹ کے حوالے سے بل گیٹس نے 'انٹرنٹ اِز دی فیوچر' میں لکھا ہے کہ:

''انٹرنیٹ ایک متلاطم نہر ہے جو کمپیوٹر انڈسٹری کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے اور وہ بہت سے لوگ جو اس لہر میں تیرنا سیکھنے سے احتراز کریں گے، اس میں ڈوب جائیں گے۔''

(عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر وترقی، 2002، اسر، ص:12)

جدیدیت اور مابعد جدیدیت کو اپنی فکر کا اہم موضوع بنانے والے دیویندر اِسر نے اردو ادب کے حوالے سے جو کچھ بھی تحقیقی و تنقیدی کام کیا ہے ان سب میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی فکر اور منفرد رجحان کو مدِ نظر رکھا ہے۔ اس نئی فکر اور نئے خیالات سے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ ادیبوں، نقادوں اور دانشوروں نے بھی انھیں دل سے قبول کیا۔ اِسر صاحب جس ذہنی کلچر کی پیداوار ہیں اس میں گہرائی، وقار اور تمکنت بہت زیادہ تھی۔ مجال ہے جو کہیں سوقیانہ پن کا شائبہ تک پیدا ہو۔ اِسر صاحب کی شخصیت کو جاننے کے لیے قاری کو پہلے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ساتھ ساتھ بدلتے نظام اور ترقی پسند رجحانات کو سمجھنا لازمی ہوگا۔ مابعد جدیدیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اِسر صاحب کہتے ہیں کہ:

''روشن خیال بیدار ذہنوں کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ کیونکہ مابعد جدیدیت کا تذکرہ ادب اور فن کے دائرے سے باہر نکل کر پوری تہذیب پر محیط ہو چکا ہے۔ اور اس کے حوالے سے علم، فن اور زندگی کے ہر شعبے سے متعلق متعدد کتابیں اور رسائل و جرائد میں تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔ لہٰذا اس کے تنقیدی محاسبے کی اشد ضرورت ہے اور اس کے مثبت پہلوؤں اور منفی رویوں، دونوں پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔'' (ادب کی آبرو، 1996، اسر، ص:41)

ہم دیکھتے ہیں کہ جدیدیت ایک ایسا تاریخی، ادبی اور فلسفیانہ تصور ہے جو حالاتِ زندگی کا سامنا کرتا ہے اور اسے تمام تر خطرات و غیر روایتی امکانات کے ساتھ برتنے کی سیکھ دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو مسلسل جاری وساری رہتا ہے۔ جدیدیت صرف انسان کی تنہائی، مایوسی، اس کی اعصاب زدگی کی داستان ہی نہیں بلکہ اس میں انسانیت کی عظمت کے ترانے اور انسان دوستی کا جذبہ بھی شامل ہوتا ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے رجحانات کو اردو ادب کی تمام تر اصناف میں تعارف

جدیدیت اور مابعد جدیدیت کو اپنی فکر کا اہم موضوع بنانے والے دیویندر اسِر نے اردو ادب کے حوالے سے جو کچھ بھی تحقیقی و تنقیدی کام کیا ہے ان سب میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی فکر اور منفرد رجحان کو مدِنظر رکھا ہے۔ اس نئی فکر اور نئے خیالات سے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ ادیبوں، نقادوں اور دانشوروں نے بھی انھیں دل سے قبول کیا۔

کرانے والوں میں اِسر صاحب کا نام قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے اردو ادب، ہندی ادب اور اردو صحافت کو جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے بہت قریب کردیا۔ 'سماجی زندگی فطرت سے تہذیب کی جانب تبدیلی کا سفر ہے' جس میں انسانی فطرت کو ثانوی فطرت قرار دے دیا گیا ہے۔ جدید ادب میں انفرادی احساسات اور ردِعمل کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ جدید فن کاروں نے سماجی اداروں کے بجائے فرد کی خود اپنی خواہش اور انفرادی شعور کو مقدم قرار دیا ہے۔ تہذیب کے مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آسویلڈ اسپنگلر نے مثال کے طور پر کچھ یوں اپنی رائے پیش کی ہے کہ:

''ہر تہذیب کی زندگی میں ایک ایسا مقام آتا ہے جب اس کے اندر کی سب چیزیں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ داخلی نشوونما بند ہوجاتی ہے اور تہذیب کے تحفظ کے لیے خارجی ترقی ہی ایک راستہ رہ جاتا ہے۔''

(ادب اور جدید ذہن، 1968، اسر، ص 23)

اِسر صاحب کی تصانیف، تالیفات اور ترجموں کی مجموعی تعداد پچاس سے بھی زیادہ ہے۔ یہ سارا کام خود انھیں کا کیا ہوا ہے۔ ان کا یہ کام مستعار یا کسی اور کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو حیرانی ہوتی ہے کہ اِسر صاحب اتنا کچھ کیسے کرتے تھے۔ ان کے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ تقریباً سترہ سال کی کم عمری سے ہی شروع ہوگیا تھا اور جب تک لکھ سکتے تھے لکھتے رہے۔ وہ بھی ہمیشہ کی طرح اسی جوش وجذبات اور اسی پختگی کے ساتھ۔ اِسر صاحب کی تحریروں کا مطالعہ کرنے سے ان کے فکری رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ ہم کسی فنی تخلیق کی قدر تب معین کرسکتے ہیں جب ہمیں اس کی تمیز اور پرکھ ہو۔ ملاحظہ ہو:

''لہٰذا جب پرکھ کی کسوٹی کا سوال اٹھتا ہے تو ہمیں ان باتوں پر غور کرنا لازمی ہے کہ اس شے کی ماہیت کیا ہے؟ اس ماہیت سے کیا منصب وابستہ ہے؟ اور اس منصب کی تکمیل کیسے ہوسکتی ہے؟ اس کے بعد ہم عملی طور پر کسی فنی تخلیق کی قدر معین کرسکتے ہیں۔''

(فکر و ادب، 1958، اسر، ص: 8)

اِسر صاحب کے خیال میں 'فن کے شعبے میں تخلیقات اور رائج فکری رجحانات کا سائنسی تجزیہ کرنے کے لیے اس دور کے سماجی اور معاشی حالات کا شعور لازمی ہے'۔ ان کا سوال اپنے ماضی سے بھی ہے اور مستقبل سے بھی۔ ادب، نفسیات اور ماس میڈیا ان کی ذہنی اور تخلیقی سرگرمیوں کے تین خاص میدان تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو زندگی کی تفہیم وتعبیر کے کسی ایک تحریک ور جحانات کا غلام بنا کر نہیں رکھا۔ ادب، آرٹ، سماجی اور سائنسی علوم، فلسفہ اور نفسیات، اسی طرح اساطیر اور تاریخ، مارکسزم اور انتھر وپولوجی، قدیم وجدید روایات اور انفارمیشن ٹکنولوجی وغیرہ سے رابطہ رکھتے تھے۔ جارحانہ طبیعت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کو بہت اضطراب آسا اور پرجوش بنانے کی کوشش کی ہے۔ ادبی حلقوں میں اِسر صاحب کو بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ حتیٰ کہ ان کی شہرت روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ ادیب اور دانشور ان کی ذہانت کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ اردو کے مشہور ادیب وبڑے نقاد پروفیسر شمیم حنفی صاحب اِسر صاحب کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ اقتباس غور فرمائیں:

''اِسر صاحب بے تحاشا پڑھتے تھے اور صرف ادب نہیں پڑھتے۔ ان کے گیان دھیان کا مرکز وہ پر پیچ تخلیقی وحدت ہے جس کی تشکیل میں انسانی تجربوں اور تصورات کے تمام ممکنہ وسائل ایک ساتھ سرگرم ہوتے ہیں۔ اس ہمہ گیر اور مختلف النوع احساسات کو ایک ساتھ جذب کر لینے کی صلاحیت سے مالا مال رویے نے، اِسر صاحب کو صنمیات، تاریخ اور بشریات سے لے کر علومِ حاضرہ تک مطالعے اور تعبیر وتفہیم کے ایک ہزار شیوہ تجربے کا راستہ دکھایا ہے۔ اپنے مطالعے کی وسعت اور بوقلمونی کے لحاظ سے اِسر صاحب کا معاملہ اردو کے تقریباً تمام ادیبوں اور نقادوں سے مختلف ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ باقر مہدی اور زاہد ڈار سے کچھ مماثلت ٹھہرائی جاسکتی ہے۔''

(ایک دانشور ایک مفکر: دیویندر اسر، 2013، مرتب نند کشور وکرم، ص: 57)

اپنے ہم عصر ادیبوں اور تخلیق کاروں میں اِسر صاحب اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ یہ مقام ان کی منفرد اور مختلف فکر کی وجہ سے حاصل ہے۔ ادب اور صحافت میں اس قدر انفرایت اور مضبوط پکڑ ہے کہ کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ تخیل پردازی اس حد تک ہے کہ ہر تحریر میں ایک نئی بات اور نیا انداز ہوتا ہے۔ اِسر صاحب کا لکھنا پڑھنا کبھی رکا نہیں بلکہ اس کی رفتار بڑھتی ہی گئی ان کا لکھنا صرف افسانوں اور کہانیوں تک ہی محدود نہیں تھا۔ تفکر، تدبر، انسانی نفسیات، ادبی تحقیق، نئی تکنیک، علمِ ابلاغ سے لے کر زندگی کے خاکوں تک ان کا قلم چلتا رہا۔ عالمی نظام بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔ نئی نئی ایجاد اور تکنیک سے لوگ استفادہ کر رہے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کا کام آسان ہوتا جارہا تھا۔ اِسر صاحب کی فطرت میں بیباکی اور انانیت حدورجہ کی تھی۔ طبیعت کے نرم اور حساس دل انسان تھے جس کی وجہ سے ان سے ملنے والا کوئی بھی شخص ان کا شیدائی اور پیروکار ہوجاتا تھا۔ کسی بات کا اعتراف کرنے میں بہت جلد بازی نہیں کرتے تھے پہلے اس پر غور وفکر ضرور کیا کرتے تھے پھر اپنی رائے رکھتے تھے۔ غصہ آنے پر خاموشی اختیار کرتے اور صبر سے کام لیتے تھے۔ جو کچھ ان کے پاس ہوتا اسی پر قناعت کرتے اور خوشی خوشی اپنی تخلیقی کاوشوں کو انجام دیتے رہے۔

اِسر صاحب کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ عزت کے ساتھ لیا جائے گا۔ ان کی شخصیت کسی کی محتاج نہیں وہ اپنی تحقیقی وتنقیدی بصیرت اور منفرد رجحانات اور مابعد جدیدیت کے علم بردار کی حیثیت سے اردو دنیا میں ستاروں کے مانند چمکتے رہیں گے۔ ان کی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہی ہے کہ آج اردو ادب میں ماس میڈیا کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہوچکا ہے۔ انھوں نے ماس میڈیا سے متعلق بہت سارے مضامین اور کتابیں لکھیں جس کی پذیرائی ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں نے کی۔ جہاں تک جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا سوال ہے تو اِسر صاحب نے اپنی تحریروں میں جدید خیالات ور جحانات کو ہمیشہ فوقیت دی۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کو موضوع بحث بنایا اور مستقبل میں ہونے والے واقعات و ایجادات کی پیشن گوئیاں بھی کیں جو آج حقیقت ہوتی نظر آرہی ہیں۔ اخیر میں ہم یہ کہ سکتے ہیں کی اِسر صاحب نے اپنی منفرد سوچ اور جدید رجحانات سے اردو ادب کے کینوس کو اور وسیع کردیا۔

■

Dr. Mohd Tanveer
B3/01, Sector-E-1,DDA Flates
Graound Floor, Mahipalpur Road Near CNG
Vasant Kunj
New Delhi- 110070
Mob.: 8076892245

صابر رضا رہبر

اردو میں کالم نگاری

اردو میں کالم نگاری کا آغاز بیسویں صدی کے وسط میں ہوا۔ دستیاب تاریخ کے مطابق اس کی ابتدا سنجیدہ کالم کی شکل میں ہوئی مگر اسے شناخت طنزیہ اور مزاحیہ کالم کے طور پر حاصل ہوئی۔ اس کو عروج بخشنے کا سہرا 'اودھ پنچ' اور اس کی تقلید میں ملک بھر میں جاری ہونے والے 'پنچ' لاحقے والے اخبارات کے سر جاتا ہے۔

'اودھ پنچ' میں منشی سجاد حسین انگریزی حکومت کی پالیسیوں کا جائزہ لیتے تھے۔ اودھ پنچ میں 'لوکل' اور 'موافقت زمانہ' کے عنوان سے مستقل کالم شائع ہوتے تھے۔ اودھ پنچ کے کالم نگاروں میں تربھون ناتھ ہجر، رتن ناتھ سرشار، ستم ظریف اور اکبرالٰہ آبادی کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جاسکتے ہیں۔ اس میں برٹش حکومت کے عوام مخالف ایجنڈوں پر نہ صرف جم کر تنقید کی جاتی تھی بلکہ طنز و مزاح کے تیر و نشتر کے ذریعے کالم نگار بروقت عوام کو حکومت کی منشا و مقصد سے بھی آگاہ کرتے تھے۔ اودھ پنچ کا یہ مزاحیہ کالم اتنا مقبول و معروف ہوا کہ اس وقت کے دیگر اخبارات بھی اس کی پیروی کرنے لگے اور پھر پنجاب پنچ، لاہور پنچ، جالندھر پنچ، کلکتہ پنچ، علی گڑھ پنچ، بنارس پنچ، شملہ پنچ، آگرہ پنچ اور دکن پنچ وغیرہ میں بھی ایسے کالم کا اہتمام کیا جانے لگا۔ جنگ آزادی میں اردو اخبارات اور ان کے کالم نگاروں نے ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ بیباک اظہار خیال اور ٹھوس موقف کے سبب پابند سلاسل کیے جانے والے صحافیوں کی زریں خدمات سے تاریخ صحافت کے اوراق روشن ہیں۔

اردو اخبارات میں شائع ہونے والے کالموں پر حکومت انگلشیہ اس قدر برافروختہ ہوجاتی تھی کہ وہ انتقاماً نہ صرف پریس پر قفل لگانے کا فرمان جاری کرتی تھی بلکہ بسا اوقات صحافیوں پر نت نئے مظالم ڈھاتی تھی۔ ان گنت صحافیوں کو سچ کہنے کی پاداش میں پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جانا اس کے بیّن ثبوت ہیں۔ مگر انگریزی حکومت کے تشدد کے نئے نئے تجربے بھی ان صحافیوں کے حوصلوں کو پست کرنے میں ناکام رہے۔

کالم کسی بھی اخبار کی روح ہوتا ہے۔ اس کا معیار اور اس کے نظریات و خیالات کو اخبار کی پالیسی کا عکاس ونقیب سمجھا جاتا ہے۔ اسی سے اخبار کی منفرد شناخت قائم ہوتی ہے۔ اس لیے کالم کو اخبار کی جان کہا جاتا ہے۔ اخبارات میں ادارتی صفحے کی اہمیت اس لیے دوچند ہوجاتی ہے کہ اس میں حال کی نبض ٹٹول کر کالم نگار ماضی کے آئینے میں مستقبل کے نشیب و فراز سے عوام کو باخبر کرتا ہے۔ کالم کا معیار جتنا بلند ہوگا اخبار کے قارئین کا حلقہ اسی قدر وسیع ہوگا اور اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔

کالم نگاری یا کالم نویسی صحافت کی ایک اہم اور حساس صنف نگارش ہے۔ اپنے خیالات و احساسات کے اظہار کے لیے کالم نویس کو نپے تلے لفظوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کالم نویس کے فرائض میں سب سے اہم یہ ہے کہ وہ متوازن اسلوب اختیار کرے، اشتعال انگیز رویہ اختیار کرنے کے بجائے سنجیدہ لب و لہجے میں ایوان اقتدار تک مظلوموں کی آواز پہنچانے کا فریضہ انجام دے۔ کالم نویس اپنے پیشہ ورانہ اور مثبت انداز میں معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کا پردہ چاک کرتا ہے تاکہ ظالم کو مزید ظلم سے روکا جاسکے۔ کالم نویس اپنے مقصد کی ترسیل میں اسی وقت کامران ہوسکتا ہے جب صحافت مکمل طور پر آزاد ہو اور اظہار رائے کی آزادی کے لیے اس کے پاس ایک مستحکم پلیٹ فارم موجود ہو۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اچھا اور معیاری کالم اخبار کو منفرد شناخت عطا کرتا ہے اور اس کی مقبولیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ فکر تونسوی کے کالم (پیاز کے چھلکے)، مجید لاہوری کا (نمکدان)، عبدالمجید سالک کا (افکار و حوادث)، ریاض خیرآبادی کا (فتنہ اور عطر فتنہ)، حاجی لق لق کا (تعلق)، ساگر چند گورکھا کا (گپ شپ)، کنہیا لال کپور کا (دیکھتا چلا گیا)، عبدالماجد دریابادی کا (سچی باتیں)، جعفر عباس کا (آئینہ)، رنبیر کا (چٹکیاں) اور مختلف اخباروں کے (سخن در سخن)، (لوکل)، (گلوریاں) کی یادیں آج بھی لوگوں کے ذہن میں تازہ ہیں۔

ایک اچھا اور معیاری کالم اسی وقت وجود میں آسکتا ہے جب کالم نویس کا مطالعہ وسیع ہو، زبان و بیان پر عبور حاصل ہو، اس کی نزاکتوں اور لفظوں کی تراش خراش کے ہنر سے لیس ہو، قوت فیصلہ کا جوہر بدرجہ اتم موجود ہو اور بروقت حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے کے ملکہ کے ساتھ عصری تقاضوں پر اس کی گرفت مضبوط ہو تاکہ قارئین کو وہ ایک مستحکم نظریہ دے سکے۔ کالم نگار کو وقت کی نبض ٹٹولتے ہوئے بڑی صفائی کے ساتھ نپے تلے لفظوں میں اپنے مقصود کی ترسیل کرنی ہوتی ہے کیونکہ قدم قدم پر مصلحت پسندی کے روڑے سے سامنا ہوتا ہے۔ ایسے میں کالم نگار کا دودھاری تلوار سے بارہا واسطہ پڑتا ہے۔ وہ نہ تو اشتعال انگیزی سے کام لے سکتا ہے اور نہ ہی اپنے ضمیر سے سمجھوتہ اس کے لیے ممکن ہوتا ہے۔ صحافی شاہین صفت ہوتا ہے اور اپنے گردوپیش کے حالات پر وہ چیل کی سی نگاہ رکھتا ہے۔

اخباری کالم کے کئی اقسام ہیں جیسے عمومی کالم، خصوصی کالم، ذاتی کالم، سنڈیکیٹ کالم اور مزاحیہ کالم وغیرہ۔ چونکہ میرا مقصود مزاحیہ کالم نگاری ہے، اس لیے یہاں ہم مزاحیہ کالم سے متعلق گفتگو کریں گے۔ کسی بھی کالم کی خصوصیت اس کی انفرادی جہت اور رنگ و آہنگ ہے۔ کالم نگار کا منفرد اسلوب ہی کالم کی جان کہا جائے گا کیونکہ کالم میں جو باتیں کہی جاتی ہیں عموماً وہ بہت پہلے لوگ کہہ چکے ہوتے ہیں شاید ہی کوئی نئی بات، نیا گوشہ اور نیا خیال سامنے آتا ہے ورنہ وہی پرانے تجزیے ہوتے ہیں جنھیں لفظ و جملے کا نیا اسلوب و آہنگ عطا کیا جاتا ہے اور یہی کالم نگار کو امتیاز عطا کرتا ہے۔ بقول مجتبیٰ حسین:

''اب دنیا میں کوئی ایسی بات نہیں رہ گئی ہے جو کروڑوں برس پرانی دنیا میں پہلے نہ کہی گئی ہو۔ ارسطو اور افلاطون سے لے کر آج کے مشاہیر تک سب نے اپنے اپنے ڈھنگ سے ساری باتیں کہہ دی ہیں۔ لہٰذا اب بات کی اہمیت نہیں رہ گئی ہے البتہ اہمیت اس بات کی رہ گئی ہے کہ آپ کس ڈھنگ سے اپنی بات کہتے ہیں۔ اب جب کہ ساری باتیں، بہت پہلے کہی جاچکی ہیں تو ادب اب صرف ایک طرز ادا کا نام بن کر رہ گیا ہے۔''

(کچھ میرے کالم کے بارے میں، ص14، مشمولہ میرا کالم مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی)

کالم اور کالم نگاری کی خصوصیت اور کالم نگار کے لیے ضروری امور کے تعلق سے سید اقبال قادری نے کہا ہے کہ:

”ہر کالم نویس کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اپنی تحریر میں ایک واضح انفرادیت قائم رکھے۔اسے کسی بھی چیز کو بھانپ لینے کی عادت ہو۔اسے تجزیہ نگاری سے رغبت ہو اور وہ اپنی ہی قوت تخلیق کے ذریعے کالم کو استحکام بخشے۔“ (رہبر اخبار نویسی، از سید اقبال قادری، ص 325)

جہاں تک بات مزاحیہ کالم نگاری کی ہے تو باضابطہ رواج 1877 میں لکھنؤ سے نکلنے والے اخبار 'اودھ پنچ' نے دیا۔اس کے بعد اس کی مقبولیت وشہرت میں چار چاند لگ گئے کیونکہ اودھ پنچ کے مزاحیہ کالم کی مقبولیت کے بعد غیر منقسم ہندستان سے کئی 'پنچ' نکلنے لگے۔ان کے کالموں میں ملک وملت اور سماج کے تمام مسائل کا احاطہ کیا جاتا تھا۔ 'اودھ پنچ' کے کالموں نگاروں میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جن کا نام آج بھی روشن ہے۔ان میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت تربھون ناتھ سپرو ہجر، مچھو بیگ ستم ظریف، منشی جوالا پرساد برق، احمد علی شوق، سید محمد آزاد، عبدالغفور شہباز، احمد علی کسمنڈوی اور مدیر اودھ پنچ منشی سجاد حسین کے نام نمایاں ہیں۔ان کالم نگاروں نے ظرافت کے پردے میں انگریزی حکومت کے ظلم وتشدد، کسانوں کے استحصال اور ہندستانی عوام کے ساتھ انگریزوں کے دوہرے سلوک کا نہ صرف پردہ چاک کیا بلکہ ان کے خلاف مورچہ بندی بھی کی۔ رنگ ظرافت کے سبب براہ راست کالم نگاروں کو حکومت وقت عتاب کا شکار نہیں بنا پاتی تھی مگر ان میں کئی ایسے کالم نگار ہیں جنھیں اپنی بے باکی کے سبب قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ اودھ پنچ کا مزاحیہ کالم دراصل احتجاج کا ایک انوکھا باب تھا جو ظرافت کا رنگ لیے ہوئے تھا مگر اس میں عوام اور سماج سے متعلق بہت سی سنجیدہ باتیں کہہ دی جاتی تھیں۔درحقیقت انقلاب 1857 کے بعد انگریزی حکومت نے بولنے لکھنے پر پہرے بٹھا دیے اور سنجیدہ کالم نگاری کے لیے کوئی جگہ نہیں رہ گئی تھی تب مزاحیہ کالم نگاری کی راہ اپنائی گئی اور یہ تجربہ نہ صرف کامیاب رہا بلکہ سیاسی، اقتصادی اور معاشی استحصال کے شکار عوام کا نقیب وترجمان بن گیا۔مزاحیہ کالم میں کالم نگار بڑی ہوشیاری اور کمال فن کاری سے حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے،عوام کے مسائل اور سماج کی بے راہ روی پر چوٹ کرتے مگر اس کا رنگ طنز ومزاح کا ہوتا تھا اس لیے کالم نگار گردن زنی سے محفوظ رہتے تھے۔اودھ پنچ کے کالموں میں کس طرح عوامی مسائل، معاشی واقتصادی استحصال کو بیان کیا جاتا تھا اس کا اندازہ اخبار کے ایک اقتباس سے ہوتا ہے:

”ایک تو گرانی دوسرے بنیوں کی یہ مہربانی کہ وزن باٹوں سے تولتے ہیں۔لکھنؤ کا خدا ہی حافظ ہے۔اس جرم میں چہار شنبہ گزشتہ عدالت سٹی مجسٹریٹ سے چھ بنیوں کو چھ ہفتہ قید کی سزا ملی۔ 15 اکتوبر کو انسپکٹر پولیس فتح گنج بنیوں کے باٹ جانچ رہے تھے کہ ان لوگوں نے کیا فقرہ چست کیا (افواہ اڑائی) کہ امین آباد لٹا جا رہا ہے۔ بنیوں کا غلہ لوگ لے جاتے ہیں۔دوڑیو، دوڑیو... اور یہ کہہ کر سب نے دکانیں بند کرلیں کہ بنیوں کا فریب کھلنے نہ پائے۔ پولیس والے امین آباد کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی جان بچی ورنہ اس روز قلعی کھل جاتی۔“

(اودھ پنچ، 29 مئی 1877، بحوالہ طنزیات ومضحکات، از رشید احمد صدیقی)

اودھ پنچ کے کالم نگاروں کے موضوعات میں تنوع ہوتا تھا وہ محض ہنسانے کے لیے کوئی قصہ کہانی یا لطیفہ نہیں گڑھتے تھے بلکہ عوام وسماج کا ہر گوشہ ان کی تحریر کا حصہ بنتا تھا۔رنج وغم، ہنسی وخوشی بلکہ سماجی سطح پر ابھرنے والے ان تمام مسائل اور چیلنجز اور روزمرے کے واقعات وحادثات کا احاطہ ہوا کرتا تھا جس سے عوام وسماج میں بیداری پیدا کی جاسکے۔

اودھ پنچ نے مزاحیہ کالم کی جو تحریک چھیڑی تھی آزادی ہند کے بعد اس کی چمک ماند پڑ گئی۔ سیاست، ہندسماچار، انقلاب اور منصف کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی اخبار ہو جس نے باضابطہ مزاحیہ کالم کی روایت کو برقرار رکھا ہو۔ سیاست کا مزاحیہ کالم 'شیشہ وتیشہ' (شاہد صدیقی)، 'کوہ پیا' اور 'میرا کالم' (مجتبیٰ حسین) قابل ذکر ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ ہندستان میں مزاحیہ کالم نگار نہیں رہے ہاں پرانے لوگوں کی جگہ کوئی نیا کالم نگار نہیں لے سکا اور نہ ہی ان کی موت کے بعد ان کا کالم زندہ رہا۔ اخبار فتنہ میں ریاض میکسار کا کالم 'فتنہ عطر فتنہ'، 'زمین دار' میں خواجہ حسن نظامی کا کالم 'جھینگر کا جنازہ'، 'انقلاب' میں حاجی لق لق کا کالم، عبدالمجید سالک کا کالم 'افکار وحوادث'، شیرازہ میں چراغ حسن حسرت کا کالم، ہند سماچار میں کنہیا لال کپور کا کالم، ملاپ میں فکر تونسوی کا کالم 'پیاز کے چھلکے'، تخلص بھوپالی کا کالم 'پاندان'، جعفر عباس کا کالم 'جام بکف' روزنامہ عوام دہلی اور ہفتہ وارنئی دنیا دہلی میں آئینہ، حیات اللہ انصاری کا کالم 'گلوریاں' قومی آواز لکھنؤ میں (جسے بعد میں مجیب سہالوی نے بھی لکھا)۔

نصرت ظہیر کا 'بقلم خود' قومی آواز دہلی، خوشتر گرامی کا کالم تیر ونشتر، بیسویں صدی میں یوسف ناظم کا کالم اتوار یہ انقلاب ممبئی، شائع ہوتا رہا۔مگر آج ان میں سے ایک بھی کالم زندہ نہیں ہے۔ان کالموں کے تجزیے سے ایک تاریخی منظر سامنے آتا ہے کیونکہ اس سے اس عہد کے سماجی تاریخی اور عوامی رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔

کالم نگاری کی ادبی جہت

کالم نگاری کا اسلوب بھی ایک علاحدہ بحث کا متقاضی ہے۔عمومی طور پر سنجیدہ کالم نویس کا اسلوب بہت ہی خشک اور کھردرا ہوتا ہے۔لفظوں کے انتخاب اور جملوں کی سجاوٹ کے لیے انھیں وقت میسر نہیں ہوتا۔کالم نگار کی پوری توجہ کم لفظوں میں اپنے مقصود کی ترسیل پر ہوتی ہے کیوں کہ وقت کی قلت کے ساتھ جگہ کی بھی قید ہوتی ہے۔ نپے تلے پیرائے میں اپنی بات وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کے دوران کالم نگار کی تحریر میں کھردراپن آجانا فطری ہے اس لیے صحافی کی تحریروں میں ادبی پہلو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی حالانکہ ہمارے درمیان ایسے افراد کی بھی کمی نہیں ہے جنھوں نے ادب وصحافت دونوں میں کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ادب اور صحافت میں چولی دامن کا رشتہ ہونے کے باوجود کالم نگاری ودیگر صحافتی تحریروں کو ادب کا حصہ نہیں سمجھا جاتا۔کالم نگاری کو وقتی، چلتا ہوا اور صحافتی مشغلہ قرار دے کر اس کے دائمی وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا جاتا ہے حالانکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ادب اور صحافت الگ الگ شعبہ ہونے کے باوجود ہر نازک موڑ پر ایک دوسرے کو تقویت بخشتے ہیں اور ہر انقلاب کی آمد میں دونوں نے مستحکم کردار نبھایا ہے۔سرسید احمد خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، محمد حسین آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، کرشن چندر، رتن ناتھ سرشار، خواجہ احمد عباس، خواجہ حسن نظامی، سید سجاد ظہیر، نیاز فتح پوری، مشفق خواجہ، شوکت تھانوی ،حیات اللہ انصاری، ظ انصاری فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین جیسی شخصیات کی ایک لمبی فہرست ہے جنھوں نے بیک وقت اپنے فکر وقلم سے ادب اور صحافت دونوں کو مالامال کیا اور دونوں شعبوں کو جلا بخشی۔

البتہ ادب اور صحافت کے مابین گہرا رشتہ ہونے کے باوجود ایک حد فاصل بھی ہے۔دونوں کے اپنے اپنے تقاضے اور دائرے ہیں اگر صحافتی تحریر یا کالم نگار ادب کے تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوں تو اسے ادب کا حصہ قرار دیا جائے گا۔یعنی جس طرح ادب کے نام پر لکھی گئی ہر تحریر کو ادب کا حصہ نہیں سمجھا جاتا اسی طرح ہر کالم کو ادب کا جز نہیں کہا جائے گا۔ صارفیت اور عالم کاری کے اس عہد میں اردو صحافت میں کالم نگاری کی روایت ہی دم توڑتی جارہی ہے۔ ریڈیمیڈ میٹریل کی دستیابی اور مدیران ومالکان اخبار کی سہل پسندی نے کالم نگاری کی روایت کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔خدا کرے کہ اردو صحافت میں کالم نگاری کی شاندار روایت پھر سے پروان چڑھے اور عوام کے جذبات کی ترجمانی کا فریضہ انجام دے۔

■

Md. Sabir Raza
Md Firoz Ahmed White House
Naugharwa, Sultanganj
Patna- 800006 (Bihar)
Mob.:8804542020
Email.: sabirrahbar10@gmail.com

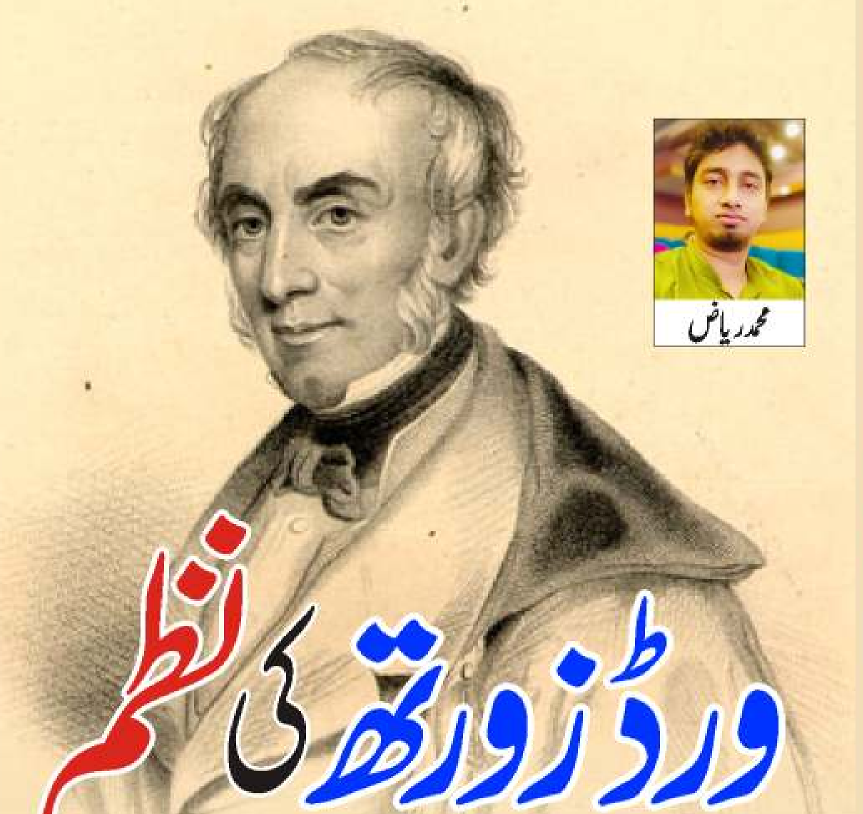

محمد ریاض

ورڈزورتھ کی نظم 'The Rainbow' کے اردو منظوم تراجم کا تنقیدی جائزہ

19ویں صدی کا ابتدائی زمانہ برطانیہ میں انگریزی شاعری کی ترقی اور فروغ کے لحاظ سے بڑا اہم مانا جاتا ہے۔ اس دور کو انگریزی شاعری کے رومانی عہد سے بھی منسوب کیا جاتا ہے جس میں برطانوی انگریزی شاعری کی صحیح معنی میں نشوونما ہو پائی۔ اگر تحریک نشاۃ الثانیہ کے بعد کسی دوسری ادبی تحریک نے انگریزی ادب پر مستحکم، ہمہ گیر اور دیرپا اثرات چھوڑے تو وہ یقیناً رومانی تحریک ہے جو 19ویں صدی کے نصف اول میں پوری طرح سے انگلستان کی فضا پر چھائی رہی۔ یہ ایک ادبی، ثقافتی اور فکری تحریک تھی جو یورپی لوگوں کے خیالات میں رونما ہوئی تبدیلیوں کا نتیجہ تھی۔ دراصل یہ تحریک کلاسیکی روایت اور ہیئت پرستی کے خلاف ایک طرح کی بغاوت تھی جس میں ادب اور زندگی میں نئی قدروں کی بازیافت مضمر تھی۔ خیالات کی یہ تبدیلیاں یورپ کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی انقلابات کی مرہون منت تھی جن میں فرانسیسی انقلاب کا نام خاص ہے۔ کیونکہ اس انقلاب کے بعد یورپی ادبیات کی صورت حال میں زبردست تبدیلی رونمائی ہوئی جس کا اثر انگریزی شعرا پر بھی پڑا اور یہیں سے برطانوی انگریزی شاعری کے نئے دور کا آغاز ہوا جسے رومانی عہد کا نام دیا گیا۔ انگریزی شاعری میں جان کیٹس، پی بی شیلی اور ولیم ورڈزورتھ جیسے شعرا کا تعلق اسی عہد سے رہا۔

18ویں صدی کے اواخر 1798 میں اپنے مجموعۂ کلام "Lyrical Ballads" کے ذریعے رومانیت کی تحریک کو تقویت دینے والے پہلی نسل کے سب سے ممتاز و غیر معمولی رومانی شاعر ولیم ورڈزورتھ کسی بھی لحاظ سے تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ ایک ایسا لافانی شاعر ہے جسے ادبی حلقوں میں آج بھی 'پیغمبر فطرت' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ دراصل 'لیریکل بیلیڈز' ورڈزورتھ اور ایس ٹی کالرج کی نظموں کا ایسا مجموعہ ہے جس کی اشاعت سے انگریزی ادب میں ایک نئے قسم کی جذباتیت پیدا ہوئی۔ اسی مجموعہ میں کالرج کی معروف طویل نظم 'معمّر جہازی' بھی شامل ہے۔ میری تحقیق کے مطابق اس نظم کے اردو میں اب تک دو منظوم تراجم 'بوڑھا جہازراں' کے نام سے بازیافت ہوئے ہیں جن میں پہلا ترجمہ رحم علی الہاشمی کا جبکہ دوسرا ترجمہ شبنم گورکھپوری کا ہے۔ اس مجموعے میں زیادہ ترنظمیں ورڈزورتھ کی شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد یٰسین نے تو اس مجموعۂ کلام کو انگریزی شاعری کی ایک نئی سمت قرار دیا ہے[1] وہیں ڈاکٹر ذکی کاکوروی اپنی ترجمہ شدہ کتاب 'انگریزی ادب کی مختصر تاریخ' میں اس مجموعۂ کلام کے فکری و فنی پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اپنی ذاتی زندگی میں ورڈزورتھ کا پہلا تعارف 'لیریکل بیلیڈز (1798)' سے ہوا جس میں ایس ٹی کالرج نے 'معمر جہازی' کے ساتھ شرکت کی۔ یہ کتاب ایک تجربہ تھی کیونکہ ورڈزورتھ سادہ دیہاتی زندگی کے حادثات پر ایسی زبان میں جو معمولی تقریر کے جملوں سے لی گئی تھی، نظم لکھنا چاہتا تھا۔ کالرج اپنی شاعری کے ذریعے حیرت انگیز موضوعات کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ ورڈزورتھ کی تجرباتی شاعری نیم کامیاب تھی لیکن 'میکائل' میں اس نے دکھایا کہ ایک گڈریے اور اس کے بیٹے کے المیے کو کس طرح قابل قدر کہانی بنایا جاسکتا ہے۔''[2]

ورڈزورتھ کی ادبی خدمات سے متاثر ہو کر 1843 میں ملکہ وکٹوریہ نے اسے ملک الشعرا کا خطاب عطا کیا تھا۔ اپنی ادبی زندگی میں یوں تو اس نے بہت سی شاہکار نظمیں لکھی ہیں لیکن ایسی نظمیں نسبتاً بہت کم ہیں جنھیں اردو مترجمین نے منظوم تخلیقی پیراہن عطا کیا ہو۔ اردو ادب میں ورڈزورتھ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جس انگریزی شاعر کی نظموں کے اردو میں سب سے زیادہ منظوم تراجم ہوئے ہیں، ورڈزورتھ ان میں سرفہرست ہے۔ وہ شیلی کے بعد دوسرا ایسا شاعر ہے جس کی تقریباً پندرہ نظموں کے منظوم کثیر التراجم ہوئے ہیں۔ ایسی ہی ایک خوبصورت نظم "The Rainbow" ہے جس کے شعری محاسن سے متاثر ہو کر آٹھ مترجمین نے اسے اردو کے سانچے میں پیش کیا ہے[3] اور یہ تمام تراجم 'ساز مغرب' میں شامل ہیں۔

ورڈزورتھ نے اپنی یہ نظم 1802 میں بلا عنوان لکھی تھی۔ کوئی نام نہ ہونے کی وجہ سے اہل زبان نے مذکورہ نظم کے دو عنوان رکھ دیے جس میں پہلا نام تو "The Rainbow" ہے جو کہ اصل نظم کے وجود میں آنے کا بنیادی سبب ہے کیونکہ قوس قزح کو دیکھنے کے بعد ہی شاعر اپنے ایام طفلی کی یادوں میں کھو جاتا ہے جس کے بعد وہ اس نظم کو تخلیق کرتا ہے۔ شاعر نے اس نظم میں نیچر کی خوبصورتی کو بیان کرتے ہوئے انسانی زندگی کے مرحلوں کی حقیقت بیان کی ہے۔ وہیں اس نظم کا دوسرا نام 'مائی ہارٹ لیپس اپ' ہے جو کہ اس نظم کا پہلا مصرعہ ہے۔ دراصل ورڈزورتھ کی بہت سی نظمیں بغیر کسی عنوان کے ہی شائع ہوئی ہیں کیونکہ اس عہد میں نظموں کے عناوین کا کوئی چلن نہیں تھا۔ اس وجہ سے شعرا کی جو نظمیں ہوتی تھیں ان کے مصرعۂ اولیٰ کو ہی نظموں کا عنوان مان لیا جاتا تھا۔ یہ نظم پہلی دفعہ 1807 میں وردزورتھ کے مجموعۂ کلام 'نظمیں: دو جلد' میں شائع ہوئی تھی۔ انگریزی ادب میں یہ نظم اپنی ساخت اور آسان زبان و بیان کی وجہ سے انتہائی

مقبولِ عام کا درجہ رکھتی ہے۔ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس نظم کو مکمل کرنے کے بعد جب ورڈز ورتھ نے 1804 میں اپنی ایک طویل نظم 'قصیدہ حیات جاوید' لکھی تو اس کے آغاز میں مذکورہ نظم کے آخر تین مصرعوں کو بطور ذیلی اقتباس استعمال کیا تا کہ پوری نظم کا بنیادی خیال پڑھنے سے سمجھ میں آسکے۔ واضح رہے کہ ورڈز ورتھ کی دوسری متذکرہ نظم کا بنیادی خیال انہی درج ذیل تین مصرعوں پر مبنی ہے جو کہ نظم "The Rainbow" میں شامل ہیں۔

یہی وہ نظم ہے جس میں ورڈز ورتھ نے دنیا کو ایک ایسا محاورہ "Child is father of the Man" دیا جو آج ضرب المثل کے طور پر خوب استعمال کیا جاتا ہے جس کا مطلب ہے "لوگوں کی شخصیتیں بچپن میں ہی وقوع پذیر ہوتی ہیں اس وجہ سے ایک بالغ شخص میں بھی وہی خصوصیات ہوں گی جو بچپن میں تھیں"، یعنی بچپن میں جو تجربات حاصل ہوتے ہیں ان کی بنیاد پر ہی ایک انسان کا مستقبل تیار ہوتا ہے۔ورڈز ورتھ سے پہلے جان ملٹن بھی 1671 میں اپنی طویل نظم "Paradise Regained" کی چوتھی جلد میں اس کہاوت سے ملتا جلتا مضمون پیش کر چکا ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی انگریزی تخلیقات میں اس کہاوت کو کئی مرتبہ استعمال کیا گیا ہے:

ملٹن کی مذکورہ نظم کو معروف شاعر عیسیٰ چرن صدا 1922 میں 'فردوس بازیافتہ' کے عنوان سے اردو میں پیش کر چکے ہیں جو ساز مغرب کی پانچویں جلد میں شامل ہے۔ بہر حال ورڈز ورتھ کی مذکورہ نظم میں کل نو اشعار ہیں تو آیئے اصل نظم کے مفہوم پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔

اصل نظم میں شاعر کہتا ہے کہ جب میں آسمان میں کسی قوس قزح کو دیکھتا ہوں تو میرا دل خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔بچپن کے یہی تجربات آج جوانی میں بھی میں محسوس کر رہا ہوں یعنی جو حال میرا بچپن میں تھا آج جوانی میں بھی وہی حال ہے۔کل جب میں بڑھاپے کو پہنچ جاؤں گا تب بھی میرا یہی حال ہوگا لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو مجھے خود موت آجائے۔اس کے بعد شاعر کہتا ہے کہ انسان کا بچپن ہی اس کے مستقبل کا آئینہ ہوتا ہے۔آخر میں شاعر کہتا ہے کہ میری خواہش ہے کہ آخر عمر تک میں فطرت کے حسن سے سرشار ہوتا رہوں۔آیئے اب ذرا اس نظم کے کچھ منظوم تراجم پر تنقیدی نظر ڈالتے چلیں:

قوس قزح: سید عبدالولی قادری

آکاش پہ ابھری قوسِ قزح
دل میرا خوشی سے جھوم گیا
طفلی کا یہ ذوق نظارا
جو عہد جوانی میں بھی رہا
پیری میں بھی یہ اے کاش رہے
ورنہ مجھے خود موت آجائے
کردار بشر کا آئینہ
بچپن کا جذبۂ دیرینہ
آئین ہے گردش دوراں کا
بچہ کل باپ انسان کا
پس جب تک میں دنیا میں رہوں
قدرت کے مناظر کو چاہوں[4]

دھنک: ارشد صدیقی

مرا دل فرط مسرت سے اچھل پڑتا ہے
آسماں پر نظر آتی ہے دھنک جب مجھ کو

مرے بچپن کے زمانے میں تھی اس کی یہی شکل
اور اب بھی ہے یہ ویسی ہی کہ جب میں ہوں جواں
عمر آخر میں بھی اس کی یہی صورت ہوگی
اور یہی شکل رہے گی مرجانے کے بعد

طفلی انسان کی فطرت کو جنم دیتی ہے
میری خواہش ہے کہ بندھ جائیں مری عمر کے دن
اسی معصوم محبت کے حسیں رشتے میں
(فطرتاً ہوتی ہے بچے کو جو ماں باپ کے ساتھ)[5]

عاشق فطرت کا ترانہ: عبدالرحمٰن غازی

دل اچھلتا ہے مرا قوس و قزح کو دیکھ کر
یاد آجاتی ہے ایام کہن کی داستاں
کیفیت اس کی یہی تھی عہد طفلی میں مرے
اور جوانی میں مرے اس کا ہے ویسا ہی سماں

اب یہ خواہش ہے کہ گو ہو جاؤں پیری کا اسیر
پر مئے اُلفت کا لذت آشنا یہ دل رہے
ورنہ گر یہ روح فطرت کر گئی پرواز تو
کس لیے یہ جسم پھر مربوط آب و گل رہے

طفلِ ناداں درحقیقت آدمی کی اصل ہے
اس کے ہر اک فعل سے حیوانی فطرت ہے عیاں
اس تن خاکی میں جن جذبات کا ہوگا کمال
ہم کو مل جاتا ہے ان کا شیر خواری میں نشاں

آرزو ہے خواہ باقی زندگی کیسے کٹے
کامرانی سے رہوں یا رہن نومیدی رہوں
ہاں مگر جب تک رہوں دنیا میں پابندِ حیات
زلفِ فطرت کے مسلسل عشق کا قیدی رہوں[6]

قوس قزح: عزیز احمد جلیلی

جھوم اٹھتا ہے مسرت سے مرا دل اس دم
دیکھ لیتا ہے سرِ چرخ دھنک کو جس دم
یہی بچپن میں مرا حال ہوا کرتا تھا
اور جوانی میں بھی ہوتا تھا یہی حال مرا
جب میں بوڑھا ہوں یہی ہو مرے دل کی حالت
ورنہ پھر موت کی یارب مجھے دیدے نصرت
باپ میں بیٹے کی تصویر نظر آتی ہے
آدمی میں یہی تنویر نظر آتی ہے
میری حسرت ہے یہی اور مری خواہش ہے یہی
یاد باری میں مری زندگی گزرے ساری[7]

درج بالا منظوم تراجم کے علاوہ ورڈز ورتھ کی اس نظم کو منظوم شکل میں پیش کرنے والے مترجمین میں دھرم سروپ، مرزا سرفراز علی، حیرت اور رسا ہمدانی کے نام شامل ہیں۔ان تمام ترجموں کو دیکھنے کے بعد یہ کہہ پانا تھوڑا مشکل ضرور ہے کہ کس مترجم نے ورڈز ورتھ کی شاعرانہ خوبیوں کو اپنے ترجمہ میں پوری ذمے داری کے ساتھ ڈھالتے ہوئے اصل نظم کے بنیادی خیال کے ساتھ کہاں تک انصاف کیا ہے۔یقیناً غلطیاں کسی سے بھی ہو سکتی ہیں اور پھر ترجمے کا عمل تو جوئے شیر لانے کے مصداق ہے جہاں فن ترجمہ کے رموز و نکات کا عالم بھی خود کو کامل و مکمل خیال نہیں کر سکتا۔متذکرہ چھ مترجمین نے اپنی منظوم تخلیقات کا عنوان اصل نظم کے موضوعی نام "The Rainbow" کی مناسبت سے 'قوس قزح' رکھا ہے جبکہ ارشد صدیقی نے اپنے ترجمے کے لیے سنسکرت متبادل 'دھنک' کا خوب استعمال کیا ہے جو کہ اصل سے قریب ہے۔صرف عبدالرحمٰن غازی کے ترجمہ کا نام اصل متبادل کے بجائے نظم کے بنیادی خیال پر مبنی ہے۔اصل نظم میں کوئی بھاری یا ثقیل لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے صرف پہلے مصرعہ میں "Leaps up" اور "Behold" ایسے الفاظ ہیں جن کے معنی معلوم ہونے ضروری ہیں۔ لفظ "Leaps up" کے لغوی معنی 'چھلانگ لگانا یا اچھلنا کودنا' کے ہوتے ہیں لیکن شاعر نے یہاں 'خوشی اور مسرت سے جھومنا' کے معنی میں استعمال کیا ہے۔وہیں دوسرا لفظ "Behold" ایک فعل لازم ہے جس کے معنی 'غور سے دیکھنا یا مشاہدہ کرنا' کے ہیں۔چونکہ شاعر کی نظر جس وقت قوس قزح پر پڑتی ہے تو خوشی و مسرت کے عالم میں اس کا دل جھوم اٹھتا ہے۔یہاں شاعر نے قوس قزح کو دیکھنے کے لیے "Behold" کا استعمال کیا ہے کیونکہ قوس قزح سات رنگوں کی ایسی ہلکی سی روشنی ہوتی ہے جس کو دیکھنے کے لیے تیز نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ بنا مشاہدہ کے

وہ آسانی سے نظر نہیں آتی ہے۔ایک تیسری توجہ دینے والی بات اس نظم میں یہ ہے کہ اس کے ساتویں مصرعے میں "Paradox Figure of Speech" کا استعمال کیا گیا ہے۔"Paradox" دراصل ایک اصطلاح ہے جو یونانی زبان کے لفظ "Paradoxa" سے مشتق ہے جس کے معنی ''ناقابل یقین یا توقع کے برخلاف'' کے ہیں۔ایک ایسا متناقض بیان جو بظاہر تو مہمل معلوم ہو لیکن درحقیقت صحیح ہو "Paradox" کہلاتا ہے یعنی ایسا بیان جس میں بیک وقت دو متناقض باتیں کی جائیں جو ناقابل یقین ہوں۔پروفیسر کلیم الدین احمد نے اس لفظ کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے کہ ''ایسا متناقض قول یا بیان جو بظاہر مہمل معلوم ہو لیکن درحقیقت صحیح ہو''8 مثال کے طور پر 1945 میں "Animal Farm" کے نام سے ایک ناول شائع ہوا تھا جسے معروف انگریزی ناول نگار "George Orwell" نے لکھا تھا۔اس ناول میں اس نے ایک قول نقل کیا ہے کہ ''تمام جانور برابر ہیں لیکن کچھ جانور زیادہ برابر ہیں''۔ اب اس جملے میں دو علیحدہ باتیں کی جارہی ہیں۔جب سارے جانور برابر ہیں تو کچھ جانور زیادہ برابر کیسے ہوئے؟ لیکن اگر تھوڑا غور کیا جائے اور اس جملے کے پس منظر پر نظر ڈالی جائے تو سمجھ میں آجائے گا کہ یہاں بھید بھاؤ کی بات کی جارہی ہے۔یعنی سارے جانور تو برابر ہیں لیکن کچھ خاص جانور ہیں جو برابر نہیں ہیں۔بالکل اسی طرح ورڈزورتھ نے بھی اپنی نظم میں ایک متناقض قول "Child is father of the man" کو بیان کیا ہے۔

آیئے اب ذرا مذکورہ الفاظ و اصطلاحات کی روشنی میں منظوم ترجموں پر نظر ڈالیں۔سید عبدالولی قادری نے اس نظم کا منظوم ترجمہ 'قوس قزح' کے نام سے کیا ہے جو کہ ایک آزاد ترجمہ ہے۔قادری اردو زبان کے معروف شاعر و مترجم کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں مقبول ہیں انھوں نے بہت سے انگریزی شعرا کے کلام کو اردو کے قالب میں پیش کیا ہے۔مذکورہ منظوم ترجمے میں بھی انھوں نے ورڈزورتھ کی شاعرانہ خوبیوں کا احاطہ کرتے ہوئے اصل بنیادی خیال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے جس کی وجہ سے ان کا یہ منظوم ترجمہ لسانی و فنی اعتبار سے کامل و مکمل ہے۔قادری نے تفصیل میں نہ جاکر نظم کے اختصار پر خصوصی توجہ مرکوز کی ہے۔اصل نظم کا ترجمہ لفظ بہ لفظ کیا ہے۔لفظ "Leaps up" کے لیے بھی قریب تر متبادل 'جھومنا' کا خوب انتخاب کیا ہے جس سے اصل نظم کے مصرعۂ اولیٰ کی مکمل ترجمانی ہورہی ہے۔پانچویں شعر میں قادری نے بڑے علمی انداز میں مذکورہ متناقض قول کی وضاحت بھی خوب کی ہے۔لکھتے ہیں کہ

آئین ہے گردشِ دوراں کا بچہ کل باپ ہے انساں کا

دوسرا ترجمہ معروف شاعر و مترجم ارشد صدیقی کا 'دھنک' ہے جس کا نام انھوں نے دیگر مترجمین کی روش سے ہٹ کر سنسکرت میں رکھا ہے۔عام طور پر ارشد صاحب نے اپنے بیشتر ترجموں میں لفظیات پر خاص توجہ دی ہے۔ ان کے زیادہ تر منظوم تراجم ادب میں اضافے کا حکم رکھتے ہیں۔ان کے زیادہ تر منظوم تراجم کافی حد تک کامیاب ہیں کیونکہ انھوں نے ان تراجم میں دونوں زبانوں کی لطافت وحلاوت کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔'دھنک' ایک آزاد ترجمہ ہے جس میں ارشد صاحب نے اصل نظم کے بنیادی خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے آسان انداز بیان میں مکمل ترجمہ کردیا ہے۔ان کی اسی شاعرانہ و مترجمانہ صلاحیت کی وجہ سے یہ منظوم ترجمہ فنی و معیاری اعتبار سے کامل و مکمل تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے۔ قادری نے جہاں اصل نظم کے ساتویں مصرعے کو دو مصرعوں میں ترجمہ کیا ہے وہیں ارشد صاحب نے ایک ہی مصرعے میں اپنی بات مکمل کردی۔ملاحظہ فرمائیں۔

طفلی انسان کی فطرت کو جنم دیتی ہے

آیئے اب اس نظم کے تیسرے منظوم ترجمے پر نظر ڈالیں جو عبدالرحمٰن غازی نے 'عاشق فطرت کا ترانہ' کے عنوان سے لکھا ہے۔غازی نے دیگر تمام مترجمین کے خیالات سے ہٹ کر اس نظم کا ترجمہ کیا ہے۔اول تو نظم کا عنوان ہی انھوں نے بڑا منفرد اور اچھوتا رکھا ہے جو اصل نظم کے بنیادی خیال کے عین مطابق ہے۔غازی نے اپنا ترجمہ چار مربع بندوں میں کیا ہے جس کے لیے اس نے اسٹینزا کی ہیئت 'اب ج ب' کی ترتیب قوافی کا استعمال کیا ہے۔انھوں نے یہ ترجمہ اصل کے مطابق تو کیا ہے لیکن لفظی ترجمے سے زیادہ تخلیقی ترجمے پر توجہ دی ہے جس کی وجہ سے ترجمہ میں غیر ضروری طوالت پیدا ہوگئی ہے۔حالانکہ اس طوالت سے ان کی تخلیق میں دلکشی پیدا ہوگئی ہے لیکن لفظی ترجمے کا مقصد بے معنی ہوگیا ہے۔ متناقض قول پر مبنی مصرعے کے ترجمہ میں بھی انھوں نے بڑے پھیلاؤ سے کام لیتے ہوئے چار مصرعوں میں اپنی بات مکمل کی ہے۔یقیناً غازی کے اس ترجمے کے مطالعے کے بعد یہ کہنا کوئی مشکل نہیں کہ یہ ترجمے سے زیادہ تخلیق نظر آتا ہے۔غازی کا یہ منظوم ترجمہ کانپور کے معروف ادبی رسالے 'زمانہ' کے جون 1918 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ چوتھا اور آخری منظوم ترجمہ معروف مترجم عزیز احمد جلیلی کا ہے جو انھوں نے 'قوس قزح' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔جلیلی نے اس نظم کا ترجمہ مثنوی کی ہیئت میں کیا ہے جو کہ ایک پابند ترجمہ ہے۔پورے ترجمہ میں جلیلی نے اختصار کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ اصل خیال کے عین مطابق پوری نظم کو تسلسل کے ساتھ ترجمے کی شکل میں بیان کردیا۔ساتویں مصرعے میں "Paradox" کی اصطلاح کو جس خوبصورت انداز میں جلیلی نے شعری پیکر میں ڈھالا ہے وہ کسی دوسرے مترجم کی تخلیقات میں نظر نہیں آیا۔ملاحظہ فرمائیں۔

باپ میں بیٹے کی تصویر نظر آتی ہے
آدمی میں بھی تنویر نظر آتی ہے

جلیلی نے جس خوبصورت انداز میں اس شعری تخلیق کی ہے وہ ان کی شاعرانہ اور مترجمانہ خوبیوں کی پہچان ہے۔جلیلی اپنے عہد کے مایۂ ناز مترجم ہیں انھوں نے بہت سی انگریزی نثری تخلیقات کا بھی اردو میں کامیاب ترجمہ کیا ہے لیکن بنیادی طور پر انھیں انگریزی شاعری کے تراجم پر عبور حاصل تھا۔ڈاکٹر حسن الدین احمد جلیلی کی مترجمانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''جلیلی کے ترجمے اس اعتبار سے قابل ذکر ہیں کہ ان میں مترجم نے زبان و بیان کے رکھ رکھاؤ اور اس کی خوبیوں کو قائم رکھنے پر زیادہ توجہ دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ترجمہ ہونے کے باوجود ان نظموں کی روانی ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہے جن میں شعریت اور نغمگی کا لطف بھی ہے۔''8

حواشی

1. یٰسین، محمد، انگریزی ادب کی مختصر تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2009، ص 170
2. کاکوروی، ذکی۔انگریزی ادب کی مختصر تاریخ۔اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1985، ص 100-101
3. احمد، حسن الدین۔انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013، ص 375-376
4. احمد، حسن الدین، ساز مغرب، جلد دہم، ولا اکیڈمی، حیدر آباد، 1981، ص 32
5. صدیقی، ارشد: پس عکس خیال، مکتبۂ دانش کدہ، بھوپال، 2000، ص 35-36
6. احمد، حسن الدین۔ساز مغرب، جلد چہارم۔ولا اکیڈمی، حیدر آباد، 1978، ص 321-322
7. احمد، حسن الدین، ساز مغرب، جلد ہفتم، ولا اکیڈمی، حیدر آباد، 1979، ص 89
8. احمد، کلیم الدین، فرہنگ ادبی اصطلاحات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1986، ص 144

■

Mohd Riyaz
2979, First Floor, Shri Shiv Mandir,
KuchaNeelKanth,BehindGolchaCinema
DaryaGanj,NewDelhi-110002
Mob: 9958161814

کشمیر میں فارسی زبان و ادب کی ترویج

گلزار حسین

قدرت نے اپنے دست سخاوت سے وادی کشمیر کو جس خوبصورتی اور رنگینی سے سجایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ بے نظیر وادی جہاں اپنی دلکش رنگینیوں عجیب و غریب قدرتی نظاروں میں بے مثال اور لاجواب ہے وہاں یہ ہزاروں سال سے علم و ادب کا ایک ممتاز مرکز بھی رہی ہے۔ اس زمانے میں یہاں شاردہ وسط ایشیا کی سب سے بڑی تعلیمی و تدریسی درسگاہ تھی۔ اس طرح سے وادی کشمیر قدیم زمانے سے علم و ادب کا گہوارہ رہی ہے۔ وادی میں ایک عرصہ دراز تک ہندو راجاؤں کا راج رہا ہے۔ اس سلسلے کی آخری کڑی راجہ سیہ دیو ہے۔ ان کے عروج و زوال کی طویل تاریخ کے بعد کشمیر میں مسلم بادشاہوں کا راج ہوا اور کشمیر میں فارسی زبان و ادب کی ترویج کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ کشمیر میں مبلغوں کے ساتھ زبان فارسی پہنچی۔ ان مبلغوں کا فیضان تھا اور کچھ اس مٹی کی زرخیزی کہ اہل کشمیر نے زبان عربی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان سیکھنے میں دلچسپی لینا شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے فارسی کا یہ نونہال پودا پھلا پھولا اور بارآور ہوا۔ اس زمانے میں کشمیر کے تخت و تاج کے وارث سلاطین شہ میری تھے۔ سلاطین شہ میری علم و ادب کے بہت بڑے شیدائی تھے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم و فنون میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ سلاطین شہ میری کے عہد کا سب سے اہم واقعہ حضرت میر سید علی ہمدانی کی 1379ء میں مبارک تشریف آوری ہے۔ سید موصوف عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ ان کے ساتھ کشمیر میں سادات اور شیوخ کا ایک کارواں بھی داخل ہوا جنھوں نے کشمیر کو اپنا مستقل وطن بنا کر جگہ جگہ علم و فضل کے مراکز قائم کیے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں فارسی زبان میں درس و تدریس کا عمل بھی شروع ہوا اور سلطان وقت کے بھرپور تعاون کی بدولت سادات اور شیوخ نے کشمیر میں عربی اور فارسی علوم کے بازار کو خوب رونق بخشی۔ یوں تو اس زمانے میں اکثر علما کی قیام گاہیں اور بیشتر مساجد درس و تدریس اور اصلاح و تربیت کے مستقل مرکز ہوا کرتے تھے لیکن سلطان قطب الدین کے زمانے میں سرکاری مدارس کا قیام وجود میں آیا۔ اس طرح سے چند اہم دینی مدارس خاص طور پر مشہور ہوئے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

مدرسۃ القرآن

سلطان قطب الدین نے حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کی فرمائش پر قرآن حکیم کی تعلیم عام کرنے کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کروایا اور اس مدرسے نے وسیع پیمانہ پر علم و ادب اور قرآنی تعلیم سے اہل کشمیر کو روشناس کرایا۔ مشہور بزرگ اور عالم دین ابوالمشائخ شیخ سلیمان کو اس مدرسے کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ شیخ موصوف کو حکومت کی طرف سے امام القرا کا خطاب بھی ملا تھا۔

مدرسہ قطب الدین

سلطان قطب الدین کا عہد کشمیر میں فارسی زبان و ادب اور علوم و فنون کے ارتقا کے آغاز کا زمانہ ہے۔ سلطان نے اپنے نام پر ایک وسیع شہر قطب الدین پورہ آباد کیا تھا جو بعد میں علوم و فنون اور شعر و شاعری کا مرکز بنا۔ انھوں نے اپنے بسائے ہوئے شہر قطب الدین پورہ (سرینگر) میں ایک مدرسے کی تعمیر کروائی تھی جو فارسی علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ سلطان نے اس کے ساتھ ایک ہوسٹل بھی بنوایا تھا جس میں دور دراز کے طلبا اقامت کرتے تھے۔ ان کے لیے حکومت ہی کی طرف سے طعام و قیام اور مصارف تعلیم کا مفت انتظام تھا۔ طلبا سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ اس مدرسے کے پہلے صدر مدرس حاجی محمد قادری تھے جو فارسی کے ایک بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ ان کے کلام سے چند اشعار درج کے جاتے ہیں۔

زیں جہان رفتیم و دل برداشتیم
با جہانیان را جہان بگذاشتیم
ایمنی جستیم از دست اجل
و او ریغا ما غلط پنداشتیم 1

”ہم نے دنیا والوں کے ساتھ دنیا کا انتخاب کیا اور اس جہان سے دل برداشتہ ہو کر گئے، موت ہی اصل میں امن کا دامن تھی، اس لیے موت کے ہاتھوں خلاصی چاہتا ہوں لیکن اس دامن کو ہم نے (یعنی موت کے دامن) غلط سمجھا)“

اس دارالعلوم نے فارسی ادب و شاعری کا ذوق پیدا کرنے میں بھی بنیادی خدمات انجام دیں اس دارالعلوم کے دوسرے صدر مدرس مولانا رضی الدین فائز ہوئے۔ مولانا کے علم و فضل کا بین ثبوت یہ ہے کہ علامہ بابا داؤد خاکی کشمیری جیسے فقیہ اور صوفی عالم اور مولانا شمس الدین پال کشمیری محدث ان کے تلامذہ میں سے تھے۔ جہانگیر کے عہد میں اس منصب پر مولانا جوہر ناتھ کشمیری (شاگرد علامہ حافظ ابن حجر مکی) نے اپنے فرائض انجام دیے۔ اس

دانشگاہ کے اساتذہ میں ملا محسن فانی کشمیری، مولانا عبدالستار، مولانا حاجی شیخ گنائی کشمیری کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔ یہاں کے فارغ التحصیل طلبا میں علامہ بابا داؤد خاکیؒ، ملا طاہر غنی عشائی، محمد زمان اشعی، خواجہ قاسم ترمزی اور مولانا کاؤس کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ دار العلوم صدیوں تک علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ اس مدرسے کے چند فارغ التحصیل طلبا کے فارسی کلام کا نمونہ۔

"بعد حمد خالق و نعت رسول ذو الجلال
با دعای آل و اصحابش بکن گوش ایمقال
دل بر این دنیا منہ کو خالی است و بی بقا
کس نماند و کس نماند جز خدای لایزال

(بابا داؤد خاکی)

"اللہ تعالی کی حمد و ثنا اور رسولؐ کی نعت کے بعد آل رسولؐ اور اصحاب رسول کی دعا کے ساتھ ان کے پیغام کی طرف اپنے کان رکھ، اس دنیا سے دل مت لگاؤ یہ فانی اور ناپائیدار ہے، اس دنیا میں سوا اللہ تعالی ہر شے فنا فی اللہ ہونے والی ہے صرف اور صرف ذات باری باقی رہنے والی ہے۔"

"فراغتی بہ نیشانِ بوریا دارم
مباد راہ در این پیشہ شہر قالین را
کند در ہر قدم فریاد خلخال
کہ حسن گل رُخان پا در رکاب است
با دامن تر شدم بہ مشحر
گفتند در افتاب بنشین
حسن سبزی بہ خط سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگ زمین چون گرفتار شدم"[3]

(ملا غنی کشمیری)

"چٹائی کے نیشان میں بڑی راحت محسوس کرتا ہوں، خدا نہ کرے اس جنگل میں شہر قالین راہ پائے، ہر قدم پر پازیب فریاد کرتی رہتی ہے کہ پھول جیسا چہرہ رکھنے والے حسینوں کا حسن پا بہ رکاب ہے، تر دامنی (گنہگاری) کے ساتھ میدان حشر میں آیا تو مجھ سے کہا دھوپ میں بیٹھ جاؤ، حسن سبز نے خط سبز میں مبتلا کر دیا، جال زمین کے ہمرنگ تھی میں گرفتار ہو گیا"

ملا محمد زمان نافع ملا طاہر غنی کشمیری کے بھائی تھے۔ ان کے کلام سے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

می حرامی بہر قتلم مرحبا می زیبدت
جان ندامی زیبدت سر مزدیامی زیبدت
پیکرت را تار و پود جامہ مسطری کشد
از شمیم گل قبای تہ نمامی زیبدت
می کشی و بازی می پرسی شہید کیستی
این غلط اندازی و بازی بہ مامی زیبدت
ہچو می از پردہ زنبوری جام بلور
چہرہ ساز یہای رنگین از حنا می زیبدت
پیر گشتی نافع اکنون ہالہ سان شب تا سحر
خرمن ماہی در آغوش دو تا می زیبدت [4]

(محمد زمان نافع)

"مجھے قتل کرنے کے لیے ناز سے چل رہے ہو مرحبا زیب دیتا آپ کو، آپ پر جان فدا کرنا زیب دیتا ہے، آپ پر سر کو زحمت قدم پر قربان کرنا زیب دیتا ہے، لباس کا تار و پود آپ کے جسم پر سطر کشی کر رہا ہے، شمیم گل کی تہ نما قبا آپ کو زیب دیتی ہے، قتل کر رہے ہو اور پھر پوچھ رہے ہو کس کے شہید ہو، یہ غلط اندازی اور ہم سے یہ کھیل آپ کو زیب دیتا ہے، شیشے کے جام کے شفاف شراب کی سی یہ رنگین حنا کی چہرہ سازی آپ کو زیب دیتی ہے، نافع! بوڑھے ہو چکے ہو کیا اب ہالہ کی طرح رات سے صبح تک چاند کا خرمن تمہارے کپڑے کی آغوش میں زیب دیتا ہے۔"

مدرسہ عروۃ الوثقیٰ

سلطان قطب الدین کے عہد کے مدارس میں شیخ جمال الدین محدث کی درسگاہ قابل ذکر ہے۔ یہ درس گاہ کشمیر کی علمی تاریخ میں مدرسہ عروۃ الوثقیٰ کے نام سے مشہور ہے لیکن عام بول چال کی زبان میں یہ نام بگڑ کر روٹھ میں بدل گیا ہے۔ سلطان قطب الدین کی وفات کے بعد ان کا بیٹا سلطان سکندر تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کے فرزند ارجمند میر محمد ہمدانیؒ تین سو علما و فضلا کے ساتھ کشمیر میں تشریف فرمائے ہوئے۔ سلطان بھی اُن کا بڑا معتقد تھا۔ سلطان موصوف بہت ہی سخی اور دیندار حکمران تھا۔ اس نے کشمیر میں شیخ الاسلام کی سرپرستی میں ایک مستقل ادارہ قائم کیا اور تمام دینی اور ملکی معاملات میں ان کی طرف رجوع کرتا تھا۔ بچوں کی تعلیم کے لیے مدرسے کھولے اور ہسپتال بنوائے سلطان سکندر کی فیاضی، علم دوستی اور دریا دلی کی شہرت سن کر عراق، خراساں، اور ماوراء النہر سے علما اور دانش مند وارد کشمیر ہوئے۔ ان علما نے جہاں قیام فرمایا وہاں درس و تدریس کی مجلسیں گرم کیں۔ ان میں سید حسین شیرازی، سید جلال الدین بخاری، سید احمد اصفہانی، سید محمد خوارزمی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جامع مدرسہ

سلطان سکندر نے جامع مسجد کے قریب ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ جو جامع مدرسہ کے نام سے موسوم تھا۔ اس مدرسے میں قران اور علوم دینیہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مدرسے کی صدارت سلطان نے میر محمد علی بخاری کو تفویض کی تھی۔ ملا محمد یوسف کشمیری ہمدانی مدرسے میں فلسفے کا درس دیتے تھے۔ ریاضی کی تعلیم ملا صدر الدین کاشی کے سپرد تھی اور مولانا سید حسین منطق اور ماورالطبیعات پڑھاتے تھے۔ ملا محمد افضل بخاری معلم حدیث تھے۔ یہ تمام علوم و فنون فارسی زبان میں پڑھائے جاتے تھے۔

دار العلوم نوشہرہ

سلطان زین العابدین نے نوشہرہ میں بھی ایک دار العلوم کی بنیاد رکھی تھی۔ مولانا کبیر کے علم و فضل اور فیض کو عام کرنے کے مقصد سے سلطان نے یہ مدرسہ کھولا تھا۔ مولانا کبیر مدرسے کے صدر تھے۔ وہ نحو کے جید عالم مانے جاتے تھے اور اسی مدرسے میں درس و تدریس کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ انھوں نے شرح ملاؔ کی تفسیر بھی لکھی تھی۔ مدرسے کے دوسرے اساتذہ میں ملا پارسا، ملا احمد کشمیری، ملا حافظ بغدادی، ملا پارسا بخاری، ملا جلال الدین خوارزمی، میر علی بخاری، اور ملا یوسف راشدی اسم با مسمی قابل ذکر ہیں۔ اس مدرسے میں عربی اور فارسی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اساتذہ نے تصنیف و تالیف کا شغل بھی جاری رکھا جو فارسی ادبیات کی ترویج میں گران قدر ادبی سرمایہ ہے۔ ان اساتذہ میں ملا احمد کشمیری ایک پختہ کار شاعر ہونے کے علاوہ ایک زبردست ادیب بھی تھے۔ ملا احمد کشمیر کے کلام سے چند اشعار بطور نمونہ۔

ز هجر شاہ دل ہوکہ ہست پر خون اسر
جگر ز درد کباب است دیدہ جیجونست
خدائی داند و شاہ جہان و روح شریف
کہ حالت دل درویش بینوا چون است [5]

"بادشاہ کی جدائی کی وجہ سے دل پُر درد اور رگوں کا خون مقید ہو گیا ہے، جگر درد کی وجہ سے بھُن گیا ہے اور آنکھ دریائے جیجون کی طرح پر آب ہے، خدا جانتا ہے بادشاہ جہان کے عزت نفس کو اسی وجہ سے یعنی بادشاہ کی درویشانہ صفت کی وجہ سے دل افسردگی کی حالت اختیار کر گیا ہے۔"

اس مدرسے سے کئی فارغ التحصیل طلبا نے فارسی ادبیات میں گران قدر خدمات انجام دیں اور فارسی زبان کو گسترده کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

ادارہ تراجم دار العلوم

سلطان کا ایک اہم کارنامہ دار الترجمہ کا قیام تھا۔ یہ دار الترجمہ بھی نوشہرہ میں ہی تھا۔ اس دار الترجمہ میں ملا

احمد کشمیری اور دوسرے دار العلوم کے اساتذہ میں بہت سے علما تراجم کی خدمات انجام دیتے تھے۔ سلطان کے دربار اور نظم ونسق کی زبان فارسی تھی اور دارالعلوم میں ذریعہ تعلیم بھی فارسی ہی تھا۔ اس طرح سے جو اساتذہ دارالعلوم نوشہرہ میں مدرسی کے فرائض انجام دیتے تھے وہی اس دارالترجمہ کے کام کو بھی انجام دے رہے تھے۔ اس دارالترجمہ میں عربی اور سنسکرت کی اہم کتابوں سے ترجے فارسی میں کیے گئے تھے۔ علوم وفنون کے درمیان سے زبانوں کے حدود کو ختم کرنے کی سلطان کی یہ بڑی مستحسن کوشش تھی۔ ان دونوں اداروں کی بدولت فارسی زبان و ادبیات خوب پھلی پھولی۔ ان اداروں سے بہت سارے انشا پرداز اور شاعر اور قلم کار پیدا ہوئے جنھوں نے فارسی ادبیات میں گراں قدر خدمات انجام دی۔

مدرسہ طبیہ ودار الشفا

طب کی تعلیم کے لیے بڈشاہ نے ایک مدرسہ طبیہ اور علاج کے لیے دارالشفا بھی قائم کیا تھا۔ بادشاہ زین العابدین کے دربار میں سر برآوردہ طبیب موجود تھے جو مدرسہ طبیہ میں درس بھی دیتے تھے۔ اس مدرسے کے مشہور طبیبوں میں محمد بن احمد بن یوسف بن الیاس کا نام قابل ذکر ہے۔ اس نے طب میں ایک کتاب 'کفایہ مجتہدیہ' تصنیف کی تھی جو عام طور پر 'کفایہ منصوری' کے نام سے مشہور ہے۔

اس مدرسے میں یہ تمام علوم فارسی زبان میں پڑھائے جاتے تھے۔ فارسی زبان میں علوم وفنون کو پھیلانے میں مدرسہ طبیہ نے اہم رول ادا کیا ہے۔

مدرسہ گل خاتون

سلطنت میں علم وفن کی ترقی سے ملکہ اور شہزادیوں کو بھی دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کی بدولت سلطان کی والدہ گل خاتون نے ڈل کے کنارے پکھری بل میں ایک عالی شان مدرسے تعمیر کروایا تھا۔ مورخین نے اس عمارت میں کمروں کی تعداد تین سو ساٹھ بتائی ہے۔ اس عظیم الشان مدرسہ کے انتظامات اور اخراجات کا اندازہ اس کی وسعت سے ہوتا ہے۔ مدرسے کے اخراجات کے لیے ملکھا اور وادی سندھ کے گاؤں بناہام اور لار وقف کیے گئے تھے۔ اس مدرسے کے صدر بابا اسماعیل کبروی مقرر ہوئے تھے۔

مدرسہ درسگاہ علامہ حیدر

ملا حیدر چرخی نے جہانگیر کے عہد میں ایک مدرسہ مزار شعرا کے قریب گوجوارہ میں قائم کیا تھا۔ اس درسگاہ سے عرصے تک تشنگان علم سیراب ہوتے رہے۔ ملا حیدر خود اس مدرسے میں درس دیتے تھے۔ وہ علوم دینیہ اور عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ اس درسگاہ نے فارسی علم و ادب کی اشاعت میں بہت اہم خدمت انجام دی ہیں۔ اس مدرسے کے فارغ التحصیل طلبا نے فارسی علوم وفنون میں بہت ساری تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں ایک بابا داؤد مشکواتیؒ بھی سہر فرست ہیں۔ بابا داؤد مشکواتیؒ نے اسرار الابرار لکھ کر فارسی علوم وفنون کو گران قدر تحفہ دیا ہے۔ جس میں علما، اولیا اور ریشیان کشمیر کے حالات درج ہیں۔ یہ اسی مدرسے کی دین ہے۔

مدرسہ خواجگان نقشبند

اس مدرسے کے بانی خواجہ خاوند محمود نقشبندی ہیں۔ اس مدرسے نے علوم دینی کے ساتھ ساتھ ادبیات فارسی کی ترویج میں ایک اہم رول ادا کیا۔ ملا حقدار بدخشانی اس مدرسے کے صدر تھے۔ خود بھی خواجہ خاوند محمود اس مدرسے میں درس و تدریس کا کام انجام دیتے تھے۔ جب تک خواجہ خاوند محمود کشمیر میں رہے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ طلبا کی ایک بڑی تعداد آپ کے گرد رہتی اور علوم وفنون سے فیضیاب ہوتی تھی۔ ان طلبا میں ابو الفقرا بابا نصیب الدین غازیؒ اور خواجہ نور محمد کلو کلاشپوری قابل ذکر ہیں جنھوں نے آپ کی اور اخوند ملا شاہ بدخشانی کی با اثر صحبت کا فائدہ اٹھایا اور خدمت بابرکت میں حاضر رہ کر تصوف سلوک روحانی معارف و مقامات کی کامل شناخت کا خاصہ پیدا کیا۔ اس کے علاوہ فارسی زبان میں تصنیف بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ بابا نصیب الدین غازی نے فارسی زبان میں ایک ضخیم کتاب تصنیف کی تھی جو فارسی ادبیات میں ایک گران قدر سرمایہ ہے۔ یہ تصنیف بابا غازی کی اسی مدرسے کی دین ہے۔

مدرسہ منصوریہ

عنایت اللہ خان کے دور نظامت میں ایک مدرسہ 'مدرسہ منصوریہ' کے نام سے سرینگر میں قائم ہوا تھا۔ جس کے صدر اخوند ملا سلیمان کلو تھے۔ مدرسے کے اخراجات کے لیے دناگام کا گاؤں وقف کیا گیا تھا۔ اس مدرسے سے بھی کئی تشنگان علم سیراب ہو کر نکلے اور علم وادب اور فارسی زبان کی خدمت کی۔

گوجرواری مدرسہ

یہ مدرسہ اخوند ملا عبیداللہ شہیر نے درس و تدریس کے لیے کھولا تھا۔ اس مدرسے کے اساتذہ میں خود اخوند ملا عبیداللہ شہیر اور ملا عبدالرزاق قابل ذکر ہیں۔ اس مدرسے سے تشنگان علم نے اپنی پیاس بجھائی اور علم وادب اور فارسی زبان کی خدمت انجام دی اس مدرسے سے فارغ التحصیل طلبا میں محمد اعظم دیدہ مری قابل ذکر ہیں۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے فارسی ادبیات کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور کئی ادبی فن پارے تخلیق کیے ہیں جن میں تجرید الطالبین، رسالہ قوائد الرضا، قواعد المشائخ، اشجار الخلد، ثمرات الاشجار، رسائل الاعظم، واقعات کشمیر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان مدارس کے ذریعے نہ صرف فارسی زبان و ادبیات کی ترقی وترویج ہوئی بلکہ سماجی، سیاسی، اقتصادی، اور علمی پیش رفت بھی ہوئی۔ ان مدارس میں فارسی زبان و ادبیات کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم وفنون کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ان علوم وفنون میں نقاشی، خطاطی، علم طب، علم سائنس، علم ریاضی، علم نجوم، علم حیوانات، علم ادویہ، علم حدیث، علم فقہ، فن تعمیر، فن پیپر ماشی، فن چوبکاری، فن حرب چاندی و پیتل، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان علوم و فنون کی گسترش کے لیے سلاطین وقت نے مدارس قائم کیے اور ان مدارس میں زیر تعلیم طلبا کے اخراجات خود حکومت برداشت کرتی تھی۔ سلاطین وقت کے اس علمی رویے سے ہر خاص وعام علم کے نور سے منور ہوئے اور اپنی علمی تشنگی کو سیراب کیا۔ اس طرح سے ان علمی مدارس کی بدولت کشمیر کے علمی خزانے میں چار چاند لگ گئے اور روز بروز فارسی زبان وادبیات اپنی ترقی کی منازل طے کرتی گئی بلکہ زبان وادب کو بھی بتدریج وسعت ملی۔ علمی خدمات کی بدولت کشمیر کو ایران صغیر کے نام سے بھی پکارا جانے لگا۔

حواشی

1 عبدالقادر سروری پروفیسر، کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، ص 35 مطبع شیخ عثمان اینڈ سنز تاجران کتب مدینہ چوک، گاؤ کدل سرینگر، 2012
2 سیدہ رقیہ ڈاکٹر، کشمیر میں فارسی شاعری کی ابتدا و ارتقا مع تاریخ کشمیر (994ھ تک)، ص 237 مطبع شالیمار آرٹ پریس، اشاعت اول 2004
3 خواجہ محمد اعظم دیدہ مری، واقعات کشمیر (ترجمہ مع حواشی وتوضیحات وتعلیقات، شمس الدین احمد پروفیسر)، ناشر جموں اینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سینٹر، سرینگر، طبع اول اپریل 2001، ص 288
4 خواجہ محمد اعظم دیدہ مری، واقعات کشمیر (ترجمہ مع خواشی و توضیحات وتعلیقات، شمس الدین احمد پروفیسر)، ناشر جموں اینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سینٹر، سرینگر، طبع اول اپریل 2001، ص 348
5 عبدالقادر سروری پروفیسر، کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، مطبع شیخ عثمان اینڈ سنز تاجران کتب مدینہ چوک، گاؤ کدل سرینگر، 2012، ص 49

■

Gulzar Hussain
Research Scholar, Dep of Persian
University of Kashmir, Hazratbal
Srinagar- 190006 (J&K)
Mob.: 9622183770

خان محمد رضوان

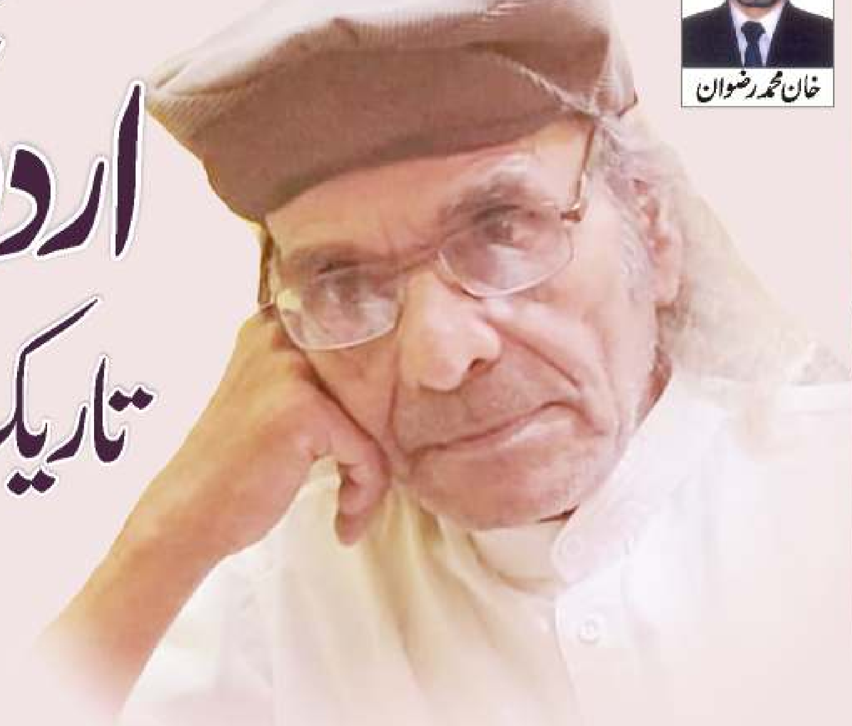

"اردو کا مستقبل تاریک نہیں ہے"

بدنام نظر

رضوان خان: بدنام نظر صاحب آپ اپنے اور والدین کے بارے میں کچھ بتائیے۔

بدنام نظر: میرا اصلی نام عالمگیر نظر ہے۔ سید منظر حسن میرے والد تھے جو کسی اعلیٰ وارفع گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ میں اپنے آپ کو ایک مزدور گھرانے کا فرد تسلیم کرتا ہوں کیونکہ میں نے اپنے باپ کو عمر بھر محنت ومشقت کر کے کماتے کھاتے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بھی پوری عمر محنت مزدوری کر کے گزر بسر کی۔ میرے دادا اپنے زمانے کے پڑھے لکھے انسان تھے اور وہ کھدر پور بنگال کے پورٹ پر (پانی جہاز کے رکنے کی جگہ) قلیوں کے سردار تھے۔ لہٰذا آپ یہ مان لیجیے کہ میں پڑھے لکھے مہذب ایک قلی گھرانے کا چراغ ہوں۔ اس لیے میں خود یہ کہتا ہوں کہ میرا گھرانہ علمی، اقتصادی اور ادبی یا کسی بھی طور پر بڑا نہیں تھا۔ میری والدہ کا نام سیدہ مہر النسا تھا وہ ایک جاگیر دار گھرانے کی خاتون تھیں۔ میری والدہ کے مزاج میں عمر کے آخری حصے تک جاگیر دارانہ نظام کے عناصر موجود رہے۔ انھوں نے ہمیشہ تحکمانہ رویہ روا رکھا ان کا انداز اور برتاؤ بھی تحکمانہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے گھر کے ملازمین کو کبھی بھی برابری کا درجہ نہیں دیا۔ جس کو لے کر والد محترم سے کبھی کبھار کھینچا تانی بھی ہوتی تھی۔ میری ماں کا کمال یہ ہے کہ وہ اردو اور فارسی کی بڑی عالمہ تھیں اور آج میں جو بھی اور جتنا بھی اردو جانتا ہوں اپنی ماں کی ہی وجہ سے جانتا ہوں۔ اردو فارسی اور عربی یعنی قرآن مجید جو بھی جانتا ہوں صرف اور صرف والدہ کی وجہ سے ہی جانتا ہوں۔ مگر آپ کو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ جب میں شاعر ہو چکا تھا اور میری شاعری اہم رسائل میں شائع بھی ہونے لگی تھی، تب تک والدہ میری شاعری میں نقائص نکالا کرتی تھیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا ذوق کس قدر بلا کا بلند تھا۔ اور حقیقت ہے کہ آج میں اپنی والدہ کی ہی وجہ سے اردو زبان جانتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ اگر اماں کے خاندان والے ان کی قدر کرتے تو وہ اردو اور فارسی کی بڑی پروفیسر ہو سکتی تھیں۔

ر خ: بدنام نظر صاحب آپ اپنی پیدائش کے تعلق سے کچھ بتائیں۔

ب ن: صوبہ بہار کا قدیم ضلع مونگیر میں ایک جگہ شیخ پورہ ہے جو کہ اس وقت خود ضلع ہے۔ شیخ پورہ ریلوے اسٹیشن سے تقریباً تین کلو میٹر مشرق کی جانب میرا گاؤں جس کا نام گندہ ہے۔ یہیں میرا ننھیال ہے اور ددھیال بھی۔ یہیں 27 اپریل 1941 کو میری پیدائش ہوئی۔

ر خ: بدنام صاحب آپ اپنی تعلیم کے سلسلے میں قارئین کو کچھ بتائیں

ب ن: میری تعلیم کا سلسلہ اور طرز تعلیم بھی وہی پرانا ہے جو کبھی ہمارے وقت میں ہوا کرتا تھا۔ یعنی مسجد کے مولوی صاحب سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ہوا یہ کہ والد صاحب نے محلے کی مسجد کے مولوی صاحب کے حوالے مجھے کر دیا جہاں قاعدہ بغدادی سے میری تعلیم کا آغاز ہوا۔ معلوم نہیں یہ کتاب اب پڑھائی جاتی بھی ہے یا نہیں۔ چوں کہ بچپن ہی سے میری طبیعت متجسس رہتی تھی جس کی وجہ سے سوالات کرنا میری فطرت بن چکی تھی۔ میں کسی بھی کام کو دباؤ یا زور زبردستی سے کرنے کا قائل نہیں تھا اور نہ ہی روایت پرستی کا قائل تھا یہی وجہ تھی کہ میری طبیعت میں شرارتی عنصر در آگیا تھا۔ ہوا یہ کہ جب قاعدہ بغدادی پڑھاتے وقت مولوی صاحب کہتے کہ الف، ب پڑھنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھو۔ اس کے بعد الف، ب پڑھو۔ مگر میرے ذہن میں یہ بات نہ جانے کیوں اور کیسے بیٹھی ہوئی تھی کہ کیا اگر میں بسم اللہ نہیں پڑھوں گا تب تک مجھے الف، ب یاد نہیں ہوگا؟۔ میرے اس سوال و جواب پر مولوی صاحب نے روایتی کھجور کی چھڑی سے مجھے خوب پیٹا یہی نہیں بلکہ دوران دھنائی غضبناکی کے عالم میں گالیاں بھی دیں۔ گالی سننا تھا کہ میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ میں ایک لمحہ بھی وہاں رکوں اور وہاں سے بھاگ نکلا اور پاس کے ہی ایک مکان کے سائے میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے دونوں ہاتھ میں پتھر لیے مولوی صاحب کے انتظار میں چھپا رہا کہ مولوی صاحب اب آئیں کہ تب آئیں۔ جب وہ ادھر سے گزرے میں

نے انھیں پتھر دے مارا جس سے ان کا چشمہ تو ٹوٹا ہی ان کی دائیں آنکھ بھی تقریباً خراب ہوگئی۔ جس کے بعد محلے میں ہنگامی میٹنگ ہوئی جس میں میرے والد صاحب شریک تھے، مجھے نہیں معلوم کہ اس میٹنگ میں میرے خلاف کیا فیصلہ ہوا مگر ہاں اتنا تو ضرور ہوا کہ مجھے گاؤں سے ہٹا کر کلکتہ بھیج دیا گیا۔ کلکتہ آنے کے بعد نئے سرے سے میری ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا جس میں اردو کے بجائے انگریزی زبان کو جگہ ملی۔ اور میں 'الف سے اللہ کو پہچان'، 'ب سے بڑوں کا کہنا مان' کے بجائے 'ٹونکل ٹونکل لٹل اسٹار' پڑھنے لگا۔ یہاں پانچویں جماعت تک میری تعلیم ہوئی۔ پھر اچانک ایک دن میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا جس میں میرا دایاں پیر ٹوٹ گیا۔ جس کی وجہ سے میں مستقل تین ماہ تک اسکول جانے سے قاصر رہا جس کی بنیاد پر اسکول سے میرا نام اسٹرائیک آف کر دیا گیا اور پھر لامحالہ مجھے دوبارہ گاؤں واپس آنا پڑا۔ اس طرح میرا ایک سال ضائع ہوگیا۔ اس وقت شیخ پورہ میں صرف دو ہائی اسکول تھے ایک اسلامیہ ہائی اسکول دوسرا ڈی ایم ہائی اسکول۔ مگر میرے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ ان دونوں ہائی اسکولوں میں ہندی اور اردو سبجیکٹ تو پڑھائے جاتے تھے مگر انگریزی سبجیکٹ کا کوئی نظم نہیں تھا۔ طرفہ تماشا یہ کہ انگریزی کے علاوہ میں اردو اور ہندی نہیں جانتا تھا۔ ڈی ایم اسکول کے پرنسپل ششی بابو چاہتے تھے کہ میرا داخلہ یہاں ہو جائے، مگر مسئلہ یہی تھا کہ وہاں انگریزی سبجیکٹ کا کوئی نظم نہیں تھا۔ مگر اسلامیہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر خیرات حسین صاحب نے مجھے اس بنیاد پر داخلہ دیا کہ میرے انگریزی سوالات و جوابات کا وہ خود نظم کریں گے۔ اور ہمارے انگریزی پرچے کو وہ چیک بھی کروائیں گے۔ دراصل یہیں سے باضابطہ میری تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہاں کے بعد میں کانپور گیا پھر دوسری اور جگہوں پر بھی گیا۔ کیونکہ اس وقت میرے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں کسی ایک جگہ پر تعلیم حاصل کرسکوں وجہ یہ بھی تھی کہ میرا گھر مفرح الحال نہ تھا۔ اس وجہ سے مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں نے کب تعلیم کے سلسلے کو جاری کیا اور کب منقطع کیا۔ اس طرح میں نے کسی حد تک تعلیم حاصل کر لی

د خ: بدنام صاحب یہ بتائیے کہ آپ نے آخری ڈگری کہاں سے اور کون سی حاصل کی۔

ب ن: آپ کا یہ سوال سراسر غلط ہے کیونکہ میں کل بھی طالب علم تھا اور آج بھی ہوں۔ کیونکہ تعلیم کی کوئی آخری ڈگری ہوتی ہی نہیں ہے۔ اس لیے میں نے ڈگری والی کوئی تعلیم حاصل نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنی کسی ڈگری کو تعلیمی لیاقت کی بنیاد کے لیے شمار نہیں کرتا۔ کیونکہ مجھے جو ڈگریاں ملی ہیں وہ میری صلاحیتوں کے اعتراف میں نہیں ہیں وہ تو صرف مارکس کی ڈگری ہے کہ کس مضمون میں میں نے کتنا نمبر حاصل کیا ہے۔ اسی لیے میں یہ کسی کو نہیں بتاتا کہ میں نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے۔ لہٰذا آپ کو بھی نہیں بتاؤں گا کہ میری آخری ڈگری کون سی ہے۔

د خ: محترم آپ اپنی ملازمت کے سلسلے میں بتائیے۔

ب ن: میں نے پوری عمر ڈگری کی بنیاد پر کوئی ملازمت نہیں کی سوائے ایک کے۔ میری ملازمت جہاں جہاں ہوئی صرف اپنی صلاحیت اور لیاقت کی بنیاد پر ہوئی۔

د خ: بدنام نظر صاحب چونکہ آپ نے عمر کا طویل سفر طے کیا، لہٰذا یہ بتائیں کہ اس سفر میں کن کن قابل قدر شخصیات سے آپ کی ملاقات رہی۔

ب ن: جب میں کلکتے میں تھا تو بیشتر لوگوں سے میرا تعلق رہا، مگر ان میں دو اشخاص میرے بہت قریب اور خاص تھے۔ وکیل اختر اور اختر جاوید۔ دونوں ہی اختر تھے۔ وکیل اختر سے میرا غیر معمولی تعلق کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ آج بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے اندر کہیں سمایا ہوا ہے۔ وکیل اختر کے علاوہ معروف افسانہ نگار تسکین انصاری جنھیں اب کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ مظفر حیدری جو کہ ایک مجذوب شاعر تھے ان سے بھی میرا بہت قریبی تعلق رہا۔ ان میں ایک جرم محمد آبادی تھے مجھے غزل گو شاعر بنانے میں ان کا بھی ہاتھ ہے۔ ورنہ اس سے قبل میں صرف نظمیں ہی لکھتا تھا۔ اس کے علاوہ انیس رفیع اور کامل اختر جو کہ خود بھی شاعر تھے نہیں معلوم اس وقت کہاں ہیں۔ انھیں دوستوں میں ایک فیروز مرزا تھے جو کہ عمدہ اور اچھے تخلیق کار تھے۔ مگر نہیں معلوم کہ یہ سارے لوگ اب کس دنیا میں اور کس حال میں ہیں۔

د خ: بدنام صاحب اتنی طویل گفتگو کے بعد بھی یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ آپ کا اصل میدان کیا ہے۔

ب ن: خان صاحب میں نے اپنا تخلیقی سفر آزاد نظموں سے شروع کیا۔ جب کہ اس وقت آزاد نظمیں لکھنے کی بنیاد پر مجھے کوئی پوچھتا نہیں تھا باوجود اس کے میں مطمئن تھا۔ غالباً 1962 میں میرے ایک دوست راج نارائن تھے انھوں نے مجھ سے کہا کہ یار تم لکھتے ہو مگر یہ کیسے پتہ چلے گا کہ تم جو لکھتے ہو اس کا معیار کیا ہے۔ لہٰذا میں نے یوسف دہلوی کے رسالہ شمع میں اپنی نظم بھیج دی۔ مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب انھوں نے مجھے خط لکھ کر یہ کہا کہ یہ نظم میں شمع میں شائع کروں گا، لہٰذا آپ اسے کہیں اور نہ بھیجیں۔ اس طرح میری پہلی نظم رسالہ شمع میں شائع ہوئی جس کا عنوان 'دیوانہ' تھا۔ اس نظم کے شائع ہونے کے بعد میرا عالم یہ تھا کہ میں اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر سمجھنے لگا تھا اور پھر میں شمع کو بغل میں دبائے گھومتا رہا جیسے اس نظم کے شائع ہونے کے بعد میں غالب سے بھی بڑا شاعر ہوگیا۔ اس کے بعد میں تواتر سے رسائل و جرائد میں شائع ہونے لگا۔ میری تخلیق 'شب خون' میں بھی شائع ہوئی۔ جب کہ اس وقت شب خون میں ہما شما کی تخلیق کا شائع ہونا اپنے آپ میں بہت بڑی بات تھی۔ آپ یقین کیجیے کہ شب خون میں شائع ہوتے ہی میرا اعتماد آسمان چھونے لگا۔ جس کے نتیجے میں اس عہد کے بڑے بڑے ادبا اور شعرا سے الجھتا رہا۔ ان میں اختر اورینوی، سجاد ظہیر اور کلام حیدری جیسے اہم ادبا سے میں کافی دنوں تک الجھا رہا۔ ہماری یہ ادبی بحثیں، حیات، مورچہ اور شاعر میں شائع ہوتی رہیں۔ اس کے بعد ہوا یہ کہ میں شاعر کم ہنگامہ پرور زیادہ ہوگیا۔ جس کی وجہ سے میری کافی شہرت بھی ہوئی۔ اسی اثنا میں (1977) میں میری جان وکیل اختر کا انتقال ہوگیا۔ اس کے انتقال کے غم نے مجھے اندر سے اس قدر توڑ دیا کہ میں 12 جنوری 1972 کو اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر اچانک کلکتہ سے بھاگ گیا۔ بعد میں میرے بچے بہار لوٹ آئے اور میں اس کے غم میں لکھنؤ، ممبئی، چنئی اور کچھ ایسی جگہوں کی خاک چھانتا رہا جہاں کسی بھی شاعر کا نام ونشان تک نہ تھا۔ کچھ عرصے بعد جب مجھے کچھ سکون ملا تو میں اپنے بچوں کو لے کر گیا شہر میں کرائے کے مکان میں رہنے لگا۔ جہاں میں نے ایک ادارہ 'شبستان ادب' قائم کیا۔ جس کے سکریٹری معروف افسانہ نگار عشرت ظہیر تھے۔ شبستان ادب کا ایک ذیلی ادارہ 'الوا' آل لینگویج رائٹر ایسوسی ایشن، تھا جس کے تحت مختلف زبان وادب کے شعرا کو مدعو کیا جاتا اور ان کی تخلیق پر بحثیں ہوتی تھیں۔ یہ سب کچھ ایک چھوٹے سے کمرے میں ہوتا جس میں درجن بھر شعرا اور ادبا شریک ہوتے اور خوب بحثیں ہوتی تھیں۔ اس ادارے سے وابستہ ادب کے افق پر کئی ستارے چمکے ان میں کلپنا سنگھ، خورشید حیات اور فردوس گیاوی قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح شبستان ادب کے بینر تلے جنھیں بین الاقوامی شہرت ملی ان میں عشرت ظہیر، م ق خان، عبدالصمد اور شاہد کلیم خاص ہیں۔ شبستان ادب کے تحت جن اہم ادبا اور شعرا کو مدعو کیا گیا اور ان کی موجودگی میں ان کی تخلیق پر بحثیں ہوئیں ان میں جوگندر پال، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، سلطان اختر، احمد یوسف اور شوکت حیات قابل ذکر ہیں۔ اس ادارے کی جانب سے ہونے والے مباحثے کا طریقہ یہ

ہوتا تھا کہ افسانہ نگار سے ان کا کوئی افسانہ اور شاعر سے ان کا کلام سنا جاتا اور پھر اس پر گھنٹوں گفتگو ہوتی۔ اس طرح کبھی کبھی تو گفتگو کا سلسلہ اتنا طویل ہو جاتا کہ ایک افسانہ اور ایک غزل پر کئی کئی گھنٹے بحث ہوتی۔ کئی دفعہ تو ایسا ہوا کہ صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک بحث ہوتی رہی۔ اس دوران میں بالکل خاموش ہو گیا اور تقریباً اکیس بائیس برسوں تک میں نے ایک مصرع تک نہیں کہا۔ جس کے نتیجے میں ادبی افق سے غائب ہو گیا۔ کلکتے کے ایک معروف ادیب محفوظ صاحب نے اپنے ایک مضمون میں یہاں تک لکھ دیا کہ بدنام نظر کا انتقال ہو گیا اور سبب یہ لکھا کہ وکیل اختر جو کہ ان کے اچھے دوست تھے ان کے انتقال کے بعد کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر جاں بحق ہو گئے جو کہ غلط اطلاع تھی۔ یہ بات تو درست ہے کہ وکیل اختر کو کینسر ہو گیا تھا اور ڈاکٹر نے علاج کے دوران ایک جانچ میں مجھے بھی کینسر کا مریض بتا دیا تھا جو کہ غلط رپورٹ تھی۔ اسی اثنا میں میرے چاہنے والوں نے تعزیتی نشست بھی منعقد کی۔

د خ: بدنام نظر صاحب اب تک ہم یہ نہیں جان سکے کہ شاعری سے آپ کی دلچسپی کا سبب کیا تھا۔

ب ن: دیکھیے رضوان صاحب میں نے ساٹھ کے آس پاس شاعری شروع کی، ذہنی میلان اور طبعی موزونیت نے شعر کہنے کی جانب مائل کیا مگر یہ جان لیجیے کہ وکیل اختر ہی میرا اصل محرک تھا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس کے انتقال کے بعد تو جیسے میرے اندر کا تخلیقی سوتا ہی خشک ہو گیا ہو۔ اور پھر ہوا یہ کہ میں اس جانب سے روگردانی کرنے لگا۔ کیونکہ میرے لیے وکیل اختر ہی سب کچھ تھا۔ اس سے میرا غیر معمولی رشتہ تھا اور جب وہی نہیں رہا تو اس کے بعد میں زندگی سے مایوس سا ہو گیا۔ جیسے زندگی کی ساری رونقیں ماند پڑ گئی ہوں۔

د خ: بدنام نظر صاحب آپ کی اب تک کتنی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

ب ن: دیکھیے میرے تین شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ 1979 میں میرا پہلا نظموں کا مجموعہ 'تہی دست' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے ٹھیک 36 برسوں بعد غزلوں کا مجموعہ 'نزول' کے عنوان سے 2015 میں شائع ہوا۔ پھر اس کے دو برس بعد 2017 میں 'بار گراں' کے عنوان سے نظموں کا مجموعہ شائع ہوا۔ اس کے بعد 1982 میں وکیل اختر کا انتخاب 'دائروں کی شکست' کے نام سے شائع کروایا۔ میں نے اب تک کوئی نثری کام نہیں کیا ہے البتہ میرے چند مضامین ضرور شائع ہوئے ہیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میرا پہلا مضمون 'شب خون' نے 'فیض احمد فیض' پر شائع کیا تھا۔ وہ کوئی خاص اور بہت اہم مضمون نہیں تھا مگر ہاں فیض کی شاعری کے کچھ اچھوتے اور نئے گوشوں کو میں نے ضرور مس کیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مضمون شب خون میں شائع ہوا۔ ادھر حالیہ برسوں میں میں نے کئی مضامین لکھے ہیں۔

د خ: بدنام صاحب بحیثیت شاعر آپ کو کس شاعر نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

ب ن: سچ پوچھیے تو ساحر لدھیانوی نے مجھے بے حد متاثر کیا، بلکہ میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ مجھے شاعر بنانے میں ساحر کا بڑا ہاتھ ہے۔ ساحر کی شاعری کا دھیما پن اور اس کے اندر کے رومانی انقلاب نے مجھے بہت متاثر کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ذہنی اور نفسیاتی طور پر میں اپنے آپ کو ساحر کے قریب پاتا ہوں۔

د خ: بدنام صاحب اردو کی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتائیے کہ کل اردو کی کیا صورت حال تھی اور آج کیا ہے؟

ب ن: دیکھیے ہمارے عہد میں تقریباً اسکولوں میں اردو کو بحیثیت سبجیکٹ پڑھایا جاتا تھا اور اردو کی کتابیں دستیاب بھی ہوتی تھیں۔ مجھے کہنے دیجیے کہ ہمارے عہد کے ٹیچرس آج کے ٹیچرس کے مقابلے میں پڑھے لکھے اور قابل ہوتے تھے۔ کیونکہ اس وقت کے ٹیچر اس قدر ملٹی لنگول ہوتے تھے کہ جب وہ 'زاویہ حادہ' اور 'زاویہ قائمہ' پڑھاتے تھے تو اس کی ہندی بھی بتاتے تھے کہ اس کو ہندی میں یہ کہتے ہیں۔ میں نے ڈی اے وی اسکول میں دیکھا کہ اس اسکول کے اساتذہ نہ ہندو ہوتے تھے، نہ مسلمان بلکہ ان کو صرف پڑھائی سے مطلب ہوتا تھا اور اسی اعتبار سے وہ زبان بھی استعمال کرتے تھے۔ جو ہر کوئی سمجھ لے، میں نے یہی اسلامیہ اسکول میں بھی دیکھا اور قیام کانپور کے دوران بھی میں نے یہی دیکھا۔ دیکھیے رضوان صاحب ہمارے وقت میں اردو کی صورت حال بہت اچھی تھی مگر ایک وقت وہ آیا کہ عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر اور راہی معصوم رضا وغیرہ نے مل کر اردو لپی کے خلاف ایک تحریک چھیڑ دی۔ مگر اس کے خلاف الٰہ آباد میں ایک دستخطی میٹنگ ہوئی اور یہ طے ہوا کہ کسی بھی زبان کی لپی ہی اس کا لباس ہوتی ہے لہٰذا اس کی لپی نہیں بدلی جائے گی۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ یہی وہ وقت تھا جس کے بعد اردو زوال کا شکار ہونے لگی۔ اسی زمانے میں ایک صاحب ہوا کرتے تھے شمس کنول انھوں نے بعض مشکل الفاظ کو آسان کرنے کی جانب پہل کی جیسے لفظ شمع ہے جسے ہم ش م ع کے املا سے لکھتے ہیں مگر ان کا ماننا تھا کہ اس لفظ کو ہم کیوں نہ ش م ع کے بجائے ش م الف سے 'شما' لکھیں۔ تا کہ لکھنے اور پڑھنے والوں کو پریشانی نہ ہو، آسانیاں پیدا ہوں۔ پھر یہ ہوا کہ ان کے کچھ مشورے مان لیے گئے اور کچھ نہیں مانے گئے، مگر ان کے اس عمل پر اگر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ انھوں کچھ مثبت کرنے کی سعی کی ہے۔

د خ: بدنام نظر صاحب یہ بتائیے کہ تقریباً ادبا اور شعرا صحافی بھی ہوتے ہیں تو کیا آپ نے بھی صحافتی خدمات انجام دی ہیں۔

ب ن: جی خان صاحب آپ نے درست فرمایا! سب سے پہلے میں نے جے کمار پالٹ کی سرپرستی میں روزنامہ 'دی بہار ریویو' نکالا۔ جے کمار صاحب اس کے مالک اور کانگریسی لیڈر تھے بعد میں ایم ایل اے بھی ہو گئے تھے۔ مگر اس اخبار کو پڑھ یا دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ یہ کانگریس کا اخبار ہے یا کسی کانگریسی لیڈر کی سرپرستی میں شائع ہو رہا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس وقت کسی بھی اخبار کے پاس ٹیلی پرنٹر نہیں تھا مگر ہمارے پاس تھا۔ اس اخبار کی پیشانی پر وکیل اختر کا ہم یہ شعر ضرور لکھتے تھے۔

جو بھی کرنا ہے وہ کر گزر رو یہ دل کی رائے ہے
سوچنے والا ہمیشہ سوچتا رہ جائے ہے

اس کا انگریزی ایڈیشن ہفت روزہ تھا اس کا بھی مدیر میں ہی تھا۔ یہ اپنے عہد کا شاندار اور اچھا اخبار تھا یہی وجہ تھی کی اس کی کافی شہرت بھی تھی۔ اسی طرح روزنامہ 'اخبار مشرق' سے میں بحیثیت مترجم کے وابستہ تھا مگر اخبار میں میرا نام اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے شائع ہوتا تھا۔ اس طرح ہم نے اپنے صحافی ہونے کا فرض بھی ادا کیا۔ لہٰذا اب مجھے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ میں صحافی نہیں ہوں۔

د خ: بدنام صاحب یہ بتائیے کہ اردو زبان کا مستقبل کتنا روشن اور کتنا تاریک ہے۔

ب ن: خان رضوان صاحب اردو کے مستقبل کے تعلق سے میں بہت خوش فہم نہیں ہوں مگر ہاں اردو کی نئی بستیاں جو بس رہی ہیں ان سے پر امید ضرور ہوں۔ اردو کا مستقبل تاریک بالکل نہیں ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے ہندوستان میں اس کی زمین تنگ ہو جائے یا کر دی جائے مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ اردو کے تعلق سے کچھ لوگ کافی محنت کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ اردو کی نئی بستیاں جو بس رہی ہیں وہ اردو کے تعلق سے ضرور اطمینان بخش کام کریں گی۔

■

Md. Rizwan Khan
D-32, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025(UP)
Mob.: 9810862283

تنویر احمد

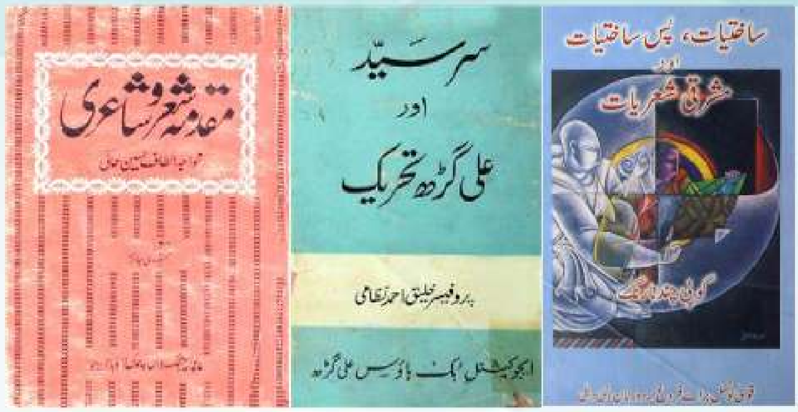

ادبی تحریکات ورجحانات میں اردو تنقید

ادب سماج کا آئینہ ہے اور انسانی سماج مختلف سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلیوں اور انقلابات کی آماجگاہ ہے ہر دور میں سماج کی عکاسی کا بہترین نمونہ اس وقت کے ادبی فن پاروں میں ملتا ہے ایک کامیاب فن پارہ یا حقیقی ادب وہی ادب کہلاتا ہے جو اپنے دور، اپنے عہد کی تہذیب و تمدن کی صحیح عکاسی کرتا ہو۔ جمود و یکسانیت اور تحریکات و انقلابات یہ سب ہماری سماجی سیاسی و ادبی تاریخ کا حصہ ہیں۔ تغیر و تبدل انسانی فطرت میں ہے، انسانی سماج میں جب بھی جمود و یکسانیت نے ڈیرا ڈالا ہے ٹھیک اسی وقت ردعمل کے طور پر جمود و یکسانیت کو مٹاتے ہوئے انقلاب برپا ہوئے ہیں۔ سماج کی یک رنگی اور یکسانیت کو مٹا کر ہمہ رنگی اور حرکت کے عمل تک لانے میں ایک تحریک یا رجحان کارفرما ہوتا ہے۔ تحریک اور رجحان کا زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز، نئے رجحانات، نئی کروٹیں، نئی امنگیں سب تحریک سے ہی وابستہ ہوتے ہیں۔ تحریک و رجحان سماج میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ نئے غور و فکر کو جنم دیتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے تحریک اور رجحان میں فرق واضح کردینا مناسب ہے۔

اصل میں کسی بھی جمود کے ردعمل میں پہلے پہل ایک رجحان بنتا ہے جو دھیرے دھیرے ایک مقصد کے تحت فروغ پاتے ہوئے ایک مکمل تحریک کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

رجحان اور تحریک کا ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ رجحان اکثر نمایاں اور تیز رفتار نہیں ہوتے اس کے برعکس تحریک ہمیشہ تیز و تند ہوتی ہے۔

تحریک ایک واضح مقصد کے تحت باضابطہ ایک سمت میں چلتی ہے جبکہ رجحان کا پہلے سے طے شدہ مقصد نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی واضح سمت ہوتی ہے۔

رجحان کو ہم انفرادیت اور تحریک کو اجتماعیت سے وابستہ کر سکتے ہیں۔

ہمارے یہاں اردو ادب کے فروغ اور ترقی میں مختلف ادبی تحریکات و رجحانات نے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں ادبی تحریکات اور رجحانات کی ایک شاندار روایت رہی ہے۔ خاص طور پر انیسویں صدی کے نصف آخر سے اب تک اردو ادب میں تحریکات و رجحانات کی ایک خوبصورت کڑی نظر آتی ہے جس میں سرسید، رومانیت، ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے رجحانات قابل ذکر ہیں۔ ان تمام تحریکات و رجحانات نے اردو تنقید کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو میں ادبی تنقید کا آغاز ایک بڑی اصلاحی و ادبی تحریک، علی گڑھ تحریک کے زیر سایہ ہوا، اور آگے چل کر سرسید تحریک کے ساتھ ساتھ رومانی رجحان، ترقی پسند تحریک اور پھر جدیدیت اور مابعد جدیدیت میں اردو تنقید خوب فروغ پاتی ہے اور اپنا ادبی وجود بھی قائم کر لیتی ہے۔ آج اردو تنقید کی جو بیل پروان چڑھی ہے اس کی جڑوں کو مختلف ادبی تحریکوں اور رجحانوں نے سینچا ہے۔ مختلف ادبی تحریکات اور رجحانات کے زیر اثر اردو تنقید کی حیات میں جو رنگ بھرے گئے ہیں اور ابھی تک تشنہ لب ہیں انہیں ادبی حلقوں میں روشناس کروانا بہت ضروری ہے۔

اردو ادب میں علی گڑھ تحریک سے قبل بھی ادبی تحریکات و رجحانات کی باضابطہ روایت موجود ہے لیکن ان تحریکات و رجحانات میں اردو تنقید کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے اور ہمیں علی گڑھ تحریک سے قبل اردو تنقید کے چند بکھرے ہوئے بے ربط و بے ضبط نقوش تذکروں، تقریظوں، مشاعروں وغیرہ میں ملتے ہیں۔ میں اپنے اس مضمون میں علی گڑھ تحریک اور اس کے بعد وجود میں آنے والی مختلف تحریکات و رجحانات میں اردو تنقید کی صورت حال پر گفتگو کر رہا ہوں۔ اتنی بات تو ہر خاص و عام جانتا ہے جب کہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد پورا ملک اور خصوصی طور پر مسلمان ظلم کی تاریکی میں اپنی جان و مال کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے تو قدرت کی طرف سے ان ناموافق حالات میں ایک کشادہ ذہن و گہری فہم کا مالک نہایت ہی دور اندیش رہنما قومی خدمت اور ملت کی مدد کو آ پہنچا۔ جسے دنیا سرسید احمد خان کے نام سے جانتی ہے، سرسید 1857 کے بعد پیدا ہونے والے ناقابل بیان جبر و تشدد اور بے بسی و ناکامی کے حالات سے قوم کو باہر نکال کر دوبارہ وقار و عظمت دلانے میں ہمیشہ سرگرداں رہے۔ ہزار اختلاف اپنی جگہ لیکن سرسید نے جس دور میں جس انداز سے قومی خدمت کا انسانی فریضہ ادا کیا اس کی نظیر ملنا بہت مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ سرسید نے قوم کو نا اُمیدی و بے بسی کے دلدل سے تعلیم و تدریس، علم و عمل کے ذریعے نکال کر قومی وقار و عظمت بحال کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ چونکہ 57 کے بعد سرسید کی سرپرستی میں شروع ہونے والی علمی و ادبی

اصلاحی تحریک کا مرکز علی گڑھ کی سرزمین تھی اس لیے سر سید تحریک کو علی گڑھ تحریک بھی کہا جاتا ہے۔ سماج کے تمام تر شعبہ جات کی تعمیر و ترقی کے ساتھ ساتھ اس تحریک کا علم و ادب کے فروغ میں بھی بڑا حصہ ہے۔ جس کی زندہ جاوید مثال آج ہمارے سامنے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ علی گڑھ تحریک نے بے شمار علمی و ادبی اصلاحات سرانجام دے کر قوم کو جدید تعلیم اور علم و ادب کی دولت سے مالا مال کیا۔ خصوصی طور پر اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے ناقابلِ فراموش احسانات ہیں۔ اردو فکشن، اردو شاعری، غیر افسانوی اردو ادب اور بالخصوص اردو تنقید کے جہان میں علی گڑھ تحریک کے زیر سایہ ایک نئی صبح اور نیا سورج طلوع ہوا۔ ابتدائی نقوش کے بعد علی گڑھ تحریک کے دورانیے میں ہی 1880 میں محمد حسین آزاد کے تصنیف کردہ تذکرہ 'آب حیات' میں اردو تنقید کی پو پھوٹتی ہے اور پھر آگے چل کر اسی تحریک کے سائے میں سر سید کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک خواجہ الطاف حسین حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' تصنیف کر کے نہ صرف اردو تنقید کو دماغی شکل عطا کی بلکہ باضابطہ طور پر اردو تنقید کا آغاز بھی کیا، اور اردو تنقید ایک صنف کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔ علی گڑھ تحریک میں اردو تنقید نے نہ صرف باقاعدہ آغاز کیا بلکہ ترقی کے ابتدائی مدارج بھی طے کیے۔ علی گڑھ تحریک میں تنقید کی پرورش کرنے والوں میں دو نام نہایت ہی اہمیت کے حامل ہیں جنھوں نے نظری و عملی تنقید کو اساسی قوت عطا کی۔ میری مراد مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی سے ہے۔ ان دو جلیل القدر بزرگوں کی ہی وجہ سے اردو تنقید نے نظریاتی اور عملی دونوں زاویوں سے اپنا وجود قائم کیا:

''حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک سے پہلے ادبی تنقید صرف ذاتی تاثر کے اظہار تک محدود تھی سر سید کے شعور فن کی پہلی کرن بیدار ہوئی تو انہوں نے ادب کو بھی زندگی کے مماثل قرار دیا اور اس پر نظری اور عملی زاویوں سے تنقید کی۔ چنانچہ سر سید نے تنقید کی کوئی باضابطہ کتاب نہیں لکھی۔ تاہم ان کے رفقا میں سے الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر علی گڑھ تحریک کو بوطیقا مہیا کر دی اور اس کا عملی اطلاق یادگار غالب میں کیا۔ شبلی کے تنقیدی نظریات ان کی متعدد کتابوں میں موجود ہیں۔ اور ان نظریات کی عملی تقلید شعر العجم ہے''

(اردو ادب کی تحریکیں ابتدا تا 1975: ڈاکٹر انور سدید، ص 318)

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ مولانا حالی نے 'مقدمہ شعر و شاعری' لکھ کر اردو تنقید کو اساس فراہم کی۔ مولانا نے مقدمے کے پہلے حصے میں بڑی تفصیل کے ساتھ ادبی فن پاروں کے اصول و ضوابط بیان کیے اور دوسرے حصے میں اپنے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں اصناف ادب پر عملی تنقید کا نمونہ پیش کیا۔ مولانا کی سوانحی تصنیف 'یادگار غالب' میں عملی تنقید کا بہترین نمونہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ حالی نے مقدمہ میں اردو شعریات کے لیے سادگی، اصلیت اور جوش کو لازمی قرار دیا ہے اور فنکار میں وسیع مطالعے، اعلیٰ تخیل اور تفحص الفاظ جیسے اوصاف گنوائے ہیں۔ حالی کے نزدیک فن پارے میں معنی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ حالی کے بعد علی گڑھ تحریک میں تنقید کے حوالے سے دوسرا اہم نام مولانا شبلی نعمانی کا ہے۔ ان کی شاہکار تصانیف 'شعر العجم' اور 'موازنہ انیس و دبیر' اردو تنقید میں نظریاتی اور عملی تنقید کے حوالے سے خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ مولانا شبلی کے نزدیک الفاظ معنی کے مقابلے میں نمایاں اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا شبلی کے یہاں جمالیاتی عنصر نمایاں ہے۔ اردو میں جمالیاتی تنقید کے حوالے سے مولانا شبلی منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ علی گڑھ تحریک کے ہی پرچم تلے تاثراتی تنقید کے رجحان نے واضح شکل و صورت اختیار کی۔ الغرض اردو تنقید جو علی گڑھ تحریک سے قبل عام طور پر تذکروں میں بکھری ملتی تھی وہ اب سر سید تحریک کے دامن میں ایک شاندار اور روشن آغاز کرتے ہوئے اپنا اچھا خاصا ادبی وجود بھی قائم کر لیتی ہے۔ علی گڑھ تحریک میں ادبی منظر نامے پر اصلاح سماج، مقصدیت اور منطقیت و استدلال کے عنصر نمایاں تھے۔ اس تحریک میں سر سید کے سائنٹفک زاویے کے ساتھ ساتھ حالی کی فہم و ادراک اور اصلاح معاشرہ کی ترغیب اور مولانا شبلی کے جمالیاتی نظریہ نقد نے اردو تنقید کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

علی گڑھ تحریک کے بعد اردو ادب میں رومانی رجحان دیکھنے کو ملتا ہے اصل میں علی گڑھ تحریک کی منطقیت اور مقصدیت کے جواب میں رومانیت کا رجحان پروان چڑھتا ہے۔ رومانیت کی بنیادی فکر ادب میں جذبات کے بے ساختہ اظہار، قاری کی اصلاح کے بجائے اس کو مسرت پہنچانا وغیرہ ہے۔ رومانی ادب میں تخیل کی بنیاد پر شاعری کو الہامی و وجدانی کہا گیا ہے اور جذبات کی انتہا رومانیت کی پہچان ہے۔ حالانکہ ہمارے یہاں اردو ادب میں رومانی انداز اور رومانیت کا وجود اختر شیرانی، علامہ اقبال، عبدالقادر سروری اور محمد حسین آزاد کے دور سے ہے لیکن ایک رجحان کی شکل میں رومانیت نے علی گڑھ تحریک کی ٹکر میں فروغ پایا اور پورے اردو ادب کو اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کی اور شاید ایک حد تک وہ مختلف

اردو تنقید جو علی گڑھ تحریک سے قبل عام طور پر تذکروں میں بکھری ملتی تھی وہ اب سر سید تحریک کے دامن میں ایک شاندار اور روشن آغاز کرتے ہوئے اپنا اچھا خاصا ادبی وجود بھی قائم کر لیتی ہے۔ علی گڑھ تحریک میں ادبی منظر نامے پر اصلاح سماج، مقصدیت اور منطقیت و استدلال کے عنصر نمایاں تھے۔ اس تحریک میں سر سید کے سائنٹفک زاویے کے ساتھ ساتھ حالی کی فہم و ادراک اور اصلاح معاشرہ کی ترغیب اور مولانا شبلی کے جمالیاتی نظریہ نقد نے اردو تنقید کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

اصناف ادب پر حاوی بھی رہا لیکن بہت زیادہ عرصے تک نہیں۔ باقی اصناف ادب کے ساتھ ساتھ رومانی رجحان کے دامن میں اردو تنقید کی بھی آبیاری ہوئی۔ چونکہ رومانی ادیب و نقاد تخیل اور جذبات کو اساسی پہلو قرار دے رہے تھے اور یہ ہونا بھی تھا کیونکہ رومانی رجحان کا مقصد ہی اردو ادب کو صرف اور صرف حد سے تجاوز عقلیت پسندی سے آزادی دلانا تھا اس لیے رومانیت کے رجحان میں اردو تنقید کی ایک نئی جہت دیکھنے کو ملتی ہے۔ جسے ہم تخیل، جذبہ اور مسرت سے منسوب کر سکتے ہیں حالانکہ شعر و ادب میں تخیل اور جذبات کی باتیں تو بہت پرانی ہیں، لیکن اردو تنقید کے میدان میں اس پہلو کو رومانی رجحان والوں نے مرکزی اہمیت دی۔ رومانی رجحان میں اردو تنقید نے علی گڑھ تحریک کی عقلیت اور اصلاحی رنگ سے نکل کر احساس و جذبات، سرور و مسرت اور انفرادیت کے رنگ میں خوب ترقی کی۔ رومانیت کے رجحان میں رومانی نقاد کی حیثیت سے سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، عبدالرحمٰن بجنوری، مجنوں گورکھپوری اور مہدی افادی کے نام قابل ذکر ہیں۔ نیاز فتح پوری کی 'انتقادیات'، مہدی افادی کی 'افادات مہدی'، مجنوں گورکھپوری کی 'خیالستان' اور 'تنقیدی حاشیے' وغیرہ اہم تصانیف ہیں۔ یہاں ایک بات ذکر کرتا چلوں کہ اردو ادب میں تاثراتی، رومانی اور جمالیاتی دبستانوں یا ان کے ادبا و شعرا اور ناقدین میں کوئی حتمی اور واضح فرق کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ وقتاً فوقتاً ایک ہی

ادیب یا نقاد ان تمام دبستانوں سے جڑا رہا ہے اس لیے یہاں رومانیت کے رجحان میں ذکر کیے گئے نقاد جمالیاتی اور تاثراتی تنقید میں بھی برابر ذکر ہوتے ہیں۔

علی گڑھ تحریک اور رومانی رجحان کے بعد اردو ادب ایک بڑی انقلابی تحریک ترقی پسند تحریک کے زیر اثر پروان چڑھتا ہے۔ اردو ادب یا ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز 1936 میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والی ترقی پسند تحریک کی پہلی قومی کانفرنس سے ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد کارل مارکس کے نظریات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے دنیا بھر میں سماجی سیاسی معاشی ناانصافی اور نابرابری کے خلاف لڑتے ہوئے سماج کے دبے کچلے مظلوم طبقے کے حقوق کی پاسداری کرنا تھا۔ اس سلسلے میں پیرس میں دنیا بھر کے ادبا و شعرا کی ایک کانفرنس بھی منعقد ہوئی، جس میں مشترکہ طور پر یہ اعلان کیا گیا کہ ادب بھی غیر جانبدار نہیں رہ سکتا اور ادبی فن پاروں میں سماج کے دبے کچلے طبقے کی نمائندگی ضروری ہے۔ اسی دوران ہندوستان کے چند نوجوان جو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بیرون ملک خصوصی طور پر لندن میں مقیم تھے ان کے ذہن بھی جاگ اٹھے اور انھوں نے ہندوستانی سماج و ادب میں بھی ترقی پسند تحریک کی ضرورت کو ناگزیر سمجھتے ہوئے یہاں ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ان نوجوانوں میں ملک راج آنند، سجاد ظہیر، محمد دین تاثیر اور جیوتی گھوش وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پہلے پہل جب انیس سو سینتیس میں سجاد ظہیر اور ان کے چند ساتھیوں کا 'انگارے' نام کا افسانوی مجموعہ شائع ہوا تو اسی وقت انقلابی تحریک کی دستک شروع ہوگئی تھی پھر سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کی انتھک کوششوں سے بالآخر لکھنؤ کے اجلاس سے باضابطہ تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ اس وقت ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں تھا اور یہاں غیور عوام پر ظلم و تشدد کا بازار گرم تھا۔ ایسے ماحول میں انقلابی ترقی پسند تحریک نے عوام میں بہت جلد مضبوط پکڑ بنالی۔ ترقی پسند تحریک کے پہلے ہی اجلاس میں اس کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں ترقی پسند ادبا و شعرا اور دانشوروں نے دوٹوک اعلان کیا کہ اب باقی دنیا کی طرح ہمیں بھی ادبی جمود کو توڑنا ہوگا۔ اور ادبی فن پاروں میں دبے کچلے مظلوم لوگوں کی جانب داری، کسان اور مزدور طبقے کے حقوق کی پاسداری ہمارا واحد مقصد رہے گا۔ کانفرنس میں ایک خاص نظریے (مارکسزم) کے کچھ اہم نکات کی نشاندہی کی گئی جن کی روشنی میں ادب میں سماجیات کی ترجمانی کو اور غیر جانبداری کے بجائے جانبداری کو فوقیت دی جانے لگی۔ یہی وہ نظریہ ہے جسے ترقی پسند مصنفین نے ادب برائے زندگی کہا ہے۔ ترقی پسند تحریک میں اردو ادب کی ایسی کوئی صنف نہیں ہے جو متاثر نہ ہوئی ہو اور کم یا زیادہ ترقی پسند راہ اختیار نہ کی ہو۔ ترقی پسند تحریک اردو ادب کی سب سے زیادہ موثر اور دیرپا تحریک ہے۔ ترقی پسند اردو ادیبوں، شاعروں اور نقادوں نے اپنی تخلیقات اور تحقیق و تنقید میں ایک خاص مقصد اور جانبداری کے عنصر کو نمایاں رکھا یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے دورانیے میں ادبی تخلیقات میں موضوع اور مواد کو مرکزی حیثیت حاصل رہی اور زبان و بیان، اسلوب اور ہیئت وغیرہ حاشیے پر رہے۔ اردو تنقید جو اب تک علی گڑھ تحریک کے دامن میں منطقیت و مقصدیت اور رومانی رجحان میں جمالیاتی اور رومانی لبادہ اوڑھے ہوئے تھی۔ ترقی پسند تحریک میں ایک الگ اور منفرد انداز اختیار کر لیتی ہے:

''اردو تنقید میں ترقی پسند تحریک اور اس کے علمبرداروں نے ایک نئی روح پھونکی، ادب کو ایک نئے زاویہ نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ اور اس کو پرکھنے کے لیے نئے معیار قائم کیے۔ انہوں نے ادب کو سماجی زندگی کی پیداوار سمجھا اور یہ بات ذہن نشین کرائی کہ سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کا بدلنا ضروری ہے اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ادب بھی سماج کو بدلتا ہے گویا وہ اس کے تنقید حیات ہونے کے قائل تھے۔''

(اردو تنقید کا ارتقا: عبادت بریلوی، ص 353)

ترقی پسند تحریک نے اردو تنقید کو وسیع پیمانے پر فروغ دیا۔ کیونکہ ترقی پسند تحریک میں جب ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث چھڑی تو اس بحث میں اردو تنقید کے مختلف دبستان زیر بحث آئے۔ اور یہیں سے ادبی تنقید، ترقی پسند تنقید، جمالیاتی تنقید، نفسیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، عمرانی تنقید حتیٰ کہ اردو تنقید کے تمام دبستانوں اور نظریوں پر تفصیلی بحث کا آغاز ہوا حالانکہ نفسیاتی نظریہ تنقید کا وجود بہت پہلے سے ہے اور ادبی و جمالیاتی پہلو بھی ترقی پسندی کی دین نہیں ہیں بلکہ پہلے سے موجود تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک میں ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کی بحث میں ادبی تنقید کے سارے نظریات و تصورات کی تشکیلِ نو کا سلسلہ شروع ہوا اور اس طرح سے اردو تنقید کے وہ تمام پہلو بھی عیاں ہو گئے جو ابھی تک پردہ خفا میں تھے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ تنقید کے میدان میں ترقی پسند تنقید کا نظریہ تو وجود میں آیا ہی جس کے مطابق یا جس تنقید میں ادب کو جانبدار ہونا اور سماج کی ترجمانی کرنا ہی اصلی ادب مانا گیا۔ اور اسی نظریے کے مطابق ادبی فن پاروں کو فوقیت دی جانے لگی۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ترقی پسند تحریک سے قبل ادب اور زندگی کا کوئی واسطہ ہی نہ تھا بلکہ ادب تو سماج کا ترجمان ہے اور روز اول سے ہی ادب اور زندگی لازم و ملزوم ہیں لیکن ترقی پسند تحریک میں ادب برائے زندگی کی ایک الگ اور نئی تعریف یا تشریح کی گئی، جس میں ایک خاص سیاسی نظریے کا عمل دخل نمایاں تھا اور ترقی پسند نقاد اسی تشریح و توضیح کے مطابق ادب کو پرکھنے و فیصلہ صادر کرنے لگے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے ترقی پسند تحریک میں ادب برائے زندگی کی تشریح اور ترقی پسند تحریک کے اصول و قواعد اور پھر اس وقت کے سماجی منظر نامے کی روشنی میں بالعموم اردو ادب اور بالخصوص اردو تنقید کی ایک نئی دنیا وجود میں آئی:

''ترقی پسند تحریک نے شاعری اور افسانہ نگاری کے علاوہ اردو زبان کے جس شعبے کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ادبی تنقید ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اس تحریک کی بدولت اردو تنقید کو ایک نیا ذہن، ایک نیا مزاج اور ایک منفرد کردار نصیب ہوا۔''

(اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک: خلیل الرحمن اعظمی، ص 243)

ترقی پسند تحریک کے نمائندہ نقادوں میں اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، علی سردار جعفری، احتشام حسین، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، محمد حسن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ایک بڑی تحریک جب بھی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے تو اس کے اختتام کے باوجود طویل عرصے تک اس کے اثرات باقی رہتے ہیں یا اس کی پرورش کردہ فکر کا وجود باقی رہتا ہے یہی معاملہ ترقی پسند تحریک کا ہے انیس سو چھپن کے سالانہ قومی اجلاس کے ساتھ یہ تحریک اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود آج بھی ترقی پسند نقوش، رجحان یا ترقی پسند نظریہ سماج و ادب میں موجود ہے۔

بہرحال ترقی پسند تحریک کے بعد 60 کی دہائی میں شمس الرحمٰن فاروقی کی قیادت میں اردو ادب میں ایک نئی گونج سنائی دی، جسے دنیائے ادب میں جدیدیت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جدیدیت کے حوالے سے گفتگو کو آگے بڑھانے سے قبل اس بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ مغربی جدیدیت اور ہمارے یہاں اردو ادب میں جدیدیت کے رجحان میں ایک واضح فرق ہے۔ مغرب میں جدیدیت روشن خیالی پر قائم تھی اور ترقی پسندی اس کا ایک جوہر تھا۔ جبکہ اردو میں جدیدیت نے اپنی پہچان ترقی پسندی کی ضد کے طور پر کروائی:

''اردو میں جدیدیت ترقی پسندی کی ضد کے طور پر

سامنے آئی جبکہ مغرب کی جدیدیت میں ترقی پسند رویہ ایک اہم عنصر تھا۔اس لیے یہ گمان غالب ہے کہ دنیا میں جدیدیت روشن خیالی کا حصہ تھی اور ترقی پسندی اس کا ایک جوہر تھا۔'' (اردو میں مابعد جدید تنقید: الطاف انجم، ص 62)

خواجہ الطاف حسین حالی کے بعد جدیدیت کے امیر کارواں شمس الرحمٰن فاروقی نے اردو تنقید کو نظری اور عملی دونوں زاویوں سے سنوارنے اور نکھارنے کا کام بحسن خوبی سرانجام دیا۔جدیدیت کے وجود میں آنے کی دو اہم وجوہات ہیں ایک تو ترقی پسند تحریک کی خارجیت، کٹر پسندی، اجتماعیت اور سیاسی یک رخی کے ردعمل میں اس رجحان نے جنم لیا، دوسرے اس وقت کی سماجی صورت حال، کیونکہ یہ دور ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کے ٹھیک بعد کا دور ہے اس لیے تقسیم ملک اور فسادات نے اس وقت کے ادیب و فنکار کو ذات کی اتھاہ گہرائیوں میں رہنے کے لیے مجبور کر دیا۔تقسیم کے خونی کھیل کے بعد جب اردو تخلیق کاروں نے قلم اٹھایا تو انتشار و بحران، تنہائی و تاریکی، سماجی مسائل و مصائب، درد و کرب، بے بسی و بے چارگی، بے کیفی و بے زاری جیسے موضوعات فن پاروں میں سمونے لگے۔انفرادی آزادی، داخلی جمالیات اور متن کی خودمختاری کے عناصر جدیدیت کا خاصہ بنے۔ اس رجحان سے وابستہ تخلیق کاروں نے خارجی حالات و واقعات سے انحراف کر کے انتہائی ذاتی و داخلی موضوعات کو اپنایا اور اسلوب بیان کی سطح پر تجریدی اور علامتی اظہار بیان کو اہمیت دی گئی۔جدیدیت کے زیر سایہ جو تنقیدی نظریات وجود میں آئے وہ بھی انفرادی خودمختاری، داخلی آزادی، لسانی ترتیب اور اسلوب کو فن پارے میں مقدم قرار دیتے ہیں۔جدیدیت میں نمایاں طور پر اپنی شناخت بنانے والے تنقیدی نظریات میں ہیئتی تنقید، نئی تنقید، اسلوبیاتی تنقید وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔جدید تنقید میں شعری فن پاروں میں موزونیت، اجمال، ابہام اور جدلیاتی نظام کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جبکہ نثری تخلیقات میں اساطیری طرز اظہار، علامتی و تمثیلی تحریروں کو فروغ ملا۔ جدیدیت میں اردو تنقید نے فن پارے میں فنکار کی داخلیت، وحدانیت، کلیت پسندی، اساطیری اور استعاراتی اسلوب، ابہام، تجریدیت و آفاقیت وغیرہ کو فوقیت دی۔ جدید نقادوں نے اجتماعیت کے بجائے انفرادیت کو ترجیح دی۔ اس رجحان میں تنقید نے فنکار کے تجربات و احساسات اور طریقہ اظہار کو اساسی اہمیت دی۔ جدیدیت میں اردو تنقید نے گزشتہ تمام مراحل سے آگے بڑھتے ہوئے اپنے دامن کو اور وسیع کر لیا، جدیدیت کے نقادوں نے کلاسیکیت اور تاریخی پہلوؤں پر بھی زور دیا اور ادب کو محض کسی ایک طبقے کی ترجمانی کرنے کی روایت سے باہر نکال کر ادبیت کے پیمانے پر پرکھا۔اس رجحان میں تنقید نے ادب کو پروپیگنڈا بننے سے روک کر اصلی معنوں میں زندگی کی ترجمانی کرنے کی ترغیب دی۔جدیدیت کے معتبر نقادوں میں شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، فہیم اعظمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ان سے پہلی صف کے نقادوں میں کلیم الدین احمد اور آل احمد سرور نے بھی جدیدیت میں پنپنے والے تنقیدی زاویوں کی خوب حوصلہ افزائی کی ہے۔

جدیدیت کے ساتھ ساتھ گوپی چند نارنگ کی قیادت میں مابعد جدیدیت کا رجحان وجود میں آیا اردو تنقید مابعد جدیدیت میں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔اردو میں مابعد جدیدیت کا دور 80 کی دہائی سے شروع ہوتا ہے۔مابعد جدیدیت کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ نہ تو ترقی پسند تحریک کی طرح کسی واضح سیاسی نظریے کی تحریک ہے اور نہ ہی جدیدیت کی طرح کوئی غیر سیاسی رجحان ہے بلکہ یہ ایک ثقافتی صورت حال ہے جو تمام تر نظریات کی حتمیت اور کلیت کو رد کرتی ہے:

اردو تنقید میں ترقی پسند تحریک اور اس کے علمبرداروں نے ایک نئی روح پھونکی،ادب کو ایک نئے زاویہ نظر سے دیکھنا شروع کیا۔اور اس کو پرکھنے کے لیے نئے معیار قائم کیے۔انھوں نے ادب کو سماجی زندگی کی پیداوار سمجھا اور یہ بات ذہن نشین کرائی کہ سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کا بدلنا ضروری ہے اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ادب بھی سماج کو بدلتا ہے گویا وہ اس کے تنقید حیات ہونے کے قائل تھے۔

''مابعد جدیدیت نہ ترقی پسندی کی ضد ہے اور نہ جدیدیت کی اور چونکہ یہ پہلے سے چلے آرہے نظریوں کی ادعایت کو رد کرنا اور طرفوں کو کھولنے والا رویہ ہے، اس کی کوئی بندھی ٹکی فارمولائی تعریف ممکن نہیں ہے۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مابعد جدیدیت ایک کھلا ڈلا ذہنی رویہ ہے تخلیقی آزادی کا۔'' (جدیدیت کے بعد: گوپی چند نارنگ، ص 31)

مابعد جدیدیت کی فکری اساس پس ساختیات، نسوانیت، نئی تاریخیت، تکثیریت، بین المتونیت اور مقامیت جیسے اوصاف پر قائم ہے۔مابعد جدیدیت میں مختلف آئیڈیالوجیکل زاویوں کو مناسب اور نمایاں مقام حاصل ہے۔اس رجحان کا ایک اہم ادبی زاویہ تخلیقیت کی آزادی ہے، حالانکہ یہ نظریہ جدیدیت کے رجحان میں بھی موجود تھا لیکن وہاں پر صرف تخلیق کار کو اپنی داخلیت کے اظہار کی آزادی تھی۔ جبکہ مابعد جدیدیت میں مصنف، متن، قاری، اور قرأت سب کے حوالے سے تخلیقیت کو آزادی حاصل ہے۔ مصنف موضوع اور اسلوب کے حوالے سے، قاری متن کے اخذ معنی کے معاملے میں پوری طرح خودمختار ہے۔قاری اور قرأت کی آزادی کی ہی وجہ سے مابعد جدیدیت میں متن پر متن کی تخلیق کا نظریہ پروان چڑھا۔ مابعد جدیدیت میں جو تنقیدی تصورات ادبی منظر نامے پر نمایاں ہوئے ان میں پس ساختیات، نئی تاریخیت، قاری اساس تنقید، اکتشافی تنقید، تانیثی تنقید اور بین المتونیت قابل ذکر ہیں۔ مابعد جدیدیت نقادوں کے یہاں بین المتونیت کی خاصی اہمیت ہے، وہ صرف فنکار کی ذات کے تعلق سے معنی نہیں دیکھتے بلکہ وہ معنی کی تشکیل میں سماجی، ثقافتی اور تاریخی پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھتے ہیں۔ مابعد جدید تنقید فنکار کی داخلیت کو مناسب حد تک قابل قبول مانتے ہوئے فن پارے کے خارجی عوامل و عناصر پر بھی نظر رکھتی ہے۔ اس رجحان میں قاری اساس تنقیدی نظریے میں قاری کو مرکز بنا کر قرأت کے طور و اقسام اور ادبی متون کی تفہیم میں متن کی قرأت کے ساتھ ساتھ قاری کی اہمیت کو مسلم مانا گیا ہے۔نئی تاریخیت میں فن پارے کے لیے جدید تصورات کے ساتھ اپنے زمانے کا پابند رہنا ضروری ہے۔نئی تاریخیت میں ادب اور تاریخ کے باہمی تعلق پر زور رہتا ہے۔ مابعد جدیدیت میں ادبی تنقید نے اساطیری عناصر اور رومانیت پسندی کے مقابل حقیقت نگاری کو اہمیت دی ہے۔مابعد جدیدیت تنقید فن پارے میں ہر طرح کی طرز فکر کو مناسب فنی وسائل کے ساتھ پیش کرنے کی حامی ہے۔مابعد جدیدیت کے نقاد نہ تو کسی ایک نظریہ تنقید کی قید میں ہیں اور نہ ہی کسی خاص نظریہ کی تردید میں مشغول، بلکہ مابعد جدیدیت نقاد ایک بہترین توازن قائم رکھتے ہوئے ادب کو محض ادبیت کے پیمانے پر پرکھ رہے ہیں۔سیدھی بات یہ ہے کہ اصل حقیقت کا جمالیاتی و فنی دروبست کے ساتھ اظہار مابعد جدیدیت کا خاصہ ہے۔ مابعد جدیدیت کے نقادوں میں گوپی چند نارنگ، حامدی کاشمیری، وہاب اشرفی، ابوالکلام قاسمی، ناصر عباس نیر، قاضی افضال حسین، عتیق اللہ اور قدوس جاوید وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

■

Tanveer Ahmad
Research Scholar, Dept of Urdu
Delhi University
Delhi-1100007
Mob.:6004999352

انور جلال پوری کی شاعری میں قومی یکجہتی

محبوب عالم

ہندوستان دنیا کا ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف دھرم و مذہب کے ماننے والے، مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف رنگ و روپ رکھنے والے لوگ رہتے ہیں۔ ہمارا ملک ہندوستان ایک ایسے گلدستے کی طرح ہے، جس میں رنگ برنگ کے پھول کی طرح مختلف نسل و رنگ کے لوگ ہیں یہ ہندوستان کی خوبصورتی اور اس کی پہچان ہے۔

قومی یکجہتی کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک کے مختلف فرقوں اور علاقوں کے افراد کو ایک کیا جائے تاکہ وہ ایک سیاسی اکائی میں کام کرسکیں۔ یعنی ملک میں بسنے والے تمام افراد اپنے مذہب، علاقے اور تہذیب سے اٹھ کر ملک کی ترقی کے لیے کام کریں یہی قومی یکجہتی کا مقصد اور محور ہے۔

امیر خسرو سے لے کر قلی قطب شاہ اور میر و غالب سے لے کر آج تک کے تمام شاعروں نے اپنی شاعری میں ہندو مسلم اتحاد کو برتا ہے اور اسے خوبصورت انداز میں پیش بھی کیا ہے۔ ہندو مسلم کے مذہبی عقائد، مذہبی تہوار وغیرہ کا ذکر اردو شاعری میں موجود ہے۔ ہندو مسلم اتحاد پر ہمارے شاعروں نے کافی زور دیا ہے۔ اسی کڑی میں جدید دور کے ایک شاعر اور مشاعرے کی دنیا کے مشہور و معروف ناظم جناب انور جلال پوری صاحب ہیں جنھوں نے قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد پر بہت کام کیا ہے۔

ڈاکٹر اسلم الہ آبادی لکھتے ہیں:

"انور جلالپوری کو عہد حاضر کا نظیر اکبر آبادی کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے سماج کے ہر طبقے کو متاثر کیا ہے۔ انھوں نے غزل کے ساتھ نظمیہ شاعری میں نئے نئے تجربے کیے ہیں۔ تیج تیوہاروں کے سلسلے میں بھی ان کے یہاں نظمیں مل جاتی ہیں۔ انور جلالپوری چومکھے شاعر ہیں۔ انھوں نے اردو کی تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔"

اردو ادب کی دنیا میں الگ پہچان اور شناخت رکھنے والے شاعر انور جلال پوری کا اصل نام انوار احمد تھا۔ یہ صوبہ اتر پردیش کے ضلع امبیڈکر نگر کے شہر جلال پور میں 6 جولائی 1947 کو پیدا ہوئے۔ انور جلال پوری عالمی سطح پر ایک ناظم مشاعرہ اور شاعر کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ جلال پور میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گئے اور وہاں انھوں نے ایم اے انگریزی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد اودھ یونیورسٹی فیض آباد سے انھوں نے اردو میں ایم اے کیا۔ علاوہ ازیں انھوں نے ادیب کامل کی بھی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے شاعری کا آغاز 1960 کی دہائی میں کیا اور تقریباً پانچ دہائیوں تک تصنیف و تالیف کا سلسلہ چلتا رہا۔ ان کی تصانیف و تالیف یہ ہیں: کھارے پانیوں کا سلسلہ (1984)، خوشبو کی رشتہ داری (2000)، جاگتی آنکھیں (2008)، روشنائی کے سفیر (2009)، اپنی دھرتی اپنے لوگ (2010)، بعد از خدا (2010)، حرف ابجد (2010)، راہرو سے رہنما تک (2012)، اردو شاعری میں گیتا (2013)، توشۂ آخرت (2013)، قلم کا سفر (2013)، سفیران ادب (2013)، اردو شاعری میں گیتانجلی (2014)، اردو شاعری میں رباعیات خیام (2014)، ادب کے اکشر (2014)، پیار کی سوغات (2016)۔ ان کی وفات 2 جنوری 2018 کو لکھنؤ میں ہوئی۔

انور جلال پوری نے ہندوستان کی ایکتا اور اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے تخلیقی سرمائے کا سہارا لیا اور نظم و نثر کے ذریعے انھوں نے مختلف قوموں میں بھائی چارہ اور میل جول کو بڑھاوا دیا۔ انھوں نے ہندوستان کی آزادی اور اس کی ترقی کے ساتھ قومی یکجہتی کے عناصر کو اپنی نظم و نثر میں پیش کیا ہے۔ 15/اگست کے عنوان سے

انھوں نے نظم لکھی ہے۔جس میں شاعری کی خوبصورتی کے ساتھ ان کی وطن سے محبت موجود ہے۔اس نظم کے اشعار نمونے کے طور پر ملاحظہ ہوں۔

یہ مسکراتی کھیتوں کے کہلاتے دھان
کہ جیسے کمسنی کے وقت سینے کی اٹھان
ہر ایک شے حسین ہے ہر ایک شے جوان
یہ پندرہ اگست ہے کہ رقص کائنات
یہ پندرہ اگست ہے کہ سہاگ رات

انور جلال پوری نے اپنی اس نظم میں یہ بات واضح کی ہے کہ ہمارے اسلاف نے یکجہتی کی اعلیٰ مثال پیش کر کے عوام کے ساتھ مل جل کر آزادی کے لیے جو خواب دیکھا تھا وہ 15/اگست کی شکل میں نمودار ہوا۔ان کی اس نظم میں انگریزوں کے ظلم و جبر کو بیان کیا گیا ہے ساتھ ہی اس نظم میں 15/اگست کی ہندوستانیوں کے لیے جو اہمیت اور وقعت ہے اس کا اظہار ہے۔اس کے اظہار کے لیے انور جلال پوری نے رومان پرور فضا کا انتخاب کیا ہے جس میں شیرینی، سادگی اور سنجیدگی ہے۔جس کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ 15/اگست ایک روشن چراغ کی طرح ہمارے سامنے جل رہا ہے۔اس ضمن کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ صبح اگ رہی ہے یا کوئی کنوارا پن
یہ سج رہا ہے اپنا دیش یا کوئی دلہن
یہ کیٹس کا خیال ہے کہ فکرِ بائرن
نہیں نہیں یہ پندرہ اگست کا شباب ہے
تمام عمر پی کے مست ہو یہ وہ شراب ہے

ان کی شاعری سیاسی وقومی اور انسان دوستی کی بہترین مثال پیش کرتی ہے جس میں ایکتا، اتحاد، بھائی چارے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ہندوستان میں گنگا جمنی تہذیب کو زندہ رکھنے میں اردو نظموں کا بہت بڑا ہاتھ ہے انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔جس میں کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، مجاز لکھنوی اور جوش ملیح آبادی وغیرہ جیسے شاعروں نے اتحاد اور مختلف قوموں کے بھائی چارے پر عمدہ نظمیں تحریر کی ہیں۔ان نظموں سے عوام وخواص بہت متاثر بھی ہوئے ہیں۔اسی کڑی میں انور جلال پوری نے بھی ہم وطنوں کو اپنی نظموں کے ذریعے خوبصورت پیغام دیا ہے جس میں ایکتا ہے، اتحاد ہے۔نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آؤ پھر عہد کریں دیش کی رکچھا کے لیے
آؤ پھر عہد کریں امن و اہنسا کے لیے
آؤ پھر عہد کریں رونقِ دنیا کے لیے
مادرِ ہند کی یکجہتی و ایکتا کے لیے
آؤ طے کرلیں کہ اب جنگ نہ ہونے دیں گے
عرصۂ زیست بشر تنگ نہ ہونے دیں گے

انور جلال پوری نے ملک کی سالمیت اور لوگوں کی کامیابی کے لیے یکجہتی کو ضروری سمجھا اور یہ بتایا ہے کہ عوام کی فلاح و بہبودی اور ملک کی بقا ایکتا ہی میں ہے۔

انور جلال پوری کی نظم و نثر میں قومی یکجہتی کے پیرائے دلکش انداز میں ملتے ہیں۔انھوں نے رویندر ناتھ ٹیگور کی گیتا نجلی کا منظوم ترجمہ کیا ساتھ ہی شریمد بھگوت کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ان کے یہ تراجم ہندو مسلم اتحاد اور بھائی چارے کی ایک کڑی ہے، جو ملک کے دو مذہبی افراد کے درمیان محبت و اتحاد کے پودے کو ہرا بھرا کرنے کی غیر معمولی سعی کرتے ہیں۔انور جلال پوری نے اپنی شاعر میں ہندو مسلم اتحاد کو بڑی خوبصورتی سے پیش بھی کیا ہے۔ان کی شاعری میں قومی یکجہتی، محبت، اخوت اور بھائی چارہ ہے، ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا دھرم نہیں ہے جو انسانیت کا درس نہ دیتا ہو۔ ہر مذہب تمام لوگوں کو آپس میں مل جل کر رہنے کی بات کرتا اور سکھاتا ہے۔ انور جلال پوری کی شاعری میں ہندوستان کی صدیوں پرانی گنگا جمنی تہذیب اور اتحاد وایثار بہترین سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم قومی ایکتا کے راہی ہم کیا جانیں جھگڑا بابا
اپنے دل میں سب کی الفت اپنا سب سے رشتہ بابا
پیار ہی اپنا دین دھرم ہے پیار خدا ہے پیار صنم ہے
دونوں ہی اللہ کے گھر ہیں مسجد ہو کہ شوالہ بابا
ہر انساں میں نور خدا ہے ساری کتابوں میں لکھا ہے
وید ہوں یا انجیل مقدس، ہو قرآن کہ گیتا بابا
مرجانے کے بعد تو سب کا ہوتا ہے انجام ایک سا
دونوں کے ہیں ایک معنی ارتھی ہو کہ جنازہ بابا
ہندو مسلم، سکھ، عیسائی، آپس میں سب بھائی بھائی
ہم جتنے بھارت واسی ہیں سب کا ہے یہ نعرہ بابا

انور جلال پوری کی شاعری میں قومی یکجہتی اور ہندوستانیوں کے میل جول کی بہتات ہے۔انھوں نے اپنی پوری زندگی قومی یکجہتی اور اس کے فروغ میں لگا دیا۔

انور جلال پوری کبھی کبھی ہندوستان کے حالات و واقعات کو دیکھ کر مایوس بھی ہوتے تھے اور کبھی کبھی انھیں یہ خیال بھی آتا تھا کہ ہمارے ملک سے ہندو مسلم اتحاد غائب ہو رہا ہے۔ان کا یہ کہنا تھا کہ ہمارے درمیان اگر یکجہتی رہے گی تو ہم اور ہمارا ملک ترقی کرے گا اور اگر یکجہتی کا فقدان ہوگا تو ملک اور ملک کے تمام افراد کا نقصان ہوگا۔اس ضمن کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہر آدم آپس کا یہ جھگڑا میں بھی سوچوں تو بھی سوچ
کل کیا ہوگا شہر کا نقشہ میں بھی سوچوں تو بھی سوچ
پیار کی شبنم ہر آیت میں، پریم کا امرت ہر اشلوک
پھر کیوں انساں خون کا پیاسا میں بھی سوچوں تو بھی سوچ
ایک خدا کے سب بندے ہیں اک آدم کی سب اولاد
تیرا میرا خون کا رشتہ میں بھی سوچوں تو بھی سوچ
بس اسی انسانیت کو ایک کنبہ جان کر
دوسروں کے دکھ میں بھی آنسو بہانا چاہئے
کاش یہ سمجھیں گھر کو جلانے والے بھی
پیار کا بس اک دیپ جلانا کتنا مشکل ہے

غرض کہ انور جلال پوری کو اس بات کا یقین تھا کہ جو ملک میں محبت اور اتحاد قائم کرنا چاہتے ہیں ان کے راستے میں رکاوٹیں تو بہت آئیں گی لیکن وہ کبھی نہ کبھی ضرور کامیاب ہوں گے۔محبت ایک ایسی چیز ہے جو نفرت پر حاوی ہوجاتی ہے۔ان کا یہ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

تم پیار کی سوغات لیے گھر سے تو نکلو
رستے میں تمہیں کوئی بھی دشمن نہ ملے گا

انور جلال پوری کی زندگی اور ان کی تمام تخلیقات اس بات کی ضامن ہیں کہ وہ قومی ترقی کے ساتھ انسانی ترقی، انسانیت اور بھائی چارہ، اخوت ومحبت، ہمدردی اور اخلاقی اقدار کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ یہ سارے جذبات و خیالات انور جلال پوری کی شاعری اور ان کے ذہنی وفکرو فلسفے کی بنیاد ہیں۔اس لیے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ انور جلال پوری کی شاعری قومی یکجہتی اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے۔

مراجع ومصادر:

1. ڈاکٹر ذاکر حسین، قومی یکجہتی اور اردو شاعری
2. سید مجاور حسین، اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر
3. انور جلال پوری کی شاعری کا اجمالی مطالعہ (مضمون) حبیب ہاشمی، خوشبو کی رشتہ داری
4. سیکولرزم کے مضبوط سپاہی انور جلال پوری (مضمون) شبیہ الحسن نقوی، جدید مرکز لکھنؤ
5. اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب (مرتب) ڈاکٹر کامل قریشی
6. ڈاکٹر اسلم الہ آبادی، انور جلال پوری شخصیت اور ادبی جہات

■

Mahboob Alam
Research Scholar, Dept of Urdu
University of Hyderabad
Hyderabad- 500046 (Telangana)
Mob.:9506713607

موسیٰ کلیم کی غزل گوئی

سعدیہ پروین

”موسیٰ کلیم کی غزلوں میں زندگی سانس لیتی ہوئی دکھائی ہے۔ ان کی غزلوں کے موضوعات میں تنوع ہے، عصری حسیت ہے، طنزیہ رنگ و آہنگ ہے، اسلوب سادہ اور رواں ہے۔ ہم ان کی غزلوں سے نہ صرف محظوظ ہوتے ہیں بلکہ متاثر بھی ہوتے ہیں۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ موسیٰ کلیم عرصہ دراز تک گمنامی کے دبیز پردے میں پڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ارشاد احمد انھیں اپنے تحقیقی ذہن اور تلاش و جستجو کے ذوق سے کھوج منظرِ عام پر لائے۔“

سارن کمشنری ارضِ بہار کا وہ خطہ ہے جہاں سیاست، ادب، ثقافت اور تہذیب وتمدن کی کرنیں سب سے پہلے روشن ہوئیں۔ جہاں سیاست میں مولانا مظہرالحق، ڈاکٹر راجندر پرساد، بابو برج کشور پرساد، ڈاکٹر سید محمود وغیرہ نے قومی سطح پر عوام کی نمائندگی کی، وہیں ادب کی دنیا میں سید اجتبیٰ حسین رضوی، عبداللطیف چھپروی، علامہ جمیل مظہری، رضانقوی واہی، حمید تمنائی، سید صالح حسین شوق اور احمد جمال پاشا نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ سارن کے متعدد فنکاروں نے فلمی دنیا میں بھی نام کمایا اور اس خطے کو قومی سطح پر روشناس کرایا۔ ان میں موسیٰ کلیم، چترگپت، ابوسیوانی، ونئے سنہا، پنکج ترپاٹھی اور اکھیلیندر مشرا نے بہترین کارگردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس علاقے کا نام روشن کرنے میں اہم کردار نبھایا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

موسیٰ کلیم کا تعلق بھی اسی خطے سے ہے۔ انھوں نے 1920 میں موضع چھوٹا تلپا ضلع سارن میں ایک علمی ودینی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد مولوی رسول بخش سرکاری ملازمت کرتے تھے۔ موسیٰ کلیم کے علاوہ ان کے تین لڑکے بالترتیب محمد سالم، محمد سلیم اور محمد اسلم بھی تولد ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام بی بی محرومن تھا۔ وہ سادہ دل، خدا ترس اور مہمان نواز خاتون تھیں۔ موسیٰ کلیم کی ابتدائی تعلیم چھپرہ کے بی سیمیزی ہائی اسکول میں ہوئی۔ بعد ازاں انھوں نے کلکتہ سے 1939 میں انٹرینس کا امتحان پاس کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے چھپرہ کے راجندر کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں ان کا سابقہ ذی علم اور ذی وقار اساتذہ سے ہوا۔ انھوں نے سید احمد جعفری بیخود عظیم آبادی اور سید اجتبیٰ حسین رضوی سے شعروادب کی باریکیاں سیکھیں۔

کچھ دنوں کے بعد 'انگریزو ! بھارت چھوڑو' کی تحریک شروع ہوگئی۔ موسیٰ کلیم نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ حصہ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرنگی حکومت نے انھیں گرفتار کرلیا اور مظفر پور کی جیل میں قید کردیا۔ وہاں قید خانے میں رام برچھ بینی پوری اور دیگر قومی رہنماؤں سے ملاقات ہوئی۔ پہلے سے ہی ان کا ذہن قومی تحریک سے ہم آہنگ تھا۔ جیل جانے کے بعد اس میں اور پختگی آئی۔ انھوں نے ہندی اور بھوجپوری زبانوں میں بھی شاعری شروع کر دی۔ ان کی ہندی شاعری کا بڑا حصہ قومی گیت اور ترانے کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ انھوں نے بنگلہ فلموں سے اپنے کیریئر کی شروعات کی اور عرصہ دراز تک ہندی فلموں میں مختلف طرح کی خدمات انجام دیتے رہے۔ موسیٰ کلیم نے بانیِ برج کشور کنڈر گارٹن اسکول، چھپرہ بابو کپل دیو پرساد سری واستو کی فرمائش پر ہندی زبان میں بچوں کے لیے ایک قومی ترانہ لکھا۔ یہ ترانہ آج بھی اسکول ہذا کے طلبا و طالبات مترنم آواز میں گاتے ہیں۔ بابو مہیندر پرساد نے چھپرہ میں امیچور ڈرامٹک ایسوسی ایشن قائم کیا اور اس کے تحت ہر سال ایک تقریب منعقد ہوتی تھی جس میں موسیٰ کلیم کے طبع زاد ڈرامے اسٹیج ہوتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اس کا نام بدل کر مہیندر رمندر ٹرسٹ رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد مہیندر جینتی منانے کا آغاز ہوا۔

ڈاکٹر راجندر پرساد نے موسیٰ کلیم سے بابو مہیندر پرساد کے لیے ایک قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی۔ موسیٰ کلیم نے مہیندر گان کے نام ایک نظم لکھی جو آج بھی جشن یومِ مہیندر کے موقعے سے مترنم آواز میں گائی جاتی ہے۔ موسیٰ کلیم کی وفات ان کے آبائی مکان میں 29 ستمبر 1995 کو ہوئی اور تکیہ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر ارشاد احمد اپنی کتاب 'موسیٰ کلیم شخص اور شاعری' میں رقم طراز ہیں:

”موسیٰ کلیم کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ ایک جواں مرد مجاہد آزادی، مایہ ناز اور قادر الکلام شاعر، مستند و معتبر ڈراما نگار، عظیم فلمی نغمہ نگار، انعام یافتہ کہانی کار قابل افتخار اسٹیج اداکار اور ماہر موسیقی تھے۔“

(موسیٰ کلیم شخص اور شاعر، ص 24)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی شخصیت کے متعدد پہلو ہیں۔ ڈاکٹر ارشاد احمد نے اپنی کتاب موسیٰ کلیم: شخص اور شاعری میں ان کے حالاتِ زندگی، فلمی خدمات، ڈراما نگاری، غزل گوئی اور مختلف تذکروں میں تذکرہ کے عنوانات سے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے موسیٰ کلیم کے متعلق وافر معلومات جمع کردی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب دستاویزی حیثیت کی حامل ہوگئی ہے۔ لیکن اس مضمون میں دیگر عنوانات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے

صرف موسیٰ کلیم کی غزل گوئی کی انفرادیت اور اختصاص سے بحث کی گئی ہے۔

موسیٰ کلیم: شخص اور شاعری میں ڈاکٹر ارشاد احمد نے ان کی 101 غزلوں کا انتخاب پیش کیا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ یہ غزلیں معنوی وصوری اعتبار سے بہتر ہوں گی۔ ان غزلوں کے عمیق مطالعے کے بعد ذہن میں جو پہلا تاثر ابھرتا ہے وہ ہے وقت شناسی کا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں زمانے کے کھٹے میٹھے واقعات سے جو تجربات حاصل کیے انھیں بڑی جابکدستی اور ہنر مندی سے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ اپنے عزیز واقارب اور زمانے کی شکایت بھی کی ہے تو اس میں تہذیبی سلیقہ مندی ہے، ان کا اخلاق بلند و بالا ہے اور صبر و استقامت کا جذبہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں ان کے خاندانی پس منظر کا دخل وعمل ہو، کیونکہ ان کے جد اعلیٰ شیخ حسین بخش عربی فارسی اور اردو کے جید عالم تھے اور دور دور تک ان کی علمی صلاحیت واہلیت کا شہرہ تھا۔ ان کے والد مولوی رسول بخش بھی عربی اور اردو دونوں زبانوں پر کامل دستگاہ رکھنے والے مذہبی شخص تھے۔ گھر کا ماحول دینی تھا اور ان کے اسلاف کا اخلاق بلند تھا۔ موسیٰ کلیم اسی بلند وبالا اخلاقی ماحول کے پروردہ تھے۔ ان کی غزل گوئی میں یہ عناصر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کس منہ سے بزم غیر میں جاتے ہوائے کلیم
سب جان جائیں گے کہ یہ خانہ خراب ہے

نہ چھوٹے صبر کا دامن نہ چھوٹے
وہ نشتر پھر چبھوتے جا رہے ہیں

شکل وصورت تو بڑی چیز ہے پھر بھی اے کلیم
چاہیے اور بھی کچھ دل میں سمانے کے لیے

یہ بار غم عشق اٹھایا نہیں جاتا
اس تاج کو سر سے بھی گرایا نہیں جاتا

موسیٰ کلیم کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ارشاد احمد لکھتے ہیں۔

''موسیٰ کلیم نے ہم عصر شعرا کی طرح روایت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ جدت پسند ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ انھوں نے زندگی کے تلخ حقائق، معاشرے کی برائیوں اور موقع پرست انسانوں کی فطرت کو فلسفیانہ انداز میں قارئین کے سامنے رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے اشعار سماج کے آئینہ اور معاشرے کے عکس ہیں۔ ان میں معاشرتی تلخیاں ہیں، نا آسودہ تمناؤں کا طوفان ہے اور تگ ودو کرتی زندگی کی کروٹیں ہیں۔''

(موسیٰ کلیم: شخص اور شاعری، ص 56)

مرے خیال سے جینا ہے شرم ان کے لیے
دعا جنھوں نے مصیبت میں موت کی مانگی

میری پامالی پہ ہنستے ہیں جو، ان سے کہہ دو
کل وہی اٹھتا ہے جو آج گرا ہوتا ہے

بگڑی ہوئی ہے دنیا بگڑے ہوئے ہیں لوگ
ایسے میں آپ کرتے ہیں کیا کیا بتائیے

دل میں کینہ لیے جب بھائی ملا کرتے ہیں
ان کے ہی گھر میں طوفان اٹھا کرتے ہیں

موسیٰ کلیم کثیر الجہات فنکار تھے۔ انھوں نے ہندی اور بھوجپوری میں بھی شاعری کی ہے۔ ان کے ہندی کلام کا مجموعہ ''امن کے گیت'' شائع ہو چکا ہے۔ ان کے قومی ترانے یوٹیوب پر چندن تیواری کی آواز میں موجود ہیں۔ ان کی غزلوں کا رنگ وآہنگ بھی قومی اور عوامی ہے لیکن ان میں سطحیت نہیں ہے۔ معنوی اعتبار سے عمدہ ہیں۔ موضوعات میں تنوع ہے اور طرز ادا رواں ہے۔ پختہ کار شاعر و عالم پروفیسر سراج الحق نادر نے ان غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''موسیٰ کلیم کی غزلوں کو دیکھنے کے بعد بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کا کلام اساتذہ کے کلام سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ان کی غزلوں میں جدت کے ساتھ فکر وخیال اور موضوعات کی وسعت پائی جاتی ہے۔ موسیٰ کلیم نے دنیا اور زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا ہے اور جھیلا ہے۔ تبھی تو وہ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

واعظ ڈراتا کیا ہے جہنم کی آگ سے
دنیا سے بڑھ کے اور جہنم بھی ہے کہیں

کسی مظلوم کے دل کی دعا کو مت دعا سمجھو
اسے تم بد دعا سمجھو اسے قہر خدا سمجھو

(مطبوعہ قومی تنظیم، پٹنہ 19 رمئی 21)

غزلوں میں اثر آفرینی پیدا کرنا بھی ہنر مندی ہے۔ اس کے لیے شاعر مختلف صنعتوں، استعاروں اور رواں دواں بحروں کا استعمال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ لفظیات، محاوروں اور تراکیب کا استعمال بھی مناسب و موزوں طریقے سے کرتے ہیں۔ موسیٰ کلیم نے اپنی غزلوں کو پر اثر، پرلطف اور خوبصورت بنانے کے لیے ان تمام عناصر کا مناسب استعمال کیا ہے جو اساتذہ کا طرۂ امتیاز تھا۔ متعدد کتابوں کے مصنف افتخار عظیم چاند نے موسیٰ کلیم کی غزلوں کی خصوصیات درج ذیل لفظوں میں اس طرح کیا ہے:

''موسیٰ کلیم کی غزلوں سے یہ تاثر بخوبی تمام ملتا ہے کہ ان کا کلام مضمون آفرینی کے وصف سے تمام تر آراستہ ہے۔ انھوں نے غزلوں میں مکالمے کی صنعت بھی بخوبی برتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحر میں رواں اشعار نکالنے کا معاملہ ہو یا قافیے کی تلاش میں کامیابی کا معاملہ ہو یا قافیے کی تلاش میں کامیابی کا معاملہ ہو، بہر کیف ان کی غزلیں اپنے قاری کو متوجہ کر لیتی ہیں۔ زبان میں معصومیت، روانی اور سلاست بھی نمایاں ہے۔ طنز، استعارہ ومحاورہ، حر کی تصویر کشی، منظر نگاری، لطیف احساسات کی استعاراتی عکاسی اور اس قسم کی دیگر خوبیاں بھی موسیٰ کلیم کی غزلوں میں روشن ہیں۔ انھوں نے 'غزل' کی ردیف میں بھی ایک نہایت عمدہ غزل کہی ہے''۔

میں نے لکھی تھی کبھی آنکھوں پہ بالوں پہ غزل
آج لکھتا ہوں مگر اپنے ہی حالوں پہ غزل

آج مضمون پھرا کرتے ہیں سڑکوں پہ کلیم
لکھو تم آج کے سارے ہی وبالوں پہ غزل

(موسیٰ کلیم: شخص اور شاعری پر تبصرہ، افتخار عظیم چاند، زبان وادب، مارچ 2022 ص 68)

اسی قبیل کے چند اشعار اور ملاحظہ کریں۔

کچھ تو حضور کہیے میرا قصور کہیے
جو سوچتے ہیں دل میں اس کو ضرور کہیے

خواہشِ روشنی جب بڑھائی گئی
آگ میرے ہی گھر کو لگائی گئی

گیا حال دل میں جو ان کو سنانے
لگے مجھ سے پہلے ہی آنسو بہانے

کلیم میرا فن تو مجھے جانتا ہے
بلا سے کوئی مجھ کو جانے نہ جانے

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ موسیٰ کلیم کی غزلوں میں زندگی سانس لیتی ہوئی دکھائی ہے۔ ان کی غزلوں کے موضوعات میں تنوع ہے، عصری حسیت ہے، طنزیہ رنگ و آہنگ ہے، اسلوب سادہ اور رواں ہے۔ ہم ان کی غزلوں سے نہ صرف محظوظ ہوتے ہیں بلکہ متاثر بھی ہوتے ہیں۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ موسیٰ کلیم عرصہ دراز تک گمنامی کے دبیز پردے میں پڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ارشاد احمد انھیں اپنے تحقیقی ذہن اور تلاش وجستجو کے ذوق سے کھوج منظرِ عام پر لائے۔ یہ کام اہل اردو اور بالخصوص اہل سارن کے لیے باعث افتخار ہے۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل میں موسیٰ کلیم کی ادبی خدمات پر ناقدین کی نظر جائے گی اور اردو ادب میں ان کے مقام ومرتبے کا تعین منصفانہ طور پر ہوگا۔

■

Sadia Parveen
Research Scholar,
JP University
Chapra - 841301 (Bihar)
Mob.:9798953598

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ 'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/ حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/ شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

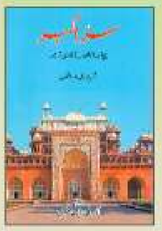

سراکبر (پچاس اپنشدوں کا فارسی ترجمہ)
مصنف: شہزادہ محمد داراشکوہ، مترجم: پروفیسر آزرمی دخت صفوی
صفحات: 566، قیمت: 280 روپے، سنہ اشاعت: 2022
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر سرفراز احمد خان، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ فارسی
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی-لکھنو کیمپس
504 / 122 ٹیگور مارگ ڈالی گنج لکھنو، 226020

زیر نظر کتاب داراشکوہ کی فارسی تصنیف کا اردو قالب ہے جسے پروفیسر آزرمی دخت صفوی صاحبہ نے نہایت خوش اسلوبی اور دقت نظری کے ساتھ انجام دیا ہے۔ کتاب اور ترجمہ دونوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ترجمہ کا فن تخلیق کے فن سے کم دشوار نہیں ہے۔ تخلیق کے لیے ایک زبان کے دریا کا شناور ہونا پڑتا ہے مگر ترجمہ کے لیے مجمع البحرین بننا پڑتا ہے۔ یوں تو فارسی سے سیکڑوں کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئیں لیکن ان سیکڑوں کتابوں میں چند ہی کتابوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ ترجمہ ہونے کے باوجود تخلیق کا لطف دیتی ہیں۔ سراکبر کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ انھوں نے اس ترجمے میں ترجمہ کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اصل فارسی کی خوبصورتی برقرار رکھی ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔

اگر ہم ہندوستانی تناظر میں داراشکوہ کی شخصیت کو دیکھیں تو اسکی شخصیت قومی یکجہتی اور ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کی زبردست علمبردار ہے۔ اکبر اور جہانگیر جیسے دوسرے مغلوں کی طرح داراشکوہ نے ہندو مذہبی فکر کی توحید پسندی کی دھاراؤں کو تلاش کرنے کا انتخاب کیا مثلاً ویدانت کو سمجھنے کی کوشش کی۔ کہتے ہیں کہ داراشکوہ صوفی منش تھا، وہ شہزادے سے زیادہ عالم تھا۔ مغل شہزادہ داراشکوہ شہنشاہ شاہ جہاں کے بہت قریب تھا اور اُس کے اگلے شہنشاہ بننے کے امکانات موجود تھے مگر ایسا ہو نہ سکا۔ اِس کی وجہ اُس کی بدمزاجی، غرور اور جنگی مہارت میں کمزوری تھی۔ اس نے طبیعت بھی اپنے بھائیوں سے کچھ مختلف پائی تھی۔ رفتہ رفتہ دارا وقت کے ساتھ اتنا مضبوط ہوگیا تھا کہ شاہی دربار میں شاہ جہاں کے قریب ہی اپنا تخت بنوا لیا تھا۔ اس نے شہنشاہ کی طرف سے احکامات جاری کرنا شروع کردیے۔ دارا اورنگزیب سے بہت زیادہ خوفزدہ تھا۔ اس نے ایک نہیں کئی بار اورنگزیب کے خلاف احکامات جاری کیے۔ اِس سے اورنگزیب اور دارا کے درمیان دشمنی مزید گہری ہوگئی۔

اس کے برعکس اس کو زندگی کے روحانی پہلوؤں کے ساتھ بھی گہری رغبت رہی اور اسی رغبت کے نتیجے میں دارا نے سفینۃ الاولیا، سکینۃ الاولیا، رسالہ حق نما، حسنات العارفین، دیوان اکسیر اعظم، طریقت الحقیقت، مجمع البحرین، مکالمات بابا لعل یوگی اور سراکبر یا سرالاسرار جیسی شہرہ آفاق کتابیں لکھیں۔ دارا کی تمام تحریروں سے اس کے مزاج، اطوار، خصائل اور فضائل ظاہر ہوتے ہیں۔ قرانی آیات، احادیث، اخبار، روایات، اقوال حق کے اشعار سے شواہد، سند اور ان کے برمحل استعمال، دین ودنیا کی روشنی میں اپنی فکر اور نظریہ سے مطابقت، مماثلت اور پھر پیر ومرشد میاں جی کی زندگی بیان کرتے وقت ان کے کلمات، اقتباسات، اشارات میں اپنی منکسرانہ شخصیت، احوال وافکار اور شخصی تاثرات کا ایک ایک واقعہ، ذکر، ورد، اس کی کیفیت کا روحانی تجزیہ دارا کو ایسے مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں اس سے قبل وبعد کے جید علما ایستادہ ہیں۔

داراشکوہ پہلا شخص تھا جس نے مناظرے اور مجادلے کے دور میں مکالمے کی شروعات کی۔ اس کا کھوجی من اسلام کے پوشیدہ رازوں کو جاننے کا مشتاق رہتا۔ اس کے اسی متلاشی من نے اسے ویدک ادب کا مطالعہ کرایا اور اس نے اسلام اور عیسائیت کا موازنہ بھی کیا۔ وہ مذہبی رواداری، سماجی آہنگی، اتحاد پسندی، باہمی محبت، تنوع میں وحدت اور مخلوط معاشرت اور ثقافت کا قائل تھا۔ اسی وجہ سے اس کی دلچسپی مختلف مذاہب اور تہذیبوں میں تھی۔ وہ صوفیوں، یوگیوں اور الگ الگ مذاہب کے رہنماؤں سے گھرا رہتا تھا۔ 1656 کی شروعات میں اس نے اپنشدوں کا ترجمہ شروع کروایا۔ اس وقت مغلیہ سلطنت کے وارث کے علاوہ یہ کام کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ کسی کے پاس اِس طرح کے وسائل نہیں تھے۔ دارا نے فلسفہ وحدت الوجود کے اصولوں کو ماننا شروع کیا جس کے مطابق تمام مذاہب خالق کی تلاش میں کسی توحید پسند سچائی میں ملتے ہیں بالکل ویسے ہی جیسے ندیاں سمندر میں ملتی ہیں۔ دارا کا ماننا تھا کہ ہندو ویدانتی فلسفہ کے مطالعے سے اسلام کے پوشیدہ راز اس کے سامنے آرہے ہیں۔ جس سے اُسے اتنا خاص علم حاصل ہوگا کہ وہ بغیر کسی چیلنج کے تخت پر جا بیٹھے گا۔

اس کی ان فکری مشقتوں کا مقصد اس کی اپنی روحانی بیداری کو فروغ دینا تھا۔ جس کے ذریعے وہ حتمی فلسفی بادشاہ بن سکتا تھا۔ قرآن میں آیات کا ایک سلسلہ ہے جو ایک چھپی ہوئی کتاب یا 'کتابِ مکنون' کا حوالہ دیتا ہے۔ حالانکہ قرآن کے روایتی ترجمان 'کتابِ مکنون' کی لفظی، ٹھوس کتاب کے طور پر شناخت نہیں کرتے ہیں۔ اِس کے برعکس، داراشکوہ نے سرِّ اکبر (سب سے بڑا راز) میں اعلان کیا ہے کہ اپنشد ہی

'کتاب مکنون' ہے۔ اُس کے جواز کا ایک حصہ 'اپنشد' کو بطور 'خفیہ' حکمت سمجھنے پر منحصر ہے۔

دورِ جدید کے صفِ اول کے ناول نگار قاضی عبدالستار نے اپنے ایک ناول میں دارا کے کردار کو حق پرست، مشترکہ تہذیب کا ترجمان، اکبرِ اعظم کا جانشین اور شعروادب کے معمار کے طور پر پیش کیا ہے۔ بقول قاضی صاحب، ''ساموگڑھ کے سینے میں وہ میزان نصب ہوئی جس کے ایک پلڑے میں روایت تھی اور دوسرے میں دل، ایک طرف سیاست تھی دوسری طرف محبت، ایک طرف فلسفہ' حکمت تو دوسری طرف شعروادب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک طرف تلوار تھی اور دوسری طرف قلم۔''

پروفیسر آزرمی دخت صفوی صاحبہ نے کتاب کے پرمغز مقدمے میں جن عالمانہ خیالات کو پیش کیا ہے اور دارا کی شخصیت اور اقوال و آثار کو جس حسن وخوبی سے قلمبند کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ زیرتبصرہ کتاب کے مقدمے کا روشن پہلو یہ ہے کہ مترجم نے زبان وبیان کے ساتھ ساتھ دارا کے افکار ونظریات کو بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ داراشکوہ کے مقدمے کو اردو زبان میں منتقل کیا گیا ہے جو کہ علمی، ادبی، سماجی، تاریخی اور تنقیدی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دارا نے اپنشد کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں کیوں کیا اور اس امر میں اسے کیا کیا دقتیں پیش آئیں۔

قاری کی آسانی کے لیے سرِاکبر میں دستیاب سنسکرت الفاظ کی فرہنگ مع اردو ترجمہ شامل کتاب ہے جس سے اس کی اہمیت اور افادیت بڑھ گئی ہے۔ اس کے بعد پچاس اپنشدوں کا اردو ترجمہ ہے۔ سرِاکبر کی تفہیم اور بھی فارسی دانشوروں نے کی ہے اور یہ کتاب کئی بار شائع بھی ہو چکی ہے لیکن پروفیسر آزرمی دخت صاحبہ نے ترجمے میں در آئے اصطلاحی، تمثیلی اور ادبی الفاظ اور فقروں کا اور زیادہ آسان اردو زبان میں ترجمہ کرکے اسے آسان سے آسان تر بنادیا ہے۔ زبان وبیان کیلحاظ سے ترجمہ سلیس وسادہ ہے۔

امید ہے کہ یہ ترجمہ نہ صرف داراشکوہ کی سحرانگیز شخصیت کو سمجھنے میں معاون ہوگا بلکہ اس کی دانشوری، ذہن وفکر کی غیرمعمولی وسعت، ہمہ گیری اور آفاقیت کی تعبیر وتفہیم کے سلسلے میں ایک اہم کڑی ثابت ہوگا۔ میں پروفیسر آزرمی دخت صفوی صاحبہ کو اس علمی کارنامے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان (حصہ اوّل)

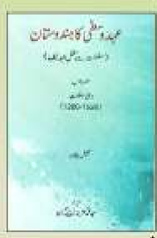

مصنف: ستیش چندر

مترجم: سیّد محمد عزیزالدین حسین

صفحات: 348، قیمت: 170.00 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر رضاءالرحمٰن عاکف میاں، سرائے سنبھل۔ 244302

زیرِتبصرہ کتاب 'عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان' 14/ ابواب پر مشتمل ہے۔ جن کے عنوانات اس طرح ہیں:

(1) دسویں اور بارہویں صدی کے دوران مغربی اور وسطی ایشیا اور ہندوستان کی سمت ترکوں کی پیش رفت (2) دہلی سلطنت کے مقامی الحاق کا قیام (3) مرکزی سلطنت کے قیام کے لیے جدّ وجہد (4) تیرہویں اور چودھویں صدی میں ہندوستان کو منگولوں کا خطرہ (5) دہلی سلطنت کی اندرونی تعمیرنو اور مقامی علاقوں کی وسعت (6) مرکزیت پرمبنی تمام ہندوستان پر حکومت کے مسائل (7) فلاح وبہبود کی بنیاد پر حکومت کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش (8) دہلی سلطنت کے تحت حکومت اور انتظامیہ (9) دہلی سلطنت کے دور میں شمالی ہندوستان کی معاشی اور سماجی زندگی (10) وجے نگر اور بہمنی عہدِ حکومت میں جنوبی ہندوستان میں سیاست، حکومت، معاشرہ اور معاشی حالات (11) ہندوستان کے سمندری علاقوں پر پرتگالیوں کی گرفت اور اس کے معاشی وسیاسی اثرات (12) شمالی ہندوستان میں علاقائی سلطنتیں اور طاقت کے توازن کا نظام (13) دہلی سلطنت دور میں مذہبی اور ثقافتی زندگی (14) سلطنت دور میں ریاست۔

ابواب کی اس تفصیل سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے مندرجات کس قدر اہم معلومات پر مشتمل ہیں۔ ان ابواب کو بھی مزید گوشوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن سے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں باب 9 اور 13 کے ذیلی گوشوں کے عنوانات تحریر کررہا ہوں جس سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

باب 9 کے عنوانات اس طرح ہیں:

(الف) معاشی زندگی

(i) زرعی پیداوار، دیہی معاشرہ اور محاصل کا نظام

(ii) غیرزرعی پیداوار، کپڑے کی صنعت، دھات کا کام، عمارتی صنعت، دوسرے حرفے اور کاغذسازی کی صنعت

(iii) تجارت: (الف) اندرونی تجارت (ب) غیرملکی تجارت

(ج) سماجی زندگی

(i) حکمراں طبقہ (الف) امرا (ب) سردار۔ زمین داروں کا منظرِعام پر آنا

(ii) حکمراں طبقے کے ملحقات، عدالتی اور نچلے درجے پر انتظامیہ کے افسر اور علما

(iii) تاجر اور سرمایہ دار طبقے

(iv) معیارِ زندگی

(v) شہر اور شہری زندگی۔ کاریگر اور غلام

(v) عورتیں، ذات پات، سماجی دستور اور رسم ورواج

باب 13 کے ذیلی گوشوں کے عنوانات بھی ملاحظہ کیجیے:

دہلی سلطنت دور میں مذہبی اور ثقافتی زندگی

(i) طرزِ تعمیر

(ii) مذہبی تصورات اور عقائد

(الف) صوفی تحریک، ابتدا۔ چشتی اور سہروردی سلسلے

(ب) بھکتی تحریک۔ ابتدا۔ شمالی ہندوستان میں بھکتی تحریک کی مقبولیت۔ وشنو تحریک

(iii) ادب اور فنونِ لطیفہ۔ سنسکرت ادب۔ عربی وفارسی ادب علاقائی زبانیں۔ فنونِ لطیفہ (موسیقی)

ان عنوانات سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب محض تاریخی نوعیت کی ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ جدید مغربی اصولوں پر لکھی گئی عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان کی ایسی تاریخ ہے جس میں صرف بادشاہوں، حکمرانوں اور امرا سلطنت کے کوائف و حالات اور فتوحات وسیاسی سطوت کا ذکر وبیان ہی نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اس عہد کے ہندوستان کے تہذیب وتمدن، ثقافت، سیاست، علم وادب، صنعت وحرفت، مذہب وتصوف، سماجی رسم ورواج اور معاشرتی حالات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ ان حکمرانوں کے ان کارناموں کا ذکر اس کتاب میں اس طرح کیا گیا ہے:

''جدید دور کے ایک معروف تاریخ داں محمد حبیب کے قول کے مطابق ہندوستان میں ترک سلطانوں کی حکومت نے یہاں کی سوسائٹی اور معاشی زندگی میں دوررس تبدیلیوں کی راہیں کھول دیں۔ ان کے مطابق نئی ترک سلطنت نے وہ سماجی دھارے

پیدا کردیے جنھوں نے ایک ایسی معاشی تنظیم کو جنم دیا جو اس سے پہلے کی معاشی تنظیم سے بہتر اور اعلیٰ تھی۔ اس کی وجہ سے شہروں کے پھیلنے کے مواقع پیدا ہوئے اور زرعی رشتوں میں اہم تبدیلیوں کی راہیں کھلیں۔'' (کتاب ہذا، ص 164)

اس کتاب میں تاریخ وتمدن کے ساتھ ہی مذہب وتصوف پر بھی بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ طرزِ تحریر بھی عالمانہ ہے، جس کا اندازہ اقتباس ذیل سے لگایا جاسکتا ہے:

''صوفیت کا نظام مجموعی طور پر دو حصوں یا مسلکوں میں بٹا ہوا ہے: باشرع یعنی وہ جو اسلامی قانون (شرع) کے پابند ہیں اور دوسرے وہ جو شرع یعنی ان قوانین کے پابند نہیں ہیں۔ ان دونوں مسلکوں کے سلسلے ہندوستان میں پھلے پھولے۔ مؤخر الذکر کے پیروکار زیادہ تر گھومتے پھرتے رہنے والے صوفی قلندر ہوتے تھے۔'' (کتاب ہذا، ص 290)

اس کتاب میں جن بادشاہوں کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ ان میں قطب الدین ایبک اور التمش، بلبن، علاؤ الدین خلجی، غیاث الدین تغلق، محمد بن تغلق، یعنی عہد سلطنت کے تمام ہی قابلِ ذکر بادشاہ شامل ہیں۔ مصنف کتاب نے معلومات کو مستند مآخذ سے حاصل کیا ہے، مترجم کا اندازِ تحریر اور پیرایۂ زبان اس قدر لطیف ودلچسپ ہے کہ کتاب ترجمہ نہیں بلکہ اصل کتاب معلوم ہوتی ہے۔ قاری کو پڑھنے میں کسی طرح کی دقت یا بے ربطی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ سلسلۂ مضمون باہم مربوط اور متاثر کن ہے۔ ان تمام خصوصیات کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ زیرِ نظر کتاب اپنے موضوع کا پوری طرح احاطہ کرتی ہے اور عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان کی مستند تاریخی دستاویز ہے۔

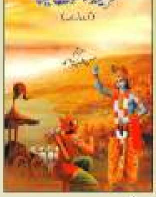

شریمد بھاگوت گیتا (اردو ترجمہ)

مترجم: حسن الدین احمد

مطبوعہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

صفحات: 105، قیمت: 80 روپے

مبصر: سیف ازہر، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیرِ تبصرہ کتاب دراصل ایک فلسفیانہ مذہبی گیت کا نثری ترجمہ ہے۔ ترجمے پر ناقدانہ نظر اور جائزے سے ہمارا سروکار اس لیے نہیں ہے کہ ہمیں سنسکرت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ البتہ اردو کی لسانی سطح پر بات کریں تو اس ترجمے میں یہ سرا بہت مضبوط بندھا ہوا معلوم پڑتا ہے۔ ترجمے میں زبان، سلاست اور اردو کا مخصوص رنگ کہیں بھی ماند نہیں پڑنے پاتا۔

عمل کے فلسفے پر ارجن کے پوچھنے پر بھگوان جواب دیتے ہیں

''اے گناہوں سے مبرا (ارجن) جیسا کہ پہلے میں نے بتایا ہے کہ حصول مقصد دو طریقوں سے ہوسکتا ہے۔ فلسفۂ علم والوں کو علم کے ذریعے اور فلسفۂ عمل والوں کو عمل کے ذریعے۔ جدوجہد سے پیچھے ہٹ کر انسان عمل سے آزادی حاصل نہیں کرتا اور نہ ہی محض نفس کشی کے ذریعے وہ کمال کی جانب بڑھتا ہے۔''

بھگوت گیتا چونکہ سنسکرت میں ہے۔ اس لیے بہت سے الفاظ اور تراکیب ترجمے کے دوران ایسے آتے ہیں جن کا بدل نہیں ہوتا اور اگر بدل ہو تب بھی اس سے اس مخصوص سنسکرتی کا اظہار نہیں ہوتا جس کا اصل متن متقاضی ہوتا ہے۔ آپ کو جگہ جگہ اس ترجمے کے اندر ایسے جملے، الفاظ اور تراکیب دیکھنے کو ملیں گی جن کا مترجم نے نہ صرف دھیان رکھا ہے بلکہ ان کے استعمال میں بڑی چابکدستی اور ہنرمندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک جگہ ارجن بھگوان سے کہتے ہیں۔

''اے کیشو! آپ جو کہتے ہیں میں اسے سچ جانتا ہوں۔ اے بھگوان! آپ کی حقیقت کو نہ تو دیوتا جانتے ہیں اور نہ راکشس۔ اے پرشوتم! تمام جانداروں کے سرچشمہ اور مالک! اے دیوتاؤں کے دیو! اے دنیا کے مالک! یقیناً آپ خود ہی اپنی حقیقت سے واقف ہیں۔''

ترجمے کے دوران بہت سے ایسے مقامات آتے ہیں جہاں آپ ترجمہ تو کردیتے ہیں مگر اس کے باوجود آپ کو اصل متن کا لفظ ترجمے میں ڈالے بغیر تشفی بخش ترجمہ محسوس نہیں ہوتا، ایسی صورت حال میں، بہت بار مترجم ترجمے کے ساتھ اصل لفظ قوسین میں ڈال دیتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ مفہوم ترجمے میں کسی حد تک منتقل ہوجاتا ہے اور دوسرے یہ کہ قاری کا ذہن بہت جلد اصل متن کے رنگ سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔ مثلاً:

''فطرتوں کو جو ہم آہنگ (ساتوک) مستعد (راجسک) اور کاہل (تامسک) ہیں یہ سمجھ کہ مجھ سے ہی ہیں۔ میں ان میں نہیں بلکہ وہ مجھ میں ہیں۔''

کوئی ترجمہ کیسا ہونا چاہیے اس سلسلے میں بہت سی باتیں ہوسکتی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ کسی بھی ترجمے کا واحد مقصد خیالات کا بخوبی دوسری زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے اور اس ترجمے میں اس بات کو بروئے کار لانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ اہل اردو جو کہ بھگوت گیتا جیسی مذہبی کتاب کے فلسفہ وخیالات سے آگہی کے متمنی ہیں ان کے لیے یہ ترجمہ بہت قدر وقیمت کا حامل ہے۔ فلسفیانہ ومنطقی طرز کے تراجم میں بالعموم یہ خرابی در آتی ہے کہ مفہوم گنجلک ہوکر رہ جاتا ہے۔ لیکن حسن الدین احمد کے ترجمے میں یہ باتیں کم از کم مجھے دیکھنے کو نہیں ملی، جملے اور خیالات دونوں سطح پر یہ ترجمہ کافی حد تک واضح نظر آتا ہے۔ ترجمے کے دوران ہر اس پہلو کا مترجم نے دھیان رکھنے کی کوشش کی ہے جو ایک اچھے ترجمے کی علامات میں شامل ہیں۔ کتاب کے اخیر میں بھگوت گیتا کے مشکل الفاظ اور تشریح طلب اصطلاحات کی مترجم نے بہت جامعیت اور اختصار کے ساتھ تشریح پیش کی ہے جو کہ قارئین کے لیے بہت مفید ہے۔ بھگوت گیتا کا پورا پس منظر مہابھارت سے عبارت ہے اور یہ پوری کتاب اسی جنگ کی اپج ہے اب اگر اس جنگ کو ہی مترجم نظر انداز کرکے آگے بڑھ جاتا تو یہ بڑی چوک کہلاتی اس لیے مترجم نے یہاں بھی اپنی دوررسی کا نمونہ پیش کرتے ہوئے باقاعدہ مہابھارت کا نقشہ ہی اتار دیا ہے۔

شریمد بھاگوت گیتا کا یہ ترجمہ ایک پیش لفظ، ایک مقدمہ، کچھ ترجمہ سے متعلق، بھگوت گیتا کے ساتھ ساتھ اٹھارہ ابواب، الفاظ واصطلاحات کی تشریح، بھگوت گیتا میں مستعمل ناموں کی تشریح، ایک شجرہ اور مہابھارت کے نقشے پر مشتمل ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

مضامین

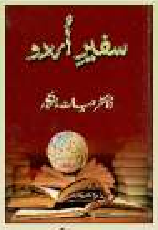

سفیر اردو

مصنف/ ناشر: حیات افتخار

صفحات: 254، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: جنوری 2022

رابطہ: نذیر بک ڈپو، قاعدملت روڈ ٹرپلین روڈ، چنئی 5

مبصر: ذکی طارق، 564 کیلا روڈ، گئوشالہ پھاٹک، غازی آباد، یوپی

ڈاکٹر حیات افتخار قائدملت کالج میڈاواکم چنئی میں شعبۂ اردو میں اردو مراکز سے دور رہ کر اردو کے فروغ کے لیے کام کرتے رہے ہیں۔ تحقیق وتنقید ان کا اہم موضوع رہا ہے۔ زیرنظر تصنیف سفیر اردو سے قبل بھی کرشن چندر کے ناولوں میں ترقی پسندی اور اردو ناولوں میں ترقی پسندی کے عنوان سے 1982 اور 1988 میں جہاں دو اہم کتابیں ان کی شائع ہوکر اہلِ قلم سے پذیرائی حاصل کرچکی ہیں وہیں ساہتیہ اکادمی کے لیے تمل ادب کا ترجمہ بھی انھوں نے کیا ہے۔ قائدِ ملت، حیات وخدمات، تقابلی ادبی مطالعہ، اصغر شناسی، کلی کا ڈو کی داستان اور وائرمتو کے انعام یافتہ ناول کا ترجمہ بھی ان کا اہم کارنامہ ہے۔ اس طرح ایک محقق اور مترجم کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں ان کا نام کافی مشہور ہے۔ زیرنظر تصنیف 'سفیرِ اردو' ان کے 28 مضامین پر مشتمل مجموعہ ہے، جس کو انھوں نے انکساری کے ساتھ طالب علمانہ کوشش بتایا ہے۔ کتاب پر ڈاکٹر ستار ساحر کا ایک بسیط مقدمہ موجود ہے، جس کے ذریعے کتاب میں شامل تمام مضامین کی مختصر تلخیص پیش کی گئی ہے، مقدمہ کے مطالعہ سے کتاب میں شامل سبھی مضامین کا اندازہ قاری کو ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ان مضامین کو صاحبِ تصنیف نے 6 مختلف عنوانات کے تحت 6 ابواب میں تقسیم کرتے ہوئے خامہ فرسائی کی ہے جن کے مطالعہ سے مصنف کے وسیع مطالعہ، زبان و بیان پر ان کی دسترس، مختلف اصناف سے ان کی دلچسپی، موضوع پر ان کی گرفت، تنقیدی بصیرت اور تحقیقی کاوشوں سے ان کی ذہنی اور فکری وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

باب اوّل 'تنقیدی نگارشات' میں 9 مضامین ہیں۔ پہلا مضمون 'اقبال اور مدراس' کے عنوان سے ہے، جس میں مصنف نے علامہ اقبال کی مدراس میں آمد ان کا قیام اور ان کے عالمانہ خطبات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ دوسرا مضمون سرسید کے حوالے سے ہے جس میں ان کی شخصیت، تعلیمی اور ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرا مضمون فیض کی شاعری کو زنداں کے سایے میں پرکھتے ہوئے اس کلام کو فیض کا طرۂ امتیاز قرار دیتا ہے۔ چوتھا مضمون بنگال اتساہی کے گیتوں کے حوالے سے ہے جس کے ذریعے ان کے گیتوں کی خصوصیت بیان کی گئی ہے۔ پانچواں مضمون 'تمل ناڈو میں اردو افسانہ' ہے جس میں وہاں کے افسانہ نگاروں کی افسانہ نگاری کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ چھٹے مضمون 'تمل ناڈو میں اردو تنقید- اکیسویں صدی میں' میں جہاں اہم نقادوں کا ذکر کیا ہے، وہیں ان کے تنقیدی رویے کی انفرادیت، ان کی کتابوں اور مضامین پر جو گفتگو کی ہے وہ مصنف کی تنقیدی بصیرت اور تحقیقی کاوش کی غماز ہے۔ ایک مضمون میں جہاں حسن فیاض کی رباعیات میں یاسیت اور مایوسی کے ساتھ تغزل کی نشاندہی کی ہے وہیں سراج زیبائی کو الفاظ کا جادوگر کہا گیا ہے۔ محمود شاہد کی غزل گوئی کا مطالعہ بھی مصنف نے گہری نظر سے کرتے ہوئے جو اعتراضات کیے ہیں وہ قابل غور بھی ہیں اور غزل پر ان کی دسترس کا ثبوت بھی۔

شخصیات سے متعلق سماجی شعور، ان کا طرزِ گفتگو اور ان اشخاص کی نثر نگاری اور غزل گوئی کے امتیازات کی جس چابکدستی سے نشاندہی کی ہے اور اپنی بات کو جس جامع انداز میں قلم بند کیا ہے وہ قارئین کو ان مضامین کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔ مذہب کے حوالے سے زینت کوثر کی تصنیف 'من کا بن' جو قرآنی تعلیمات کے آئینے پر مشتمل ہے کو شامل کرتے ہوئے مصنف اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''قرآنی تعلیمات کے حوالے سے بہتر انسان بننے کے لیے جن صفات کا ہونا ضروری ہے اس کتاب میں انھیں صفات کو بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔''

چوتھا باب لسانیات کے حوالے سے قائم کرتے ہوئے دو مضمون زبان کی موت اور تمل ناڈو کی دکنی اردو پر تمل کے اثرات شامل کرتے ہوئے لسانیات جیسے خشک موضوع کو ایسے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے کہ مصنف کے وسیع مطالعہ اور شگفتہ اسلوب کی داد دینی پڑتی ہے۔ لوک ادب میں دیویندر ستیارتھی پر ایک انتہائی دلچسپ اور معلوماتی مضمون سپردِ قلم کرکے ستیارتھی کی لوک ادب کی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کی اردو خدمات کو یکسر فراموش کرنے پر گہرے افسوس کا اظہار کیا گیا ہے۔ دیگر ادبیات کے تحت نوبل انعام یافتہ ادیب گیبریل گارسیا مارکیز، تمل افسانوی ادب کے تراجم اور تمل ادب کا خلیل جبران، کوی کو عبدالرحمٰن 3 مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

مصنف نے گیبریل کی ابتدائی زندگی ان کی صحافت، ان کے مشہور ناول 'تنہائی کی ایک صدی' پر جہاں سیر حاصل تنقیدی گفتگو کی ہے وہیں ان کے افسانوں پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے ان کے اسلوب پر بھی اپنی بے باک رائے کا اظہار کیا ہے۔ 'تمل افسانوی ادب کے تراجم' میں حسرت سہروردی، عظمت اللہ سرمدی، ایس ایم حیات مختار بدری اور سجاد بخاری کے تراجم سے شائقینِ ادب کو متعارف کرایا ہے۔ تیسرا مضمون تمل ادب کا خلیل جبران، کوی کو عبدالرحمٰن کو ان جدید شعرا میں شمار کیا ہے جو رجحان ساز بھی ہیں اور عہد ساز بھی۔ مصنف کو کویکو عبدالرحمٰن کے یہاں خلیل جبران کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر حیات نے اپنی زندگی کے شب و روز جس طرح اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے وقف کیے ہیں اور شعر و ادب کی افہام و تفہیم میں سادہ، سلیس اور نکھری ہوئی زبان کا استعمال کرتے ہوئے اپنے قلم کو جو بانکپن اور شگفتہ اسلوب عطا کیا ہے وہ نہ صرف خواص بلکہ عام پڑھے لکھے انسان کی بھی سمجھ میں آتا ہے اور اس شگفتہ اسلوب اور نکھری زبان سے وہ لطف اندوز ہوتا ہے۔

یقیناً علم و ادب کی دنیا میں 'سفیرِ ادب' کو پسند کیا جائے گا اور شائقینِ ادب کتاب میں شامل مضامین سے استفادہ کریں گے۔

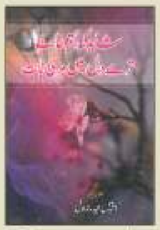

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات

مصنف: اقبال حیدر ندوی

صفحات: 256، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: جمیرا حیات، جامع مسجد، دہلی

زیر تبصرہ کتاب شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات' اقبال حیدر ندوی' کے مختلف موضوعات پر لکھے مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب میں کل 48 مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین چار ذیلی ابواب میں منقسم ہیں۔ یہ مضامین اسلامیات، اصلاح معاشرہ، تاریخ، سوانح، طب وصحت اور سائنس ٹیکنالوجی وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ یہ مختلف اخبارات و رسائل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب میں شامل تقریباً سبھی مضامین کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ پہلا حصہ اسلامیات ہے جس میں کل سولہ مضامین شامل ہیں۔ اس باب میں مصنف نے اللہ تعالی کی بندگی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اقرار کے ذرائع پر توجہ مذکور کی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے حوالے سے عبادت و ریاضت کے تمام شعبوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ رمضان المبارک، روزہ کے طبی فوائد، عیدالفطر کا

پیغام، حج، کربلا، خوف خدا اور اسلام کے احکامات و پیغام کے حوالے سے بے حد کارآمد باتیں بیان کی گئی ہیں۔ مصنف نے اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے اور قرآن پاک کی تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام دینی و دنیاوی ترقی اور برکات وفوائد کا فائدہ اٹھانے کی تلقین کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وارشادات، احکام وتعلیمات کی روشنی میں مسلمانوں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح انسان اپنی زندگی بہتر بنا سکتا ہے۔ ان کی حیات انسان کے لیے ایک مکمل دستور عمل اور ہدایت ہے۔ بے شک قرآن ایک آسمانی صحیفہ ہے جس کی ہر بات قول فیصل ہے۔ اس پر عمل کر کے انسان اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنا سکتا ہے۔ مصنف نے اخلاقیات کے حوالے سے بھی کل بارہ مضامین قلم بند کیے ہیں۔ معاشرے کی تشکیل اور عورت، مسلم خواتین کے جنگی کارنامے، اولاد کی اصلاح وتربیت، موجودہ دور میں مسلم خواتین کا کردار، بیٹیاں والدین پر بوجھ نہیں ہوتیں، ماں کی گود بچے کی پہلی درسگاہ وغیرہ مضامین قابل غور ہیں۔ ان مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرے کی اصلاح میں عورت کی حصے داری اور ذمے داریاں کیا ہیں اور کس طرح ان ذمے داریوں کو نبھایا جا سکتا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عورت نہ صرف اپنی بلکہ پورے سماج کی اصلاح میں حصے دار ہوتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دنیا کی جتنی بھی عظیم شخصیات گزری ہیں ان کی تربیت میں ان کی ماؤں کا بڑا اثر رہا ہے۔ دینی و دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم اولاد کو دینا والدین کا فرض ہے۔

مصنف نے ان ہی باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ مضامین پیش کیے ہیں۔ کتاب کا تیسرا حصہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ حصہ چند اہم شخصیات پر مشتمل ہے۔ ان شخصیات میں حضرت اویس قرنی، ابن خلدون، مولانا محمد علی جوہر، مولانا سید فصیح احمد بہاری، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی، علی سردار جعفری شامل ہیں۔ مصنف نے ان سبھی شخصیات کی علمی وادبی، مذہبی وسیاسی خدمات پر مختصر مگر عمیق جائزہ پیش کیا ہے۔ کتاب کا اگلا حصہ سائنسی علوم پر مبنی ہے اس حصے میں کل تیرہ مضامین شامل ہیں۔ اس میں قلم کی تاریخی حیثیت وعظمت، ایجادات و مسلمان، مسلم سائنس دانوں کی خدمات، ستاروں پر انسانی زندگی، گریک فائر آتش گیر مادہ، بیسویں صدی کی اہم سائنسی دریافت وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کا آخری حصہ صحت وتندرستی ہے اس حصے میں تین مضامین بالوں کا گرنا ایک مسئلہ صحت، کینسر کا جغرافیائی تناسب، کرونا وائرس ایک عالمی وبا شامل ہیں۔

کتاب کا اسلوب سادہ، زبان سلیس اور عام فہم ہے۔ مشکل موضوعات کو بھی مصنف نے سہل طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب سے نہ صرف نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ اسلامیات کے مختلف موضوعات و مسائل سے واقفیت بھی ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب یہ ایک اہم کتاب ہے۔ اہم موضوعات، دلکش اسلوب، مواد کی جاذبیت، زبان و بیان کی برجستگی و بے ساختگی اس کتاب کی خوبیاں ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب قارئین کو پسند آئے گی۔

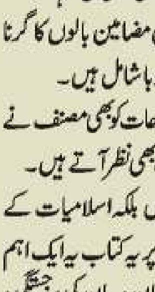

ترتیب

کہکشاں پروین: فکری و فنی جہات

مرتب: ڈاکٹر محمد مکمل حسین

صفحات: 328، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: حقانی القاسمی، B-145/8، ٹھوکر نمبر 8، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

ان لوگوں کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں جو ان شخصیات کے کوائف اور ادبی و علمی آثار سے روشناس کراتے ہیں جن سے مکمل شناسائی کی صورت مشکل سے نکل پاتی ہے، خاص طور پر قصبات اور قریات وہ جواہر جن سے زیادہ تر لوگ ناآشنا ہوتے ہیں۔

کہکشاں پروین اس ذیل میں نہیں آتیں کہ ان کا نام علمی اور ادبی دنیا کے لیے اجنبی نہیں ہے، ان کی تخلیقات مقتدر رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں مگر کہکشاں پروین میں اتنی ساری قابل رشک خوبیاں ہیں اس کا اندازہ ڈاکٹر محمد مکمل حسین کی مرتب کردہ کتاب 'کہکشاں پروین: فکری اور فنی جہات' سے ہوا۔ انھوں نے کہکشاں پروین کا اعمال نامہ قارئین کے روبرو کر دیا ہے جس سے اہل دانش و بینش ان کے ادبی قد و قامت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

کہکشاں پروین کا تعلق تین ریاستوں سے ہے۔ پیدائش بنگال (پرولیا) کی ہے، ازدواجی رشتہ بہار (پٹنہ) سے ہے اور ملازمت جھارکھنڈ (رانچی) میں ہے۔ اس اعتبار سے وہ خوش نصیب ہیں کہ تینوں ریاستوں کے ادبی منظرنامے کا حصہ ہیں اور حسن اتفاق یہ کہ تین ادبی منطقے (افسانہ+تحقیق+تنقید) سے تعلق ہے۔ اس میں شاعری کا رقبہ شامل کر لیا جائے تو ان کی شخصیت 'چہار سو' ہو جاتی ہے۔ افسانے کے باب میں پانی کا چاند، مور کے پاؤں، ایک مٹھی دھوپ، دھوپ کا سفر، سرخ لکیریں قابل ذکر ہیں تو نقد و تحقیق کے ذیل میں صالحہ عابد حسین بہ حیثیت ناول نگار، منٹو اور بیدی: تقابلی مطالعہ، منٹو اور واجدہ تبسم کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ، شیشۂ افکار کا ذکر کیا جا سکتا ہے اور شاعری کے حوالے سے 'کیا رشتہ ہے میرا' کا نام جوڑا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد مکمل حسین کو مبارکباد کہ انھوں نے کہکشاں پروین کی ادبی خدمات کا مکمل احاطہ کیا ہے۔ ان کی ادبی شخصیت کے جتنے بھی زاویے اور گوشے ہو سکتے ہیں، مقدمے میں ان پر بخوبی روشنی ڈالی گئی ہے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے کہکشاں پروین کی شناخت مسلم ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ان موضوعات کو مَس کیا ہے جن سے ان کا گہرا ذہنی اور جذباتی رشتہ ہے، خاص طور پر 'عورت' ان کا موضوعی مرکز ہے جس میں عورتوں کی زندگی سے جڑی ہوئی تمام نفسی ذہنی کیفیات، آلام و آزار کو بہت سلیقے سے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں عصری حسیت کے ساتھ ذہنی اور جذباتی حساسیت بھی نمایاں ہے۔ حاشیائی طبقات کو بھی اپنے افسانوی بیانیے کے مرکز میں انھوں نے خاص جگہ عطا کی ہے۔ ان کے افسانے واقعی بہت اہمیت اور قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ اسی لیے اس کتاب کے حصہ دوم میں ان کے افسانوی آرٹ کے حوالے سے بہت سے مضامین شامل کیے گئے ہیں جن میں قمر جہاں، ہمایوں اشرف، انوری بیگم، اسلم جمشید پوری، اختر آزاد، سید عبیداللہ ہاشمی، خورشید پرویز صدیقی، ارشاد سیانوی، غالب نشتر، لائق فاطمہ نقوی، عرفان کوثر، محمد مرشد، اشرف حسین، ریشماں خاتون، عبدالاحد، محمد دانش ایاز، فاطمہ حق، شہباز پروین، حنا کوثر، محمد مجاہد خاں، افسانہ پروین، ناز آفریں، صوفیہ خاتون، رخسانہ پروین قابل ذکر ہیں۔ ان تمام مقالہ نگاروں نے کہکشاں پروین کی افسانوی جہات اور زاویوں پر بہت اچھی گفتگو کی ہے۔ کہکشاں پروین کے افسانوں میں جو نسائی کردار ہیں ان میں بعض متحرک اور فعال کردار بھی ہیں۔ حقوق نسواں کے تعلق سے ان کے افسانے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ 'تواپر کی عورت' ایک اچھی کہانی ہے۔ 'شیشے کا گھر' بھی نسائی جذبات واحساسات اور ان کی محرومیوں کا خوبصورت بیانیہ ہے۔ اس کے علاوہ دیگر معاصر مسائل بھی ان کے افسانوں کا حصہ بنے ہیں۔ خاص طور پر آدی باسی تہذیب و کلچر اور ان کے مسائل پر ان کے کئی اچھے افسانے ہیں۔ 'بھانو' اسی نوع کا ایک افسانہ ہے جس میں انھوں نے آدی باسیوں کے استحصال کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر حاشیائی طبقات سے ان کے ہمدردانہ تعلق

اور دردمندی کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر اختر آزاد نے ان کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد بہت اچھا نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ”کہکشاں پروین اپنے افسانوں کے موضوعات کے لیے کہیں دور نہیں جاتیں بلکہ ہمارے سماج کے اندر پھیلی ہوئی بدعنوانی کو نہایت ہی ہنرمندی اور فنی چابک دستی کے ساتھ اس طرح استعمال کرتی ہیں کہ موضوع جیسا بھی ہو اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ حالات حاضرہ پر جہاں ان کی نظر ہے وہیں وہ عورتوں کے مسائل کو اپنے افسانوں کے حوالے سے دنیا کے سامنے لانے کا دم خم رکھتی ہیں۔ جنس جیسے موضوعات کو سنبھال کر لکھنا بھی کہکشاں خوب جانتی ہیں۔ تبھی 'تو اپر کی عورت' جیسی کہانی کا وجود عمل میں آتا ہے۔“ (ص 199-200)

کہکشاں پروین کی تحقیقی اور تنقیدی خدمات بھی بہت وقیع ہیں۔ 'صالحہ عابد حسین بہ حیثیت ناول نگار' پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس میں انھوں نے صالحہ عابد حسین کی ناول نگاری کی جملہ جہتوں کا جائزہ لیا ہے اور ان کے تمام ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے صالحہ عابد حسین کے اسلوب، موضوعات اور دیگر متعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ صالحہ شناسی میں یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے۔

'منٹو اور بیدی: تقابلی مطالعہ' ان کے ڈی لٹ کا مقالہ ہے۔ اس میں انھوں نے منٹو اور بیدی کے سوانحی حالات، کردار، پلاٹ اور دیگر مشترک اور غیر مشترک موضوعات کا بہت عمدہ موازنہ کیا ہے۔ خاص طور پر منٹو اور بیدی کے نفسیاتی اور جنسی کردار پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔ بیدی اور منٹو کا یہ عمدہ تقابلی مطالعہ ہے جس سے دونوں کی تخلیقی شخصیت کے متنوع زاویے روشن ہوتے ہیں۔

تنقید کے ذیل میں 'شیشۂ افکار' اور 'منٹو اور واجدہ تبسم کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ' کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ 'شیشۂ افکار' میں 25 مضامین ہیں جن میں کچھ جدید و قدیم شخصیات پر ہیں تو کچھ کا تعلق معاصر ادبی مسائل سے ہے، لیکن 'منٹو اور واجدہ تبسم کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ' اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے بہت اہم کتاب ہے۔ منٹو اور واجدہ کے نسوانی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ کہکشاں پروین نے ایک نیا زاویہ تلاش کیا ہے، اس کے لیے انھیں ضرور داد ملنی چاہیے۔ چار مضامین (منٹو اور واجدہ تبسم کا نسوانی کردار، واجدہ تبسم کے نسوانی کرداروں کی طبقاتی زندگی کے خاکے، منٹو اور واجدہ تبسم کے افسانوں کا جائزہ اور منٹو اور واجدہ تبسم کی افسانہ نگاری) پر محیط یہ کتاب بہت وقیع ہے کیونکہ انھوں نے دو ایسی شخصیتوں کا انتخاب کیا ہے جو عریاں نگاری کے لیے مشہور ہیں۔ انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ واجدہ تبسم اور منٹو کے یہاں عورت کن کن شکلوں میں سامنے آتی ہے اور انھوں نے خواتین کی نفسیاتی اور سماجی زندگی کو کس طور پر پیش کیا ہے دونوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں کے یہاں بیباکی اور جرأت ملتی ہے۔ موضوعی اور فنی سطح پر بھی دونوں میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد مکمل حسین نے ان کے شعری مجموعے 'کیا رشتہ ہے میرا' پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی نظموں پر روشنی ڈالی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہکشاں پروین شاعری کے میدان میں بھی اپنے کمالات کا جوہر دکھا رہی ہیں۔

ڈاکٹر محمد مکمل حسین نے کہکشاں پروین کے خطوط پر بھی لکھا ہے اور ان کے بہت سے خطوط کے اقتباسات دیے ہیں جس سے ان کی تنقیدی بصیرت اور آگہی پر روشنی اور ان کی مطالعاتی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو کہکشاں پروین کی ادبی شخصیت کے تمام پہلو اس کتاب میں سمٹ آئے ہیں۔ ڈاکٹر مکمل حسین نے ان کی فکری اور فنی جہات کا مکمل احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

خاکے

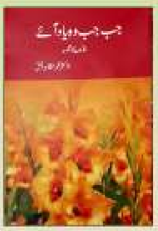

جب جب وہ یاد آئے

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر محمد مظاہر الحق

صفحات: 112، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2023

مبصر: انوار الحسن وسطوی، حسن منزل، آشیانہ کالونی روڈ نمبر 6، حاجی پور، ویشالی۔ 844101 (بہار)

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق اردو ادب کی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ موصوف تقریباً چار دہائیوں سے پرورش لوح و قلم میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ان کی تقریباً ایک درجن کتابیں منظر عام پر آکر مقبول ہو چکی ہیں۔ زیر تذکرہ کتاب 'جب جب وہ یاد آئے' سال رواں کے اوائل میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب کل 17 شخصیات پر لکھے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ ان شخصیتوں میں رفتگاں بھی ہیں اور قائماں بھی۔

کتاب ہذا میں شامل پہلا خاکہ مصنف کی والدہ مرحومہ حاجیہ جمیلہ خاتون کا ہے جب کہ دوسرا خاکہ مصنف کے رشتہ کی چچی مرحومہ نوشین کاظمی صاحبہ کا ہے۔ ان خاکوں میں مصنف نے دونوں خواتین کے اخلاق و عادات اور ان کے سیرت و کردار کی بہت خوب عکاسی کی ہے۔ مرحومین حضرات میں جن دیگر شخصیتوں کے خاکے شامل کتاب ہیں ان میں پہلا نام پروفیسر عبدالمغنی صاحب کا ہے۔ موصوف انگریزی ادب کے جید استاد اور اردو ادب کے نامور ادیب و ناقد گزرے ہیں۔

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق نے پروفیسر عبدالمغنی کی قابلیت، ذہانت، دانشوری اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کا جہاں اس خاکے میں بھرپور اعتراف کیا ہے وہیں ان کی حق گوئی، بے باکی، غریب پروری اور ان کی مذہبیت کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ مرحومین کی اس فہرست میں آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کے ایک سابق پروگرام ایگزیکٹیو جناب کمال جعفری اور انجمن ترقی اردو، بہار کے آفس کلرک الحاج محمد نسیم احمد کے بھی خاکے ہیں۔ یقیناً یہ دونوں حضرات بحیثیت انسان بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔

مرحومین کی فہرست میں پروفیسر محمد شفاعت حسین، مولانا چودھری محمد ابوالکلام عثمانی، فیاض احمد اور علامہ واقف عظیم آبادی کے خاکے بھی بہت عمدہ، دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں۔ علامہ واقف کے نام سے کون واقف نہیں ہوگا۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر کے ساتھ ایک بزرگ شخصیت بھی تھے۔ ان کی بزرگی کے تعلق سے کئی واقعے کا ذکر ڈاکٹر محمد مظاہر الحق نے ان پر لکھے خاکے میں کیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے علامہ واقف کے تعلق سے بالکل سچ لکھا ہے کہ:

”علامہ واقف طبعاً درویش تھے۔ ان کا دل نہایت ہی حساس تھا۔ ان سے دوسروں کی تکالیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ ہر لحظہ دوسروں کو تکالیف سے نکالنے کی تدابیر سوچتے رہتے تھے۔“ (ص 111)

قائماں میں پہلا خاکہ جناب اکبر رضا جمشید صاحب کا ہے۔ جناب اکبر رضا جمشید ضلع جج کے عہدے سے 2004 میں سبکدوش ہوئے ہیں۔ اردو زبان و ادب کے عاشق اور شیدائی ہیں۔ ایک درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ مزید کتابیں عنقریب منظر عام پر آنے والی ہیں۔ انھوں نے اردو کے ادبا، شعرا کی حوصلہ افزائی اور ان کی پذیرائی کے لیے 'اکبر رضا جمشید اردو زبان و ادب ایوارڈ' کے نام سے ایک مشہور ایوارڈ قائم کر رکھا ہے، جس کے تحت اب تک بہار و جھارکھنڈ کے درجنوں شعراء، ادبا کو ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے۔

قائماں کی فہرست میں جن دیگر لوگوں کے نام شامل ہیں، وہ ہیں احسن امام احسن، کلیم اللہ کلیم (دوست پوری)، ڈاکٹر سید محمد عارف، پروفیسر محمد مصلح الدین، پروفیسر محمد یونس حکیم، پروفیسر اسرار حسن اور پروفیسر توقیر عالم۔ یہ سبھی خاکے بہت عمدہ دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کی یہ تصنیف 'جب جب وہ یاد آئے' خاکوں کے مجموعوں میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے خاکہ لکھنے میں بڑے اور چھوٹے، معروف اور غیر معروف کا کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے۔ جس شخصیت میں انھیں محبت، شفقت، کردار اور اخلاق کی بُو محسوس ہوئی ہے انہیں اپنی تحریر کا موضوع بنا دیا ہے۔ دراصل ڈاکٹر محمد مظاہر الحق خود بھی محبت وشفقت اور کردار واخلاق کے پیکر ہیں۔ اس لیے ان صفات کی ان کی نگاہ میں قدر ہے۔

تبصرہ

مظفر حنفی کے تبصرے

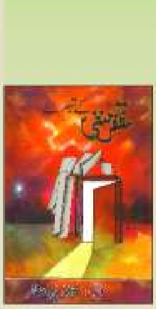

مرتب: انجینئر فیروز مظفر

صفحات: 208، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: اپریل 2023

ناشر: مظفر حنفی میموریل سوسائٹی، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: فراز عارف

باردانے والی گلی، مظفر نگر اکولہ، ضلع اکولہ، مہاراشٹر 444006

محترم فیروز مظفر صاحب اب تک اپنے والد مظفر حنفی صاحب کی 15 کتابیں مرتب کر چکے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو بحیثیت ایک ادیب منوا چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں موصوف نے محترم مظفر حنفی کے 79 تبصروں کو یکجا کیا ہے جن میں 36 شعری مجموعوں، 14 نثری کتابوں 5 افسانوی مجموعوں 3 ناول 4 طنز ومزاح 6 تنقیدی 3 سوانح 1 تبصروں کے مجموعے 1 خاکوں کی کتاب، 1 نعتیہ مجموعوں کا، 2 تراجم، 1 انشائیے، 1 تحقیقی کتاب، 1 ڈرامہ اور 1 اوپیرا پر تبصرے شامل ہیں۔ تقریباً تمام ہی اصناف ادب کی کتابوں پر مظفر حنفی نے تبصرے کیے ہیں جو کتاب کی اہمیت کو بڑھا دیتے ہیں۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر افضال عاقل، ڈاکٹر فرحت حسین خوشدل، ڈاکٹر عطا عابدی اور فیروز مظفر صاحب کے مضامین شامل ہیں جن میں تبصرہ نگاری کی تعریف، افادیت اور اہمیت پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب میں جن اہم شعری مجموعوں پر تبصرے شامل ہیں ان میں 'غزلیں'، 'آدھی صدی کے بعد' اور 'دستک اس دروازے پر' وزیر آغا، 'ثبات' ڈاکٹر محبوب راہی، 'منافقوں میں روز وشب' مدحت الاختر، 'سحر نما' عشرت قادری 'شعر شگفت' کرشن کمار طور، 'خود کلامی' اظہر عنایتی، 'دربدر' پروین کمار اشک، 'شرارِ نغمہ' گوپال مِتل، 'شہرِ ستم' ملک زادہ منظور احمد، 'گنجِ معانی + نیرنگِ معانی' تلوک چند محروم، 'آسمان محراب' شمس الرحمٰن فاروقی اور 'رشکِ فارسی' شجاع خاور پر تبصرے ہیں۔ افسانوی مجموعے 'تاک جھانک' ماجد الباقری، 'مسدود راہوں کے مسافر' رضوان احمد، 'کرچیاں' شمیم صادقہ، 'پنجرے کے پنچھی' مانک ٹالا شامل ہیں۔ ناولوں میں 'پُروائی' صغرا مہدی، 'ساتواں آنگن' صالحہ عابد حسین اور 'آنگن' خدیجہ مستور شامل ہیں۔ تنقیدی کتابوں میں 'تخلیقی عمل' اور 'نئے تناظر' وزیر آغا، 'نشانِ منزل' جگن ناتھ آزاد، 'نئی غزل کے منفی رجحانات' علی احمد جلیلی، 'ادب کی پرکھ' نریش، 'معنویت کی تلاش' ڈاکٹر عنوان چشتی شامل ہیں۔ دیگر نثری کتابوں میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، خواجہ غلام السیدین، شمس الحق عثمانی، سالک لکھنوی، ظ انصاری، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، حمایت علی شاعر، ناوک حمزہ پوری، شاہد احمد دہلوی، یوسف ناظم، ڈاکٹر خلیق انجم، شمیم حنفی، رفعت سروش اور پروفیسر الطاف احمد اعظمی کی کتابیں ہیں۔

مظفر حنفی اپنی صاف گوئی کے لیے مشہور تھے اور یہ بات ان کے تبصروں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ وہ اپنی رائے ظاہر کرنے میں تعلقات کا لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ غیر جانبداری اُن کے تبصروں کی ایک اہم خوبی تھی اور حق بات تو یہ ہے کہ غیر جانبداری کے بغیر تبصرہ معتبر نہیں ٹھہرتا۔ کتاب میں شامل تبصروں کی نوعیت محض اشتہار کی سی نہیں ہے۔ اِن تبصروں میں مبالغہ آمیز تعریف اور مضحکہ آمیز تنقیص بالکل بھی نہیں ہے۔ روایتی جملے جیسے ''کتاب اردو ادب میں بڑا اضافہ ہے، لازوال ہے، غیر معمولی کارنامہ ہے، شاعر نے یقیناً اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے، فنی نزاکتیں اور فکری باریکیاں موصوف پر ختم ہیں'' کی بھرمار نہیں ہے۔ مظفر حنفی نے مصنف، مدیر یا پبلشر کی رضا کو مقدم رکھ کر تبصرے نہیں کیے بلکہ آزادانہ طور پر قلم اٹھایا ہے۔ کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں، ''اس نظم کی امیجری ایسی زندہ اور متحرک ہے کہ اردو شاعری میں اس کی مثال کم یاب ہے، گاؤں، بچپن، مشینی زندگی کا کرب اور ماضی وحال کی کشمکش کے ایسے نادر مرقعے اس نظم میں یکجا ہو گئے ہیں کہ بلاشبہ اس نظم کو گنتی کی چند بڑی نظموں میں سے ایک کہنا پڑتا ہے۔''

(آدھی صدی کے بعد: ڈاکٹر وزیر آغا)

''بحیثیت غزل گو وزیر آغا اپنے لیے ویسا کوئی منفرد مقام نہیں بنا سکے جیسا کہ انھیں نظم وتنقید کے میدان میں حاصل ہے۔'' (غزلیں: ڈاکٹر وزیر آغا)

'' 1960 کے بعد منظر پر آنے والے ناقدوں میں فاروقی کو میں سب سے اہم مانتا ہوں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مغربی ادب کے ساتھ ساتھ اردو کلاسیکی سرمایے اور فارسی ادبیات پر بھی اچھی نگاہ رکھتے ہیں اور جدید اصولِ نقد کے ساتھ مشرقی مزاجِ شعر اور غیر آراستہ زبان کا استعمال بھی انھیں اپنے دور کے فلسفہ طرازوں سے منفرد بناتا ہے وہ اپنی رائے کے بے باک اور جرأتمندانہ اظہار پر قادر ہیں، فنی محاسن ومعائب، عروضی پیچیدگیوں اور فن پاروں کے لسانیاتی پہلوؤں کا تجزیہ فاروقی بڑی چابکدستی سے کرتے ہیں۔ ان کی بیشتر تنقیدی آرا سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی اہمیت، انفرادیت اور اخلاص پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔''

(نظیر نامہ: شمس الحق عثمانی)

''مدحت کے بعد آنے والے کئی شاعر اپنے ادبی سفر کے ابتدائی چار پانچ سال کے دوران شعری انتخاب چھاپ کر جس طرح راتوں رات مشہور ہوئے اس کے بعد مقابلے میں اس طرح اطمنان سے لیکن اعتماد کے ساتھ 'منافقوں میں روز وشب' پیش کر کے مدحت الاختر نے کاٹا اور لے دوڑی پر عمل کرنے والوں کو بتایا کہ ادب میں چور دروازے نہیں ہوا کرتے۔''

''شجاع خاور سے حنفی صاحب کے بہت خوشگوار تعلقات تھے۔ 'رشکِ فارسی' پر تبصرہ کرتے ہوئے جہاں حنفی صاحب نے شجاع خاور کو خوب سراہا ہے وہیں اُن کی خامی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ''ابتدائی صفحات پر عروضی مباحث کیوں چھیڑ دیے۔ اکثر مضامین اور مراسلات میں بھی آپ اس طرف مائل ہوتے ہیں۔ بالفرض زمانہ آپ کو سیماب دوراں بھی تسلیم کر لے تو کیا فائدہ ہوگا آپ کا؟ ایسی بحثوں میں الجھ کر غالب بھی تنگ ہوئے تھے آپ اچھے شاعر ہیں، اچھی شاعری کیجیے جو رموز آپ نے 'سطحی' کے تحت سمجھائے ہیں انھیں پڑھ کر مبتدی شاعر بہک سکتے ہیں۔''

(رشکِ فارسی: شجاع خاور)

کتاب کی جلد بندی، کاغذ اور چھپائی معیاری ہے۔ محترم شکیل اعجاز کا تیار کردہ سرِ ورق کتاب کو خوبصورت بناتا ہے۔ نئے تبصرہ نگاروں کے لیے کتاب بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں تقریباً تمام ہی اصنافِ ادب کی کتابوں پر تبصرے شامل ہیں جس سے بہت کچھ سیکھنے کو مل سکتا ہے۔

شاعری

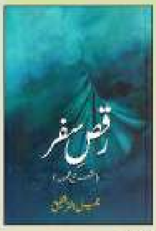

رقصِ سفر

مصنف :جمیل اختر شفیق

صفحات: 240، قیمت: 145 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر :کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، نئی دہلی، 8851148278

مبصر :محمد اشرف یاسین

E-66، دوسری منزل، شاہین باغ، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ 110025

’رقصِ سفر‘ کے تخلیق کار جمیل اختر شفیق ایک خوش فکر اور خوش الحان شاعر ہیں۔ ان کے اشعار مشاعروں اور اخبارات و رسائل جیسے مختلف ذرائع سے ہم لوگوں تک مسلسل پہنچتے رہے ہیں۔ اب تک ان کے دو شعری مجموعے منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ ان کے پہلے مجموعے کا نام ’دھوپ کا مسافر‘ ہے۔ یہ 2018 میں شائع ہوا تھا، جس میں کل 122 غزلیں ہیں، جبکہ دوسرا شعری مجموعہ ’رقصِ سفر‘ ہے اور اس میں تقریباً 170 غزلیں ہیں۔

اس شعری مجموعے میں شاعری کی بہت ساری خوبیاں نہ سہی، پھر بھی ندرت اور کلام میں پختگی کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے طویل بحروں میں اشعار کہے ہیں اور مختصر بحروں میں بھی، ان کی بعض غزلیں، غزلِ مسلسل کے زمرے میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ طبیعت میں موزونیت کی وجہ سے ان کے کلام میں فطری پن اور آمد کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ کتاب میں شامل بعض اشعار کے مضامین براہِ راست قرآن مجید سے مستفاد ہیں۔ جیسے سورۃ الحجرات آیت نمبر 12 کے پیغام کو انھوں نے اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے۔

بھائی کا مردہ گوشت بھلا کون کھائے گا

بچتے ہیں جان بوجھ کر وہم وگماں سے ہم

سورۃ الضحیٰ آیت نمبر 10 کو اس شعر میں پیش کیا ہے۔

شان سے تم جیو خوب پھولو پھلو، اک نصیحت مگر یاد رکھنا شفیق

ہاتھ پھیلا دے گر سامنے کوئی تو، اپنا چہرہ برا سا بنانا نہیں

شفیق نے ہمارے متقدمین شعرا میں سے میر تقی میر، آرزو لکھنوی، جوش ملیح آبادی، اسرار الحق مجاز، خمار بارہ بنکوی اور ندا فاضلی وغیرہ سے بہت استفادہ کیا ہے۔ ان کے اشعار بھی اگر ہمارے سامنے ہوں تو دونوں میں موازنہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور اشعار کا لطف بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔

اس مجموعے میں جابجا طنزیہ لب ولہجہ غالب نظر آتا ہے۔ جیسے۔

گلے تپاک سے ملنے سے تم بچو ورنہ — اسے بھی ملک کے مفتی حرام کر دیں گے

ہاں یہی لوگ مرے قتل میں شامل تھے شفیق — میرے پہلو میں جو دو چار نظر آتے ہیں

’رقصِ سفر‘ اور ’دھوپ کا مسافر‘ کے مطالعے سے معلوم پڑتا ہے کہ شاعر کا محبوب ترین استعارہ ’سفر‘ ہے کیونکہ ان کے دونوں مجموعوں میں یہ لفظ شامل ہے۔ اسی کی مناسبت سے چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

کسی بھی حال میں ذوقِ ہنر نہیں چھوڑا — تھکن کے خوف سے میں نے سفر نہیں چھوڑا

مت ستایا کرو رہ رہ کے شرابی باتیں — میں کسی اور ہی دنیا کا مسافر ہوں شفیق

اس مجموعے میں شاعر نے بالکل نئے موضوعات پر بہت اچھے اشعار کہے ہیں۔ جیسے۔

کتنے حسین دور میں جیتے ہیں ہم شفیق

ان سے ملے بغیر ہی ہر بات ہوگئی

دل دھڑکنے کا کوئی وقت معین ہے کہاں

نصف شب میں بھی تجھے کال لگا سکتا ہوں

جی میں آیا تو یونہی کال کیا ہے میں نے

یاد کرنے کا بھی کیا کوئی سبب ہوتا ہے

جمیل اختر شفیق کے دونوں شعری مجموعوں کے بالاستیعاب مطالعے سے مجھے جن چند کلیدی الفاظ کا علم ہوا وہ یہ ہیں۔ دل، دوست، دشمن، یار، نئی تہذیب، چراغ، رقص، رات، موت، جنازہ، یاد، محبت، حسن، عشق، حسین، وفا، پیار، زلف، شاید، خیال، سورج، جنوں، خواب، سمندر، سینہ، درد، آنکھ، روٹی، زندگی، خود، خود دار، بچھڑنا، روٹھنا، ہجر، موسم، اشک، دنیا، آئینہ، اجنبی، بچہ، ماں، انا، خمار، سفر، مسافر اور عروج وغیرہ۔

جمیل اختر شفیق کے اشعار میں فارسی اصطلاحات اور فارسی تراکیب ناپید ہیں۔ مجھے سخت تعجب ہوا کہ روایتی اصطلاحات، الفاظ اور محاورات کے استعمال کے بغیر انھوں نے آسان زبان میں اچھی اور معیاری شاعری کیسے کر ڈالی؟ انھوں نے ہندی کے مروجہ الفاظ سے غزل کو سنوارا ہے، کئی نئے الفاظ یعنی غیر غزلیہ الفاظ کو اشعار کا پیرہن عطا کیا ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ان کی شاعری میں مستعمل الفاظ سے قاری کو غرابت کا احساس بالکل بھی نہیں ہوتا۔

زندگی شانتی سے گزرے گی — مسئلے جو ہوں در گزر کرنا

میں کہ بہتا رہا محبت میں — ایسے کچھ چاہتوں کے دھارے تھے

’رقصِ سفر‘ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ جمیل اختر شفیق اپنی شاعری سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔ یہ اپنے پہلے مجموعے میں لکھتے ہیں:

”میں چاہتا ہوں کہ میری شاعری پڑھ کر کسی نافرمان اولاد میں اگر ماں باپ کو پلکوں پہ بٹھانے کا جذبہ جاگ جائے، نئی نسل میں اعلیٰ قدروں کی پاسبانی کا جنون پیدا ہو جائے، ظالم وقت کی آنکھوں میں مظلوم کی بے بسی پہ اشک تیرنے لگے، بچے بزرگوں کو عزت دینے لگیں، بوڑھے بچوں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرنے لگیں، اجڑتا گھر آباد ہو جائے، آخری سانس لیتے سماج میں حیاتِ نو کی لہر پیدا ہو جائے اور دم توڑتی کراہتی انسانیت کو آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع مل جائے، تب مجھے لفظوں کی بسائی گئی یہ دنیا بہت حسین معلوم ہوگی۔

تم کو دیکھوں تو یہ لگے مجھ کو — زندگی بیچ میں خوب صورت ہے“

جمیل اختر شفیق کی تقریباً دو عشروں پر محیط شعری زندگی کو دیکھتے ہوئے، یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔ ان کی شعری خصوصیات کا اعتراف انور جلال پوری، پروفیسر ابن کنول، حافظ عبد المنان طرزی، پروفیسر شیخ عقیل احمد، پروفیسر صفدر امام قادری، تنویر پھول (امریکہ)، ابن عظیم فاطمی، اقبال اشہر، نسیم احمد نسیم، نور السلام ندوی، منصور خوشتر، کامران غنی صبا، احسان عالم، زارا فراز، ناصر ناکاگاوا، جلال الدین قاسمی، حقانی القاسمی، ڈاکٹر جسیم الدین اور ڈاکٹر آفتاب احمد منیری وغیرہ کر چکے ہیں۔ امید ہے کہ ان کا دوسرا شعری مجموعہ بھی قارئین و ناقدین سے دادِ وتحسین حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔

■

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبرنامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان وادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

امیر خسرو اور ہندوستانی ماحول میں سماجی مذہبی ہم آہنگی

نئی دھلی: امیر خسرو کی شاعری اور ان کے نظریات صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے گنگا جمنی تہذیب کی جو شمع روشن کی تھی اس

کی کرنیں آج بھی ہندوستانی تہذیب کو منور کیے ہوئے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار شیخ المشائخ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا کے مرید خاص طوطی ہند حضرت امیر خسرو کے 719 ویں عرس مبارک پر خواجہ ہال میں منعقدہ سمینار میں مقررین نے کیا۔ اس موقعے پر اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ صوفی منش شاعر کے افکار ونظریات دراصل محبوب الٰہی ہی کی تربیت کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ امیر خسرو نے سات سو سال قبل جس روایت کی بنیاد ڈالی تھی وہ آج بھی ملک کی اہم ضرورت ہے۔ عالمی سمینار بعنوان 'حضرت خواجہ امیر خسرو اور ہندوستانی ماحول میں سماجی اور مذہبی ہم آہنگی' کے اہم شرکا میں پدم شری اختر الواسع کے علاوہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر سید فاروق نے شرکت کی۔ جب کہ اہم مقررین اور شرکا میں پروفیسر ایس ایم عزیز الدین، پروفیسر شریف حسن قاسمی، فاروق ارگلی وغیرہ شامل تھے، اس موقعے پر افضل منگلوری نے منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا دریں اثنا پروفیسر عزیز الدین کی تصنیف 'دکن کے صوفی' کی رسم اجرا بھی انجام دی گئی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 10 مئی 2023

اردو اور فارسی کی آن لائن کلاسیز کے طلبا میں اسناد تقسیم

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے زیر اہتمام ایوان غالب میں ایک پروقار تقریب میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے چلائی جارہی اردو اور فارسی کی آن لائن کلاسیز کے طلبا کو تقریب کے مہمان ذی وقار سید شاہد مہدی سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے دست مبارک سے اسناد پیش کی گئیں، ڈاکٹر ادریس احمد، ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ کی کاوشوں سے یہ آن لائن کلاسیز شروع کی گئی تھیں۔ وہ بھی بنفس نفیس تقریب میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ بہت سی معروف شخصیات جن میں اردو فارسی کلاس کے استاد محترم طاہر الحسن، محترم دپن گرگ (بیوروکریٹ)، مشتاق احمد و دیگر معزز شخصیات موجود تھیں۔ اس موقعے پر اردو فارسی میں جن طلبا نے نمایاں پوزیشن حاصل کی ان کی عزت افزائی کی گئی۔ فارسی میں اول پوزیشن لانے والے شوکت اللہ خاں شیروانی (دہلی) دوم پوزیشن لانے والے جگدیش پرشاد (پنجاب) سوم پوزیشن لانے والی شاہ جہاں بی قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 6 مئی 2023

شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام ان ہاؤس سمینار

نئی دھلی: شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام تینتالیسویں ان ہاؤس سمینار کا پروفیسر عبدالماجد قاضی صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں شعبہ کی ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی لائبریری میں انعقاد کیا گیا جس میں شعبہ کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں ریسرچ اسکالر صائمہ نذیر نے صدر جلسہ، اساتذہ کرام اور ریسرچ اسکالرس کا استقبال کیا۔ اس کے بعد شعبہ کی ریسرچ اسکالر ارم زہرہ رضوی نے 'اردن میں عربی ناول' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے اردن میں ناول کی ابتدا، اس کے مختلف مراحل، اہم ناول نگاروں کی خدمات اور ان کے اہم ناولوں نیز موضوعات اور اردن کے ناولوں کی خصوصیت پر گفتگو کی۔ ریسرچ اسکالر کے مقالہ کے بعد شعبہ کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس نے مقالہ سے متعلق سوالات کیے جن کے جوابات انھوں نے دیے۔ پروگرام کے آخر میں سمینار کے صدر پروفیسر عبدالماجد قاضی صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے صدارتی خطاب کے میں ریسرچ اسکالر کو مقالہ پیش کرنے پر مبارکباد پیش کی اور کہا کہ ہم ان ہاؤس سمینارز میں اپنے اسکالرس کو ان کی پی ایچ ڈی سے متعلق کسی موضوع پر مقالہ پیش کرنے کے لیے کہتے ہیں تاکہ ان کی تحقیق میں نکھار پیدا ہو۔ صدر شعبہ نے ریسرچ اسکالرس کو کسی سمینار یا کانفرنس میں مقالہ پیش کرنے کے آداب اور اس کے اسلوب کے بارے میں بھی بتایا اور کہا کہ جب آپ کسی موضوع پر مقالہ لکھیں تو لازم ہے کہ آپ

اس موضوع کے ساتھ ساتھ اس سے متعلق موضوعات کو بھی اپنے مطالعہ میں شامل کریں، انھوں نے ریسرچ اسکالرس کو مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ ان ہاؤس سمینار کے اختتام پر ریسرچ اسکالر فورم کے ایڈوائزر پروفیسر نسیم اختر ندوی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس ان ہاؤس سمینار کی نظامت کے فرائض شعبہ کی ریسرچ اسکالر صائمہ نذیر نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 مئی 2023

فخرالدین علی احمد میموریل لیکچر

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ میں ہر سال فخرالدین علی احمد میموریل لکچر کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ یہ خطبہ اپنے موضوع اور مدعو شخصیت کے لحاظ سے خصوصی شناخت رکھتا ہے۔ اس مرتبہ پنجابی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اروند نے 'حکمت انسانی کا علم، زمان و مکان سے ماورا' کے موضوع پر خطبہ پیش کیا۔ اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ انسانی علم اپنی آفاقیت کے لحاظ سے مختلف جہتیں رکھتا ہے۔ سرمایۂ علم کا اشتراک دو افراد، گروہ یا بڑی کمیونٹی کے درمیان ہو سکتا ہے۔ ان گروہوں کو ہم مختلف شعبوں مثلاً تکنیک، تجارت وغیرہ میں منظم کر سکتے ہیں۔ اگر غور کریں تو علم ہی ہے جو آفاقی پیمانوں پر انسان کو انسان سے جوڑتا ہے۔ ترجمہ اور تجربہ اس کا سب سے موثر حربہ ہوا کرتا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین جسٹس بدر دریز احمد نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کا فخرالدین علی احمد میموریل لکچر اپنی شاندار روایت رکھتا ہے۔ اس ملک کے بہت اہم اسکالرس اس میں شرکت کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر اروند پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ کے وائس چانسلر ہونے کے ساتھ بہت اچھے سائنسداں بھی ہیں، Quantum Physics پر ان کی گہری نظر ہے لیکن سائنس کے علاوہ سماجی علوم پر ان کی کیسی دسترس ہے اس کا اندازہ آج کے لکچر سے ہوا ہوگا۔ جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر افشار عالم خطبے میں بطور مہمان خصوصی موجود تھے۔ انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ اردو کا ایک سرگرم ادارہ ہے اور یہ محض روایتی قسم کے پروگرام کا انعقاد نہیں کرتا بلکہ یہاں ایسے موضوعات کو بھی زیر بحث لایا جاتا ہے جن کا تعلق دوسری زبان اور دوسرے علوم سے بھی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ میں کوئی نہ کوئی ادبی یا ثقافتی سرگرمی ہوتی ہی رہتی ہے لیکن جو خطبات یہاں اب تک ہوئے ہیں اور جن کو ہم 'غالب نامہ' میں شائع بھی کرتے ہیں، وہ منفرد نوعیت کے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم ان خطبات کے ذریعے یہ جاننے کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ علم کے دوسرے شعبوں میں

کس طرح کا کام ہو رہا ہے۔ اس کا اثر ہمارے رویے پر بھی پڑتا ہے اور معلومات کے دائرے سمٹنے کے بجائے کچھ بڑھ جاتے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ سال میں دو میموریل لکچر منعقد کرتا ہے جس میں ایک فخرالدین علی احمد میموریل لکچر اور دوسرا بیگم عابدہ احمد میموریل لکچر ہے۔ ان دونوں لکچرس کے لیے کسی اہم شخصیت کو دعوت دی جاتی ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج کے اس لکچر کے لیے پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے وی سی پروفیسر اروند موجود ہیں جو ایک قابل سائنس داں ہیں، وہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ موہالی میں بحیثیت ڈین خدمات انجام دے چکے ہیں اور اس وقت ملک کی معروف دانش گاہ یعنی پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے وی سی کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سائنس کے علاوہ ادب بھی ان کی دلچسپی کا میدان ہے اور ادبی موضوعات پر بھی آپ بہت عالمانہ گفتگو کر سکتے ہیں۔ اس موقعے پر ایران کے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر فریدالدین فرید عصر نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 23 مئی 2023

ٹیگور کے تراجم پر سمپوزیم

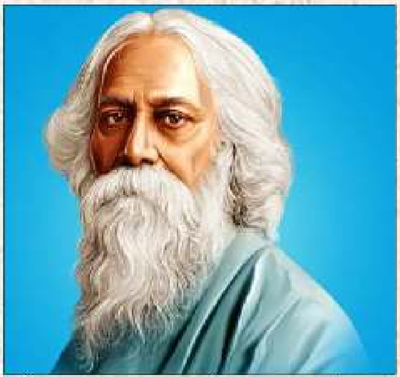

نئی دھلی: رابندرناتھ ٹیگور کے 162 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے رابندرناتھ ٹیگور کے تراجم پر ایک سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا۔ مالاشری لال کی صدارت میں منعقدہ سمپوزیم میں ف س اعجاز (اردو)، ایچ ایس شیو پرکاش (کنڑ)، موہن جیت (پنجابی) پریاگ شکلا (ہندی) اور رادھا چکرورتی (انگریزی) نے رابندرناتھ ٹیگور کی تخلیقات کا ترجمہ کرتے ہوئے اپنے تجربات پر گفتگو کی۔ پروگرام کے آغاز میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کے سری نواس راؤ نے مہمانان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ رابندرناتھ ٹیگور انسانیت کے علمبردار تھے اور ان کی تحریریں آفاقی تھیں۔ ساہتیہ اکادمی نے مختلف ہندوستانی زبانوں میں ان کی بہت سی تخلیقات کا ترجمہ دستیاب کرایا ہے۔ اس دوران ف س اعجاز نے رابندرناتھ ٹیگور کے اس بیان کا حوالہ دیا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ میں مرنے کے بعد بھی اپنے گیتوں میں زندہ رہوں گا۔ ان کے گیتوں میں فطرت، محبت، وطن وغیرہ جیسے عناصر کی آمیزش کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے ان کے کئی گیتوں کا اردو ترجمہ پیش کیا۔ کنڑ میں ٹیگور کے تراجم پر بحث کرتے ہوئے شیو پرکاش نے کہا کہ ان کے گانوں میں آزادی کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ موہن جیت سنگھ نے یہ بتاتے ہوئے کہ ٹیگور نے بلراج ساہنی کو پنجابی میں لکھنے کی ترغیب دی، کہا کہ ٹیگور پر سکھ گروؤں کی طرف سے دی گئی شہادت کا بہت اثر تھا اور انھوں نے گرو گوبند سنگھ، بندہ سنگھ اور دارو سنگھ پر نظمیں لکھیں۔ پریاگ شکلا نے گیتانجلی کے ہندی ترجمے پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ٹیگور کی تحریر ایک عظیم سمندر کے مانند ہے اور اس میں سے موتی چننا بہت مشکل ہے۔ رادھا چکرورتی نے اپنے ٹیگور کے انگریزی تراجم پر بحث کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ان تراجم سے زیادہ مطمئن نہیں ہیں، پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے مالاشری لال نے سب کا شکریہ ادا کیا اور رابندرناتھ ٹیگور کی کہانی موہ مایا کا ترجمہ پیش کیا۔ پروگرام میں مختلف ہندوستانی زبانوں کے اہم مصنفین، مترجمین اور طلبہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' 10 مئی 2023

مصنف سے ملاقات

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ’مصنف سے ملاقات‘ پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں بطور مہمان خصوصی معروف کنڑ اور انگریزی شاعر و ڈراما نگار ایچ ایس شیو پرکاش نے شرکت کی۔ اس دوران انھوں نے اپنی کنڑ اور انگریزی نظمیں سنائیں اور سامعین کے سوالات کے جوابات بھی دیے۔ پروگرام کے شروع میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سرینواس راؤ نے ایچ ایس شیو پرکاش کو شال اڑھا کر اور کتابیں پیش کرکے خیر مقدم کیا اور ان کا تفصیلی تعارف بھی پیش کیا۔ اس دوران شیو پرکاش نے کہا کہ شاعری ایک ناقابل فراموش آواز پیدا کرتی ہے جو ہم سب کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ ان کی تحریر کے آغاز میں وہ اشعار ’سوانت سکھائے‘ تھے، یعنی ایک طرح سے خود کو لکھے گئے محبت کے خطوط تھے۔ واضح رہے کہ 1954 میں بنگلور میں پیدا ہونے والے ایچ ایس شیو پرکاش نے وہیں تعلیم حاصل کی۔ ان کے 14 کنڑ شعری مجموعے اور 8 ڈرامے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ 2002 سے 2019 تک جے این یو میں پروفیسر تھے۔ اس دوران سامعین کی طرف سے پوچھے گئے مختلف سوالات کے جواب میں انھوں نے اپنی نظموں کے فلسفہ، تحریر اور تحریک کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 2 جون 2023

اتر پردیش

ہندی جرنلزم ڈے پر سمینار کا انعقاد

مراد آباد: اتر پردیش ہائر ایجوکیشن سروس کمیشن کے سابق ممبر اور تیرتھنکر مہاویر یونیورسٹی کے شعبہ قانون کے ڈین پروفیسر ہرونش دکشت نے کہا کہ اطلاعاتی انقلاب کے اس دور میں پرنٹ میڈیا کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک اور سوشل میڈیا بھی عوام کو متاثر کر رہے ہیں۔ اگر ان کا کردار مثبت ہوگا تو یہ قوم کی تعمیر میں فیصلہ کن کردار ادا کرے گا۔ پروفیسر دکشت گزشتہ روز یہاں پنچایت بھون آڈیٹوریم میں ضلع زرعی ترقیاتی صنعتی اور ثقافتی نمائش کے تحت منعقدہ سمینار کی صدارت کر رہے تھے۔ ہندی جرنلزم ڈے کے موقعے پر ملک کی تعمیر میں ادب اور صحافت کی شراکت سے متعلق اس سمینار میں گرو گوبند سنگھ اندرا پرستھ یونیورسٹی، نئی دہلی کے ماس کمیونیکیشن کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر درگیش ترپاٹھی نے مہمان خصوصی کے طور پر کہا کہ آزادی سے قبل صحافت کا مشن ملک کو آزادی دلانا تھا لیکن آج عالمگیریت کے دور میں صحافت دھیرے دھیرے کاروبار کی طرف بڑھ رہی ہے جس کے نتائج ہم پیڈ نیوز اور نیوز ٹریڈنگ کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ نظامت کرتے ہوئے سینئر صحافی، مصنف اور ہندوستانی اکیڈمی کے سابق ایگزیکٹیو ممبر ڈاکٹر منوج رستوگی نے یوم صحافت کا ذکر کرتے ہوئے مراد آباد کی صحافت کی تاریخ اور روایت پر روشنی ڈالی۔ اتر پردیش اردو اکادمی کے سابق ایگزیکٹیو ممبر سید محمد ہاشم نے کہا کہ ادب اور صحافت کا مقصد سماج کو مثبت سمت دینا ہے جس کے ذریعے قوم کی تعمیر کی جا سکتی ہے۔ صوفی فاؤنڈیشن کے صدر اور غزل اکیڈمی کے سکریٹری کشش وارثی نے کہا کہ مراد آباد کے صوفی امبا پرساد نے آزادی کی لڑائی میں اپنے قلم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ سینئر ادیب ڈاکٹر اجے انوپم نے مراد آباد کے ادبا کے حوالے سے اہم جانکاری دی۔ سینئر صحافی ترون پراشر نے کہا کہ میڈیا کو اخلاص کے ساتھ اپنا کام کرنا چاہیے۔

روزنامہ ’صحافت‘ دہلی، 1 جون 2023

عربی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں خواتین کا حصہ

علی گڑھ: شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کی جانب سے ’عربی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں خواتین کی خدمات: ایک جائزہ‘ عنوان کے تحت دوسرے توسیعی خطبہ کا اہتمام کیا گیا۔ یہ توسیعی خطبہ، اے ایم یو کے شعبہ عربی کے سابق صدر اور سابق ڈین، فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر کفیل احمد قاسمی نے دیا۔ پروفیسر آذرمی دخت صفوی، سابق ڈین، فیکلٹی آف آرٹس، سابق صدر شعبہ فارسی، بانی ڈائرکٹر و اعزازی مشیر، مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اس جلسے کی صدارت کی اور پروفیسر عارف نذیر، ڈین، فیکلٹی آف آرٹس اس تقریب کے مہمان اعزازی کی حیثیت سے موجود تھے۔ صدر شعبۂ فارسی پروفیسر رعنا خورشید نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اور موضوع سے متعلق تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ عربی زبان میں خواتین کی خدمات لامحدود ہیں۔ عرب زمانہ قدیم سے علم و ادب کا محور و مرکز رہا۔ زمانہ جاہلیت سے لے کر دور حاضر تک خواتین نے عربی زبان و ادب میں بے شمار علمی و ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ پروفیسر کفیل احمد قاسمی نے اپنے خطبے میں عربی زبان و ادب کی ترویج میں خواتین کی خدمات پر مفصل گفتگو کرتے ہوئے دور جاہلیت سے لے کر عہد حاضر تک کی اکثر و بیشتر ان خواتین کا ذکر کیا جنھوں نے عربی زبان و ادب کو لازوال مقام بخشا۔ انھوں نے شاعرات کا مفصل ذکر کیا، اسی طرح انھوں نے سلسلہ وار ادوار کا ذکر کرتے ہوئے تمام ان خواتین کا ذکر کیا جنھوں نے عربی ادب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ زمانہ جاہلیت سے ہی عربی شاعری میں شاعرات کی ایک طویل فہرست ملتی ہے جس میں خرنق بنت بدر الیلی العفیفہ، جلیلہ بنت مرہ اور خنسہ ام الصریح کا نام نمایاں ترین ہے۔ پروفیسر عارف نذیر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خواتین کا مقام انسانی زندگی میں غیر معمولی ہے۔ انھوں نے ہندی ادب میں خواتین کی خدمات پر پر مغز بحث کی۔ پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے اپنے خطاب میں کہا کہ خواتین عربی زبان و ادب میں زمانہ قدیم سے تخلیق کا کام انجام دے رہی ہیں، جلسہ کی نظامت کے فرائض پروفیسر محمد عثمان غنی نے انجام دیے۔ ڈاکٹر محمد قمر عالم نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 23 مئی 2023

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا صد سالہ جشن

علی گڑھ: ”اردو صرف ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب و ثقافت بن چکی ہے، جس کی ایک خوبصورت تاریخ اور توانا روایت ہے، جس کو زریں بنانے میں شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اہم کردار رہا ہے۔ یہ باتیں شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صد سالہ جشن میں مقررین نے کہیں۔ سہ روزہ بین الاقوامی سمینار کی افتتاحی تقریب کے بعد تین دن تک منعقد ہونے والے 9 تکنیکی اجلاسوں میں مقالہ نگاروں نے شعبہ اردو کی سو سالہ خدمات کا جائزہ لیا۔ مقالہ نگاروں نے شعبہ اردو کی سبھی اصناف میں خدمات کا جائزہ لیا اور بتایا کہ زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کے ارتقا میں شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر محمد علی جوہر نے کہا کہ شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک ایسا شعبہ ہے جو اپنی علمی و ادبی خدمات کی بنا پر پوری دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ سمینار میں ملک کے گوشے گوشے سے مندوبین نے شرکت کی، ہندوستان کی اہم دانش گاہوں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لعل یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، گورکھپور یونیورسٹی، آگرہ یونیورسٹی، کوٹہ، راجستھان یونیورسٹی کے مندوبین سمیت ملک بھر سے اردو کی خدمات انجام دینے والی اہم شخصیات نے اس صد سالہ جشن اور سہ روزہ سمینار

میں شرکت کی۔ اس موقعے پر آن لائن اجلاس منعقد کیے گئے جس میں کئی اہم شخصیات نے شرکت کی اور مقالے پیش کیے۔ مختلف تکنیکی اجلاسوں میں شعبہ اردو کی اہم شخصیات اور اصناف ادب مثلاً ڈراما، افسانہ، ناول، شاعری، انشائیہ، خاکہ کے علاوہ لسانیات، نظری و عملی تنقید، رومانیت، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، نوآبادیاتی اور پس نوآبادیاتی تنقید اور جمالیات شناسی میں شعبہ اردو کے اساتذہ وطلبا کی خدمات کا بالتفصیل جائزہ لیا گیا۔ خاتون اساتذہ کے علمی و ادبی اکتسابات پر بھی گفتگو کی گئی۔ رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری اور ان کی نگرانی میں ہوئے تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا گیا۔ آل احمد سرور کی تنقید، ان کی شاعری اور تحریکات و نظریات سے وابستگی پر خصوصی گفتگو کی گئی، خلیل الرحمٰن اعظمی، معین احسن جذبی، آشفتہ چنگیزی، اسعد بدایونی اور شہریار کی شاعرانہ عظمتوں کو بیان کیا گیا۔ قاضی عبدالستار کی فکشن نگاری، ان کے شاگردوں میں پروفیسر طارق چھتاری، سید محمد اشرف اور غضنفر علی وغیرہ کے تخلیقی سرمائے کا جائزہ لیا گیا۔ اسی طرح خورشید الاسلام، پروفیسر قاضی افضال حسین اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی کے تنقیدی نظریات اور ان کے طریقہ کار پر گفتگو کی گئی۔ شعبہ اردو میں تحقیق کی روایت، موضوعات اور موجودہ تحقیق پر گفتگو کرتے ہوئے کہا گیا کہ اب شخصیات پر تحقیق کے بجائے تحریکات و نظریات اور ان موضوعات پر ریسرچ کی ضرورت ہے جو اردو کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ شعبہ اردو کے مستقبل اور اردو ٹکنالوجی سے جوڑ کر اس کو دورِ جدید سے ہم آہنگ کرنے پر بھی غور وخوض کیا گیا تاکہ آج کے جدید دور میں اردو زبان دوسری زبانوں سے پیچھے نہ رہ جائے۔ اسی طرح طلبا میں لکھنے کی عادت اور تخلیقی صلاحیتوں کے فروغ پر بھی زور دینے کی بات کہی گئی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، 9 مئی 2023

ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا مستقبل

لکھنؤ: فارسی زبان و ادب کا ماضی نہایت تابناک اور روشن رہا ہے، یہ زبان تقریباً سات سو سال تک متحدہ ہندوستان کی سرکاری، درباری اور کسی حد تک عوامی زبان رہی ہے، اس زبان کو نہ صرف مسلمانوں نے اختیار کیا بلکہ ہندوؤں نے اس زبان کو اپنی گراں قدر نگارشات سے مالا مال کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سید اختر حسین، شعبۂ فارسی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی نے، آج شعبہ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی میں 'ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا مستقبل' کے عنوان پر منعقد توسیعی خطبہ میں کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے شعبۂ فارسی کے ہال میں موجود طلبا وطالبات سے خصوصی طور پر کہا کہ اگر آپ فارسی زبان کے ساتھ دیگر عالمی زبانوں خاص طور پر انگریزی زبان میں مہارت پیدا کرلیں تو آپ ترقی وبلندی کی اس منزل تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں جہاں تک ابھی آپ کے تخیل کے پرندوں کی پرواز بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اس موقعے پر پروفیسر مدھورمالال، پروفیسر اپلائیڈ کامرس و لکھنؤ یونیورسٹی کے پلیس منٹ سیل کی صدر نے اپنے صدارتی خطاب میں طلبا کو یقین دہانی کرائی کہ وہ اس یونیورسٹی میں بھی فارسی کے طلبا کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گی۔ اس سے قبل پروفیسر عمر کمال الدین، صدر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے مہمان مکرم پروفیسر سید اختر حسین، پروفیسر مدھورمالال اور آنے والے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور اس توسیعی خطبے کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس کا مقصد فارسی کے تعلق سے طلبا میں بیداری پیدا کرنا اور ان میں اپنے اس عظیم ورثے کی حامل زبان کے تئیں ذمے داری کا احساس دلانا ہے۔ اس نشست میں ڈاکٹر ارشد القادری اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 مئی 2023

بہار

انسانی زندگی میں زبان کی اہمیت

سمستی پور: زبانیں کسی حکومت یا سلطنت کی ایجاد نہیں ہیں۔ یہ خدا کی عطا کردہ ہیں۔ جیسے خدا کی دیگر نعمتوں ہوا پانی آگ اور دھوپ سے سب مستفید ہوتے ہیں، اسی طرح زبانیں بھی آزاد ہوتی ہیں ان پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ مذہب کی بھی حکمرانی ان پر نہیں چل سکتی۔ لہٰذا مذہب کی بنیاد پر کسی زبان کو تعصب کا نشانہ بنانا انصاف کا رویہ نہیں ہے۔ مذکورہ باتیں مورخہ 10 مئی کو سنسکرت اردو اور میتھلی ڈپارٹمنٹ کے باہمی اشتراک سے منعقد یک روزہ سمینار میں کلیدی خطبہ دیتے ہوئے سمستی پور کالج سمستی پور کے پرنسپل ڈاکٹر ستین کمار نے کہیں۔ سمینار کا عنوان تھا انسانی زندگی میں زبان کی اہمیت اور سنسکرت اردو اور میتھلی کا یوگدان۔ سمینار کی صدارت کالج کے پرنسپل اور فلسفے کے استاد ڈاکٹر ستین کمار نے فرمائی اور نظامت کے فرائض شعبۂ اردو کی استاد ڈاکٹر صالحہ صدیقی نے انجام دیے۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر شعبۂ زولوجی کے بزرگ استاد پروفیسر سچیدانند تیواری نے شرکت کی۔ سمینار کا آغاز پرنسپل صاحب کے ہاتھوں شمع افروزی سے ہوا۔ سمینار کے موضوع کا تعارف ڈاکٹر محمد صفوان صفوی نے کرایا۔ انھوں نے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے حیرت ظاہر کی کہ پتہ نہیں طلبہ میں زبان وادب کی تعلیم کا رجحان کیوں کم ہورہا ہے جب کہ زبان کا علم سب سے قدیم ہے اور دیگر تمام علوم کا جامع ہے۔ اس کی مثال سمندر کی سی ہے جس میں تمام علوم کی ندیاں اور نالے آکر مل جاتے ہیں۔ انھوں نے کامیابی سے پروگرام کا انعقاد کرلینے کے لیے اپنے معاونین اور ماتحتوں کا شکریہ ادا کیا اور بڑی تعداد میں شرکا کی موجودگی پر مسرت وانبساط کا اظہار کیا۔ ہندی کے استاد ڈاکٹر آشیش کمار پانڈے نے زبان کی اہمیت اور عالمی ادب کو ہندی اور سنسکرت کی دین کے موضوع پر بڑی شرح وبسط سے روشنی ڈالی۔ انگریزی کے استاد ڈاکٹر خورشید عالم علیگ نے لسانیات کے حوالے سے تہذیب وتمدن کے ارتقا میں زبان کی اہمیت کے علاوہ فرداً فرداً تینوں زبانوں کی لسانی خصوصیات پر نہایت عالمانہ انداز سے روشنی ڈالی۔ سنسکرت کے استاد ڈاکٹر درگیش رائے نے زبانوں کی پیدائش کے متعلق عالمی نظریات اور دیوبانی سنسکرت کی اہمیت وقدامت اور لسانی خصوصیات پر نہایت پرمغز باتیں کہیں۔ ان کے علاوہ فلسفے کے استاد ڈاکٹر راہل منہر اور تاریخ کے استاد ڈاکٹر اشوک کمار نے بھی خطاب کیا۔ اس موقعے پر متعلقہ تینوں ڈپارٹمنٹ کے کئی طلبہ وطالبات نے بھی تقریری پروگرام میں حصہ لیا جس کے لیے انھیں پرنسپل کے ہاتھوں اسناد سے نوازا گیا۔ پروگرام کے اختتام پر ڈاکٹر درگیش رائے نے تشریف آوری اور شرکت کے لیے مہمانوں، پریس کے نمائندوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور پروگرام کے اختتام کا اعلان فرمایا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 12 مئی 2023

تلنگانہ

ثقافتوں کا ترجمہ: زبان وادب کے مشترکہ پہلوؤں کی تلاش

حیدرآباد: ہندوستان، ترجمہ اور تقابلی مطالعات کے لیے ایک صحیح جگہ ہے جہاں لسانی وثقافتی تنوع پایا جاتا ہے۔ ترجمہ نہ صرف خود ایک تخلیق ہے بلکہ وہ اصل متن کو بھی نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ ترجمہ اور تقابلی مطالعات ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ پروفیسر انیس الرحمٰن نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، شعبۂ انگریزی کی جانب سے نیشنل ٹرانسلیشن مشن، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز،

ڈپارٹمنٹ آف ہائر ایجوکیشن، وزارت تعلیم، میسور کے اشتراک سے بین الاقوامی کانفرنس بہ عنوان 'ثقافتوں کا ترجمہ: زبان اور ادب کے مشترکہ پہلوؤں کی تلاش' کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن نے صدارتی خطاب میں ترجمہ اور تہذیب وثقافت کے باہمی رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے مختلف تہذیبی عناصر کی ہدفی زبان میں منتقلی اور اس دوران پیش آنے والے مسائل پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر شگفتہ شاہین، او ایس ڈی و صدر شعبۂ انگریزی نے کانفرنس کی اہمیت اور اس کے اغراض ومقاصد سے شرکا کو واقف کرایا اور ساتھ ہی ترجمے اور تہذیب کے باہمی روابط پر سیر حاصل گفتگو کی۔ ڈاکٹر طارق خان، آفیسر انچارج نے نیشنل ٹرانسلیشن مشن، میسور کی نمائندگی کرتے ہوئے اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے شعبۂ انگریزی، مانو اور نیشنل ٹرانسلیشن مشن، میسور کی مشترکہ کوششوں کا حوالہ دیا۔ پروفیسر ہریش نارنگ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی اور پروفیسر پنچانن موہنتی، جی ایل اے یونیورسٹی نے اہم موضوع پر کانفرنس کے لیے منتظمین کو مبارک باد پیش کی اور اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔ پروفیسر سید امتیاز حسنین (پروفیسر آزاد چیئر، مانو) نے کہا کہ مختلف موضوعات پر بحث ومباحثے کے بعد نئے امکانات سامنے آسکتے ہیں اور یہی اس سیمینار کی افادیت ہے۔ پروفیسر اشتیاق احمد، رجسٹرار، پروفیسر عزیز بانو، ڈین اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات نے بھی افتتاحی اجلاس سے خطاب کیا۔ پروفیسر سید عین الحسن نے اس موقعے پر ڈاکٹر ڈوڈا سیشو بابو، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ ہندی، مانو کی جانب سے تلگو کتاب 'نینو چوستونا' کا ہندی ترجمہ 'میں دیکھ رہا ہوں' کا اجرا کیا۔ ڈاکٹر محمد اسلم اسسٹنٹ پروفیسر نے خیر مقدم کیا۔ پروفیسر ناگیندر کوٹا چیرو نے شکریہ ادا کیا۔ ریسرچ اسکالر نوشین علی نے کارروائی چلائی۔

اس کانفرنس میں ترجمے کے میدان میں برسر کار دانشوروں اور ماہرین کی ایک کہکشاں موجود تھی۔ فرانس سے پروفیسر ایلین ڈیسولیئرس کو بطور پلینری اسپیکر مدعو کیا گیا تھا۔ دیگر بین الاقوامی پلینری مقررین (جو آن لائن شامل ہوئے) میں سعودی عرب سے ڈاکٹر سید سرور حسین، ازبکستان سے نیلوفر خودجیوا، نیپال سے بھیم لال گوتم اور ہانگ کانگ سے جان چون ین وونگ شامل تھے۔ کانفرنس میں پانچ غیر ملکی یونیورسٹیوں کے مقررین کے علاوہ سولہ ہندوستانی یونیورسٹیوں مانو، افلو، جے این یو، بٹس پلانی حیدرآباد، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد، گجرات اور کرناٹک کی مرکزی یونیورسٹیوں، پنجاب یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، الہ آباد یونیورسٹی، جی ایل اے یونیورسٹی (اترپردیش)، لولی پروفیشنل یونیورسٹی (پنجاب)، دارالہدیٰ اسلامی یونیورسٹی (کیرالہ)، ٹی وی آر کالج آف ایجوکیشن (پڈوچیری)، اور ویلور انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (آندھرا پردیش) کے مندوبین شریک تھے۔

کانفرنس کے مختلف اجلاسوں کے صدور اور کلیدی مقررین میں پروفیسر عصمت مہدی، پروفیسر ہریش نارنگ، پروفیسر سربھی بھارتی، پروفیسر ٹی وجے کمار، پروفیسر پنچانن موہنتی، پروفیسر آمنہ کشور، پروفیسر انیس الرحمٰن، پروفیسر ہری بندی لکشمی، پروفیسر پشپندر رسیال، پروفیسر اکشے کمار، پروفیسر کرسٹوفر کے ڈبلیو، پروفیسر امیت کمار اور پروفیسر وی بی تار کیشور جیسے نامور ماہرین شامل تھے۔ ایم اے انگلش کے طلبہ نے کانفرنس کے پہلے دن شام میں ترجمہ سے متعلق ایک دلچسپ ثقافتی پروگرام کے تحت حبیب تنویر کے تحریر کردہ ڈرامے 'آگرہ بازار' کے چند دلکش مناظر پیش کیے۔ اس موقعے پر طلبہ نے مشہور گیت 'ہم ہوں گے کامیاب ایک دن' کو چار زبانوں میں دلنشیں آواز میں پیش کیا۔

کانفرنس کے دوسرے دن این ای پی 2020 اور ترجمے کے مسائل پر ایک پینل ڈسکشن منعقد کیا گیا جس کی ماڈریٹر پروفیسر شگفتہ شاہین، آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی، او ایس ڈی 1 اور صدر شعبہ انگریزی، مانو تھیں۔ اس میں مانو کے اسکول برائے السنہ، لسانیات اور ہندوستانیات کی ڈین پروفیسر عزیز بانو، پروفیسر سید علیم اشرف جائسی، صدر شعبہ عربی، پروفیسر شمس الہدیٰ، صدر شعبہ اردو، ڈاکٹر سید محمود کاظمی، صدر شعبہ ترجمہ اور ڈاکٹر جی وی رتناکر صدر شعبہ ہندی نے بہ طور ماہر شرکت کی۔ اس کانفرنس کا مقصد مختلف تہذیبوں وثقافتوں کے مابین آپسی سمجھ اور افہام و تفہیم کو فروغ دینے میں ترجمے کے کردار سے متعلق نئی بصیرت اور نقطہ نظر پیدا کرنا تھا۔ اس میں شرکا کو مختلف علمی مباحثوں کے دوران ترجمے کے میدان میں کام کرنے والے ماہرین کے ساتھ تبادلہ خیال کا موقع ملا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 26 مئی اور 'ہمارا سماج' دہلی، 28 مئی 2023

اعزاز و اکرام

ماسٹر ممتاز

دیوبند: قومی سطح پر اعزاز حاصل کرنے والے سینئر صحافی ماسٹر ممتاز کو دہلی کی سماجی تنظیم 'ترجمۂ انوسندھان' اور 'جانچ فاؤنڈیشن' کی جانب سے بھارت گورو اعزاز سے نوازا گیا۔ ماسٹر ممتاز احمد نے اعزاز ملنے پر تنظیم کے عہدیداران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کا اعزاز انسان میں ایک نئی طاقت پیدا کرتا ہے۔ صحافی ماسٹر ممتاز احمد کی اس کامیابی پر مختلف علمی وادبی شخصیات نے انھیں مبارکباد پیش کی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 17 مئی 2023

ڈاکٹر رخشندہ روحی

نئی دہلی: دیوبند شہر کی کہانی کار اور مصنفہ ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی کو 'کتھا رنگ' کہانی مہوتسو اور لٹریری فیسٹول، غازی آباد میں 'انندو برار امرتی عصمت چغتائی کتھا پرسکار 2021-22' سے نوازا گیا۔

مہدی کو ان کی کہانی 'تیری خاموشی ہے ابھی...' کے لیے اعزاز دیتے ہوئے انھیں ایک اعزازی خط، رقم اور شال دے کر عزت افزائی کی گئی۔ مصنف اور نقاد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہانی مہوتسو میں 'کہانی کا حال' کے موضوع پر ہونے والی گفتگو میں رخشندہ کی کہانی کا ذکر کیا۔ شاعرہ ریتو حسین نے کہا کہ کہانی ہمارے معاشرے کی وہ دستاویز ہے جو آنے والی نسلوں کو ہمارے حال سے روشناس کراتی ہے۔ سینئر صحافی اور ادیب جتیندر یادو، سینئر ادیب اشوک میتریہ، ڈاکٹر نوین چندر لونی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ معروف طنز نگار آلوک پورانک اور اداکار منو کوشل کی 'لیکھ سے ملیے' پرزنٹیشن بہت دلچسپ رہی۔ جے پی سنگھ پرزینٹیشن بھی قابل تعریف رہی۔ اس موقعے پر سبھاش چندر، جیتن ٹھاکر، نوین کمار بھاسکر، دویجیندر کمار، آلوک یاتری، جواہر چودھری، کویتا شرما اور شوبھا ناتھ شکلا کی کتابوں کا اجرا بھی کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 مئی 2023

ناشاد اورنگ آبادی

ہسپورہ: ضلع اورنگ آباد کے مشہور قصبہ ہسپورہ میں

گزشتہ دن بزم ادب کے زیر اہتمام منعقد اعزازی مشاعرے میں بہار کے بزرگ ترین مشہور شاعر ناشاد اورنگ آبادی کو ڈاکٹر عبدالمغنی ایوارڈ

سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر اراکین بزم ادب کے علاوہ سیکڑوں لوگ موجود تھے۔ اس موقعے پر دہلی سے تشریف لائے دوسرے شاعر تسلیم انجم کو بھی شاد عظیم آبادی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 مئی 2023

رسم اجرا

صدائے جوہر

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی جوہر کا ہندوستان کی آزادی میں اہم کردار رہا ہے۔

وہ قلم کے مجاہد تھے، اس لیے انھوں نے انگریزی میں 'دی کامریڈ' اور اردو میں 'ہمدرد' جیسے موقر اخبارات جاری کیے اور ان کے ذریعے اپنے افکار و نظریات دنیا کے سامنے پیش کیے۔ بزم طلبہ، شعبہ اسلامک اسٹڈیز کئی سالوں سے 'صدائے جوہر' ان کی یاد میں شائع کر رہی ہے جو یقیناً خوش آئند بات ہے۔" ان خیالات کا اظہار پروفیسر اقتدار محمد خان، صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے بزم طلبہ کے سالانہ میگزین بہ عنوان (اسلام اور جدید معاشرہ) کے اجرا میں کیا۔ پروفیسر محمد اسحٰق، ڈین، فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز نے کہا کہ جامعہ کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اپنے تاریخی اور ملی کردار کو برقرار رکھتے ہوئے جدید تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کرے اور تعلیم و تربیت دونوں پہلوؤں سے مقصد کا صحیح شعور پیدا کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس جانب سعی جمیل ہو تو اس میں 'صدائے جوہر' اہم کردار ادا کرے گا۔ واضح رہے کہ ہر سال بزم طلبہ کی جانب سے 'صدائے جوہر' کے نام سے مختلف جدید موضوعات پر ماہانہ وال میگزین اور ایک سالانہ رسالہ شائع کیا جاتا ہے جس میں تمام کاوشیں طلبہ کی ہی ہوتی ہیں۔ امسال بطور مدیر محمد اکرم، نائب مدیر اقرا طاہر، معز الحق، معاون مدیر شیخ عظمیٰ نسیم، ثانیہ خان اور دیگر ممبران (ابوسالم یحییٰ، محمد مدبر، محمد اسلام، محمد نعمان، عذرا شاہ شفیع) کا انتخاب عمل میں آیا۔ بزم طلبہ کے مشیر ڈاکٹر خورشید آفاق کی سرپرستی میں 'صدائے جوہر' کے دو شمارے (مسلم سائنس داں اور مسلم سائنس داں خواتین) کے علاوہ ایک خصوصی شمارہ 'اسلام اور جدید معاشرہ' شائع ہوئے، ان میں اقرا طاہر اور عذرا شاہ شفیع نے اول انعام حاصل کیا۔ اسی طرح 'اسلام اور مستشرقین' کے موضوع پر ایک تحریری مقابلہ بھی منعقد کیا گیا جس میں معز الحق نے اول انعام پانچ ہزار روپے، شیخ عظمیٰ نسیم نے دوم انعام تین ہزار روپے، رئیس احمد نے سوم انعام دو ہزار روپے، احمد صفی نے چوتھا انعام ایک ہزار روپے اور شیما نیاز نے پانچواں انعام ایک ہزار روپے کا حاصل کیا، نیز محمد حمزہ، عبدالعلام، محمد شہواز، عذرا شفیع شاہ اور ثانیہ خان کو تشجیعی انعام میں پانچ پانچ سو روپے دیے گئے۔ کامیاب ہونے والے طلبہ کو سند اور ٹرافی سے بھی نوازا گیا۔ اس پروگرام میں شعبہ کے اساتذہ کے علاوہ بی اے اور ایم اے کے طلبہ و طالبات کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 17 مئی 2023

متاعِ قلم

نئی دھلی: رام پال پلیس ہوٹل میں الحاج ڈاکٹر عبدالرؤف (D.LIT) کی تازہ تصنیف 'متاع قلم' کی رسم رونمائی معروف ناقد و ادیب اور صحافی حبیب سیفی اور انصاری اطہر حسین، شمیم احمد کے دست مبارک سے عمل میں آئی۔ اس موقعے پر متاع قلم کے حوالے سے حبیب سیفی نے کہا کہ الحاج عبدالرؤف میں اس کبیر سنی میں لکھنے کا جذبہ لائق تحسین ہے۔ جو لوگ انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں وہ عبدالرؤف سے سبق حاصل کریں۔ کتاب میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر افضل الدین اقبال، سرسید احمد خان، ڈاکٹر سر محمد علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد جیسی عبقری شخصیات پر بہت ہی معلوماتی مضامین ہیں۔ اسلاف کی ادبی خدمات کے تابندہ نقوش سے بہرہ ور ہو کر زبان و ادب کی مزید شمعیں روشن کرنے والوں کو اس کتاب سے فیض حاصل ہوگا۔ اس میں ادب، صحافت، فلسفہ، لسانیات، شعر و سخن، فصاحت، بلاغت اور تاریخ جیسے غیر معمولی موضوعات پر قابل استفادہ تحریریں ہیں۔ انصاری اطہر حسین نے کہا کہ عبدالرؤف نہ صرف لکھنے پڑھنے کے آدمی ہیں بلکہ اسلامیہ ہائی اسکول جیسا تعلیمی ادارہ قائم کر کے دینی و دنیاوی تعلیم کو فروغ دے رہے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 مئی 2023

کلیاتِ دل

نئی دھلی: اوکھلا پریس کلب (رجسٹرڈ) کی جانب سے تسمیہ ہال اوکھلا میں بزرگ شاعر دل تاج محلی کے اعزاز میں جشن دل تاج محلی کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر این آئی او ایس کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اردو) ڈاکٹر شعیب رضا خان کی مرتبہ کلیات 'کلیات دل' کا اجرا بھی عمل میں آیا، بعد ازاں ادبی نشست بھی منعقد کی گئی۔ اس دوران دل تاج محلی کو کلب کی طرف سے ایک یادگاری مومنٹو ڈاکٹر سید فاروق چیئرمین تسمیہ ایجوکیشن فاؤنڈیشن نے پیش کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید فاروق نے صدارت کے فرائض انجام دیے، جب کہ مہمانان خصوصی میں پروفیسر وہاج الدین علوی، مہمان ذی وقار پروفیسر زیڈ حسن، پروفیسر شہپر رسول، ڈاکٹر سید سجاد و دیگر کے نام شامل ہیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شعیب رضا خاں وارثی نے انجام دیے۔ ڈاکٹر سید فاروق نے دل تاج محلی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ دل اور تاج محل دونوں کا تعلق محبت سے ہے۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ ہم نے کلیات کو طب سے مستعار لیا ہے کیونکہ طب میں کلیات کا مطلب ہوتا ہے تمام امراض کا تذکرہ، علاج اور دواؤں کے مفردات اور اردو ادب میں کلیات کا مطلب ہوتا ہے ادب کی ہر صنف جو رائج ہے اس میں طبع آزمائی کرنا۔ پروفیسر زیڈ حسن نے کہا کہ میں انگریزی کا پروفیسر تھا مگر اردو کی جانب عرصہ پہلے دل تاج محلی لائے جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔ میں ان کی ہی تحریک پر ہر سال اردو پر ایک بڑا، پروگرام کراتا ہوں۔ ڈاکٹر شعیب رضا نے کہا کہ میں نے کلیات دل میں یہ کوشش کی ہے کہ دل تاج محلی کی تقریباً 65 سالہ ادبی زندگی میں جو سرمایہ اردو کو انھوں نے دیا ہے ہر صنف میں ان کی بہترین تخلیقات کو منتخب کر کے کتابی شکل دوں، اگر سب لیتا تو کئی جلدیں درکار تھیں۔ ڈاکٹر شفیع ایوب نے کلیات دل پر بھرپور مقالہ پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 مئی 2023

پناہ

اورنگ آباد: معروف افسانہ نگار محمود شکیل کے افسانوں کے مجموعہ 'پناہ' کا اجرا بتاریخ 21 مئی 2023 کی شب مولانا آزاد ریسرچ سینٹر میں ڈاکٹر ارتکاز افضل و معروف اہلِ قلم و صحافی شمیم طارق کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اجرا سے پیشتر وارثانِ حرف و قلم کے تحت جشن 'شخص سے شخصیت تک' کا افتتاح شمیم طارق نے کیا۔ انھوں نے غالب اور اقبال کے اشعار کے ذریعے شخص اور شخصیت کے فرق کو واضح کیا۔ انھوں نے کہا کہ جب کوئی شخص کوئی کارنامہ انجام دے۔ کسی مقصد کے لیے محنت و مشقت کرکے جب کوئی امتیاز حاصل کرے تو پھر وہ شخصیت بن جاتا ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ میں اس جشن کے افتتاح کا اعلان کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں جس شخصیت کا انتخاب اس افتتاح کے لیے کیا گیا وہ کہنہ مشق اور معروف افسانہ نگار محمود شکیل ہیں۔ ہم نے اوراق، ادب لطیف، شب خون اور شاعر جیسے معیاری ادبی رسائل میں محمود شکیل کی کہانیاں پڑھی ہیں جن کا خوشگوار تاثر آج تک قائم ہے۔ جو آج ان کی کہانیوں کے پہلے مجموعہ 'پناہ' کے اجرا کے موقع پر مزید تازہ ہوگیا ہے۔

ڈاکٹر ارتکاز افضل نے اس موقعے پر کہا کہ یہاں موجود بیشتر افراد اور ہم نے محمود شکیل کی کہانیاں پڑھتے ہوئے لکھنا لکھانا شروع کیا ہے۔ جن میں نور الحسنین، ابوبکر رہبر، عظیم راہی اور سلیم محی الدین شامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ محمود شکیل کی کہانیوں کا امتیازی وصف ان کی منظر نگاری ہے۔ بہت تاخیر ہی سے سہی لیکن دیر آید، درست آید کے بمصداق آج ان کی کہانیوں کا مجموعہ 'پناہ' عزیزی خواجہ کوثر حیات کی مساعیِ جمیلہ سے اجرا کے مرحلے تک پہنچا ہے۔ افسانہ نگار اور مرتبہ دونوں کے لیے مبارکباد اور نیک تمناؤں کے ساتھ میں اُمید کرتا ہوں کہ یہ مجموعہ مقبول عام و خاص ہوگا۔ کتاب کے اجرا کے ساتھ ہی وارثانِ حرف و قلم کی جانب سے محمود شکیل کی خدمت میں ایک سپاسنامہ بھی پیش کیا گیا۔

نظامت کے فرائض سید امجد الدین قادری نے انجام دیے۔ ابتدا میں خواجہ کوثر حیات نے محمود شکیل کا تعارف پیش کیا۔

پریس ریلیز: سید اطہر احمد مہاراشٹر، 26 مئی 2023

گھر کی عورتیں اور چاند

نئی دھلی: شاعرہ رینو حسین کے شعری مجموعہ 'گھر کی عورتیں اور چاند' کا اجرا ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کے رابندر بھون آڈیٹوریم میں اہم ترین شخصیات کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ قابل ذکر ہے کہ رینو حسین کی یہ تیسری کتاب ہے۔ اس سے قبل دو اور شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اس موقعے پر لیلادھر منڈلوئی (ممتاز شاعر، مصنف، فلم ساز، فوٹوگرافر)، ممتا کرن (ممتاز شاعر اور میڈیا شخصیت)، لکشمی شنکر باجپائی (بین الاقوامی شاعر، مصنف اور میڈیا ماہر، سابق ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو)، ساگر سیالکوٹی، انل شرما جوشی (ممتاز ادیب، شاعر)، پروفیسر سوما بندوپادھیائے (وائس چانسلر، بابا صاحب امبیڈکر یونیورسٹی نامور شاعر)، سمن کیسری (ممتاز شاعر اور مصنف)، ڈاکٹر سندیپ اوستھی (نقاد، مصنف) موجود تھے۔ جب کہ شاعری کے شائقین کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 مئی 2023

مرزا شارق لاہرپوری کے دیوان حمد کا اجرا

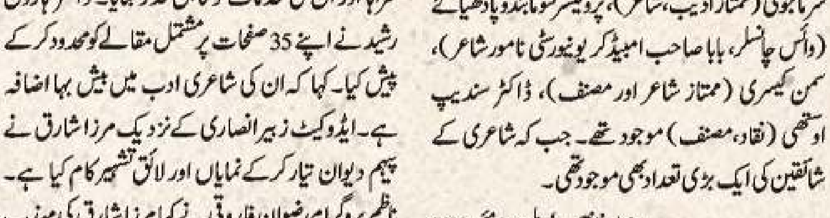

لکھنؤ: پختہ کار، مہذب اور زود گو شاعر مرزا شارق لاہرپوری شعر و ادب کے ایسے دیوانے ہیں کہ پے در پے دیوان لاکر بھی تازہ دم ہیں۔ غزل اور نعت کے دیوان کے بعد انھوں نے ایک منزل اور طے کی اور دیوان حمد بعنوان 'حمد باری تعالیٰ' منظر عام پر لے آئے۔ یوپی پریس کلب میں بزم احساس ادب (کھدرا) نے اس کے اجرا کی تقریب کا اہتمام کیا۔ ادبی دنیا کی اہم شخصیات نے بصد خوشی شرکت کرکے شاعر کو اس کی جداگانہ کوششوں پر داد و تحسین کے نذرانے پیش کیے۔ لکھنؤ کے ساتھ ہردوئی، ملیح آباد، لہرپور، سیتاپور، تمبور، کے اصحاب کمال نے شرکت کی۔ تقریب کا فریضہ صدارت ممتاز صحافی و ادیب احمد ابراہیم علوی نے انجام دیے۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، واصف فاروقی، ڈاکٹر سنجے مصرا شوق نے شرکت کی۔ مہمانان اعزازی کے طور پر ایڈوکیٹ زبیر انصاری اور رحمت لکھنوی نے شرکت درج کرائی۔ معروف شاعر عرفان لکھنوی نے اپنے استاذ مرزا شارق لاہرپوری کا کلام والہانہ انداز سے پیش کیا۔ مہمانوں کی گلپوشی کی رسم بزم کے ذمے داران نے ادا کی۔ صدر ذی وقار احمد ابراہیم علوی نے کہا کہ حمد یہ دیوان لاکر مرزا شارق نے نئی تاریخ رقم کی ہے۔ معروف شاعر واصف فاروقی نے کہا کہ مرزا شارق لاہرپوری نے صلے اور ستائش کی تمنا سے بے نیاز رہ کر مقدس اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی کے مطابق مرزا شارق کی تردامنی میں فرشتوں کے وضو کا سامان بہم ہے۔ ڈاکٹر سنجے مصرا شوق نے مرزا شارق کی جداگانہ کوششوں کو سراہا اور ان کی خدمات کو قابل قدر بتایا۔ ڈاکٹر ہارون رشید نے اپنے 35 صفحات پر مشتمل مقالے کو محدود کرکے پیش کیا۔ کہا کہ ان کی شاعری ادب میں بیش بہا اضافہ ہے۔ ایڈوکیٹ زبیر انصاری کے نزدیک مرزا شارق نے پیہم دیوان تیار کرکے نمایاں اور لائق تشہیر کام کیا ہے۔ ناظم پروگرام رضوان فاروقی نے کہا مرزا شارق کی مہذب دیوانگی متاثر کن ہے۔ معروف شاعر رحمت رسول کی رائے میں تعمیری فکر کی تشہیر و تبلیغ ہی مرزا شارق کا مشن ہے۔ اس موقعے پر رفعت شیدا صدیقی، محمد علی علوی، اکرم وارثی (کھیری)، الیاس چشتی، حیدر علوی، قمر سیتاپور وغیرہ نے منظوم تاثرات پیش کیے۔ بعدہ مرزا شارق لاہرپوری نے شرکا کی خواہش پر کلام حمد پیش کیا جسے سبھی نے پسند کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 مئی 2023

سہیل انجم کی کتاب 'اردو زبان مقبول بھی مظلوم بھی' کا اجرا

اردو زبان مقبول بھی مظلوم بھی

نئی دھلی: اردو زبان مقبول بھی مظلوم بھی کتاب کے اجرا کے موقعے پر اردو داں طبقہ نے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا سینئر صحافی سہیل انجم کے ذریعے بکھرے ہوئے مضامین کو ڈاکٹر سید احمد خاں نے یکجا کر کے جو کتابی شکل دی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ پدم شری ایوارڈ یافتہ پروفیسر اختر الواسع نے ڈاکٹر سید احمد خاں کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ سہیل انجم صاحب واقعی قلم کے دھنی ہیں، جتنا بھی سوچتے ہیں اس کو قلمبند کرتے ہیں۔ سابق ممبر پارلیمنٹ اور سینئر صحافی م افضل نے کہا کہ میں نے گیارہویں کلاس تک اردو پڑھی جب میں نے صحافت کا آغاز کیا تو اردو کو چنا گزشتہ تقریباً پینتالیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا اردو کا دائرہ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے حالانکہ دنیا میں اردو کو فروغ مل رہا ہے اور وہاں لوگ اردو کو بڑھانے کا کام بھی کرتے ہیں۔ سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے اردو الفاظ کے استعمال پر زور دیا اور کہا کہ وہ زبان جس سے ہماری شناخت ہے وہی ختم ہو جائے تو ہمارا حال کیا ہوگا۔ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ اردو کی اپنی طاقت ہے، غیر زبان کے لوگوں کو بھی اردو اچھی لگتی ہے۔ اب یہ مان لینا چاہیے کہ اردو آپ کی زبان ہے اس کی حفاظت کرنا ہم سب کی ذمے داری ہے۔ معروف شاعر ماجد دیوبندی اور ڈاکٹر حبیب اللہ نے بھی ڈاکٹر سید احمد کو مبارکباد پیش کی جب کہ سینئر صحافی سہیل انجم نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دلی، 4 جون 2023

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کی کتابوں کا اجرا

سرائے میر، اعظم گڑھ: مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے پروفیسر ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کی کتاب عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی جامعی، شخص اور شخصیت، مکاتیب مشاہیر و مکاتب ناصر، اوراق علی گڑھ کی تقریب اجرا کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر فخر الاسلام اصلاحی، ناظم مدرسۃ الاصلاح اور نظامت سابق صدر مدرس سرفراز احمد اصلاحی نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی نے کہا کہ عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی کی زندگی میں انفرادیت نظر آتی تھی، درسی زندگی سے لے کر عام زندگی میں وہ ہمیشہ نمایاں رہے۔ شبلی کالج میں شعبہ تاریخ کے انچارج پروفیسر علاؤ الدین اصلاحی نے مذکورہ کتابوں کے متعلق اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی پر اصلاح سمیت کئی اداروں کا رنگ چڑھا ہے، اصلاح سے فراغت کے بعد لکھنؤ اور پھر تحقیق کے لیے علی گڑھ چلے گئے اور وہیں پر تدریسی خدمات انجام دینے لگے لیکن ان کے دل میں اصلاح کی محبت آج بھی قائم ہے۔ پروفیسر اصلاحی جہاں ایک اچھے قلم کار، انشا پرداز اور متوازن فکر کے حامل ہیں، وہیں وہ ایک ممتاز خطیب اور سوشل ورکر بھی ہیں۔ ان کی تحریریں انسان دوستی، حب الوطنی، سماجی ہم آہنگی اور معاشرتی فلاح و بہبود کی علامت بھی سمجھی جاتی ہیں۔ پروفیسر اجمل پرنسپل ابن سینا طبیہ کالج نے کہا کہ یہ بات سچ ہے کہ پروفیسر ابوسفیان اصلاحی نے جس طرح علمی فتوحات اور تحقیقی کاموں کے توسل سے اپنی ایک نمایاں شناخت بنائی ہے وہیں وہ سماجی طور پر بھی زمین سے وابستہ انسان ہیں۔ گویا ابوسفیان اصلاحی کی شخصیت گوناگوں خوبیوں اور اچھائیوں کی حامل ہے۔ ڈاکٹر محمد ارشد اصلاحی نے کہا کہ استاذ اور شاگرد کے رشتے کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ عمر حسن اصلاحی وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔ اس موقعے پر احسان احمد خان، حافظ ارشاد احمد سابق ایم ایل اے، مولانا عبیداللہ قاسمی وغیرہ خصوصی طور پر موجود رہے، آخر میں مولانا عمر حسن اصلاحی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 مئی 2023

پس دیوار

نئی دھلی: ڈاکٹر محمد ہمایوں ایم بی بی ایس وائرولوجی کے پروفیسر امراض معدہ و جگر کے ماہر کے افسانوی مجموعہ 'پس دیوار' پر سلام الدین خاں کے اشاعتی ادارہ عبارت پبلی کیشن کے زیر اہتمام ڈاکٹر حیدر علی نے ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا۔ کتاب پر گفتگو کرتے ہوئے مقررین نے کہا کہ ڈاکٹر ہمایوں کا افسانوی مجموعہ 'پس دیوار' نئی طرز زندگی میں پرانی روایت کو زندہ کرنے کی ایک شاندار کوشش ہے۔ اظہار خیال کرتے ہوئے مقررین نے یہ کہا کہ ڈاکٹر ہمایوں نے پس دیوار کی تصنیف کر کے اردو افسانہ نگاری میں میل کا ایک ایسا پتھر رکھ دیا ہے جو جدید نسل کے لیے نشان راہ کا فریضہ انجام دیتا رہے گا۔ تقریب میں شامل اکثر مقررین کے خطاب میں انتظار حسین کا ذکر بھی آیا کہ اردو افسانہ نگاری میں داستانی روایت کے وہ امین سمجھے جاتے ہیں۔ اب ڈاکٹر محمد ہمایوں اس راہ کے دوسرے مسافر ہیں۔ جواں عمر ڈاکٹر محمد ہمایوں کا سفر ذرا اس طور پر مختلف ہے کہ وہ ایک ماہر ڈاکٹر ہیں۔ سائنسی جزئیات کو بھی انھوں نے افسانے کا حصہ بنایا ہے۔ پروگرام کی نظامت میں معین شاداب نے اپنی تمام ترشادابی کا مظاہرہ کیا۔ صدارت پروفیسر انیس الرحمٰن نے کی اور مہمان خصوصی عشرت ظہیر تھے۔ مہمان اعزازی کے طور پر سلیم شیرازی اور ڈاکٹر عبدالنصیب خان تھے۔ مہمان ذی وقار حقانی القاسمی کی تقریر سے جلسے کا آغاز کیا گیا۔ اس موقعے پر حقانی القاسمی نے کہا کہ ڈاکٹر ہمایوں کے افسانوں میں حقیقت اور عصریت کا گہرا ارتباط و انسلاک ہے۔ جو کردار اور واقعات عصری افسانے سے غائب ہوتے جا رہے ہیں انھوں نے ان کرداروں اور واقعات کی بازیافت کی ہے ان کے داستانوی رنگ افسانے طلسمات کے در کھولتے جاتے ہیں اور نگار خانہ تحیرات و عجائبات کی سیر کراتے ہیں ان کی فکر و فرہنگ میں عربیت اور عجمیت کا حسن امتزاج ہے اور زبان میں جادوئی کیفیت ہے۔ دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ زبان جس میں تاثیر مسحائی بھی ہے۔'

آن لائن شرکا میں پروفیسر احسان اکبر، مشکور حسین یاد، محترمہ شاہدہ اسید رضوی، سرفراز بیگ، محترمہ بانو صائمہ، کے علاوہ خود مصنف ڈاکٹر ہمایوں نے اپنے اپنے خیالات

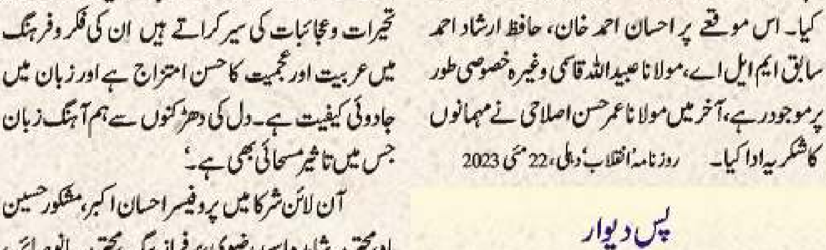

کا اظہار کیا اور اختتام پروگرام تک موجود رہے۔ سامعین میں ریختہ فاؤنڈیشن کے اراکین کے علاوہ مختلف جامعات کے طلبہ واسکالر بھی شریک رہیں۔

پریس ریلیز: حیدر علی، ریختہ فاؤنڈیشن، 4 جون 2023

آزادی کے بعد اردو میں تحقیق و تدوین: ایک جائزہ

نئی دھلی: ورلڈ اردو ایسوسی ایشن اور ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی کے اشتراک سے جے این یو میں ڈاکٹر فرحت جہاں کی کتاب 'آزادی کے بعد اردو میں تحقیق و تدوین: ایک جائزہ' کا اجرا عمل میں آیا۔ ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے چیئر مین پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے ڈاکٹر فرحت جہاں کی کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ "ڈاکٹر فرحت جہاں کی یہ کاوش یقیناً اہم ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں، اول یہ ہے کہ یہ خاتونِ خانہ ہیں، دوم یہ کہ ان کا تعلق اردو کے مرکزی دھارے سے ذرا الگ ہے۔ باوجود اس کے انھوں نے اس اہم کام کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کے لیے یہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔ ڈاکٹر محمد رکن الدین نے کہا کہ ادبی متون کی بازیافت میں تحقیق و تدوین کی روایت کافی قدیم ہے۔ ڈاکٹر شفیع ایوب نے کہا کہ نئی نسل کی طرف سے جاری تحقیقی و تنقیدی کام پر بحث و مباحثہ ایک نیک فال عمل ہے، میں مصنفہ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر فرحت جہاں نے اپنی کتاب پر بات کرتے ہوئے تحقیقی مراحل کی مشکلات کا ذکر کیا اور اپنی تحقیقی کاوش سے سامعین کو واقف کرایا۔ اس پروگرام میں ہندوستانی زبانوں کے مرکز، جے این یو کے اساتذہ ڈاکٹر شیو پرکاش، ڈاکٹر نصیب علی کے علاوہ ورلڈم اردو ایسوسی ایشن کی جنرل سکریٹری، ڈاکٹر مہوش نور، ڈاکٹر محمد جلیل اقبال خاکی، ڈاکٹر لیاقت علی، ریسرچ اسکالروں میں محمد پرویز عالم، نوید، نثار، محفوظ، اسداللہ، عبدالرحمٰن، طریق العابدین وغیرہ کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 جون 2023

وفیات

ابواللیث جاوید

نئی دہلی: معروف افسانہ نگار، ادیب و شاعر ابواللیث جاوید (ولادت: یکم جنوری 1939، مولد اکبر پور روہتاس) کا 22 مئی 2023 کو شام 5:30 بجے طویل علالت کے بعد نئی دہلی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین شاہین باغ قبرستان

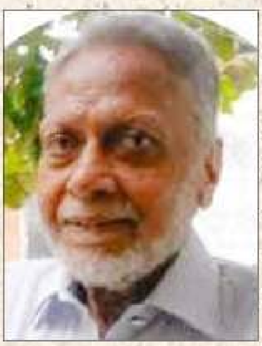

میں ہوئی۔ مرحوم 1996 میں ADM (ریونیو ڈپارٹمنٹ بنی پٹی مدھوبنی) کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ ایک مدت تک مظفر پور میں قیام رہا۔ ملازمت کی غرض سے کچھ عرصہ دربھنگہ میں بھی مقیم رہے۔ ایک عرصے سے نئی دہلی میں اپنی بچیوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں کانچ کا درخت، کنارے کٹ رہے ہیں، جاگتی آنکھوں کا خواب، زرد پتوں کے داستان، اب صبح نہیں ہوگی، کہانی ختم ہوئی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مرحوم کی اہلیہ برسوں قبل انھیں داغ مفارقت دے گئی تھیں جب کہ بڑے بیٹے انجینئر نشاط جاوید کا بھی 4 اکتوبر 2021 کو انتقال ہوگیا تھا۔ پسماندگان میں ایک بیٹا ارشد جاوید، دو بیٹیاں نسرین اختر، ڈاکٹر شابانہ آفرین جاوید ہیں۔ مرحوم نہایت خلیق، ملنسار اور سادہ لوح تھے۔

روزنامہ 'عوامی نیوز' کولکاتا/پٹنہ، 23 مئی 2023

احسان سیوانی

ممبئی: ممبئی کے میرا روڈ علاقے میں رہائش پذیر مشہور شاعر احسان سیوانی گزشتہ پانچ مہینوں سے سانس کے

عارضہ میں مبتلا تھے۔ آپ کے پھیپھڑے ناکارہ ہوچکے تھے اس لیے سانس لینے میں دشواری ہورہی تھی۔ رہ رہ کے سانسیں پھولنے لگتی تھیں اور دم اُکھڑنے لگتا تھا۔ اسی سبب ڈاکٹروں نے انھیں آکسیجن پر رکھا تھا، آخر 12 جون 2023 کی صبح تقریباً آٹھ بجے دم اکھڑنے لگا اور پھر سانسوں کا تانتا ٹوٹ گیا۔

مرحوم کا تعلق موضع بہوارہ، ضلع سیوان (بہار) کے ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ آپ کی ولادت 11 جولائی 1951 کو ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم 'بہوارہ' کے مکتب میں ہوئی۔ بعد کا تعلیمی سلسلہ بہوارہ سے کوئی تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع 'بڑہڑیا' کے جی ایم ہائی اسکول سے ہوئی۔ آپ نے بی ایس سی کی سند حاصل کی اور ممبئی آگئے اور انجمن خیر الاسلام، مدنپورہ، ممبئی میں بحیثیت سائنس اور ریاضی ٹیچر تقرری عمل میں آئی۔ ملازمت حاصل کرنے کے بعد آپ نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ممبئی کے کرلا علاقے میں گزارا۔ ان دنوں یہ علاقہ شعرا و ادبا کا گڑھ مانا جاتا تھا۔ یہاں آپ کا ادبی ذوق پروان چڑھا اور آپ کی تخلیقات مختلف اخبارات وجرائد میں شائع ہونے لگیں۔

آپ کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آئے۔ 'مٹی کی مہک' جنوری 2017 اور 'یادوں کے سائے' نومبر 2012۔ دونوں ہی مجموعوں کو بالترتیب بہار اُردو اکادمی اور اُتر پردیش اُردو اکادمی سے انعامات ملے۔ 'ادب گاؤں' کے شمارہ نمبر ۱۱، یعنی گزشتہ شمارہ میں آپ کے فن اور شخصیت پر ایک مختصر گوشہ بھی شائع کیا گیا تھا۔ آپ انتہائی نیک، ملنسار، دوست نواز شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کی رحلت سے اُردو ادب کا خسارہ ہوا ہے۔ پسماندگان میں تین بیٹیاں اور بیوہ ہیں۔ تینوں بیٹیاں اپنے گھر بار کی ہوچکی ہیں، اور تینوں ہی تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں۔

پریس ریلیز: اشتیاق سعید، ممبئی، 13 جون 2023

تنویر سحری

رام پور: استاذ شاعر سحر رامپوری کے صاحب زادے ماہر تعلیم تنویر سحری تقریباً 6 ماہ بستر علالت پر رہنے کے بعد مالک حقیقی سے جا ملے۔ انھوں نے بستر علالت پر رہتے ہوئے بھی اپنی ملازمت اور فرائض کو فراموش نہیں کیا۔ مرحوم تنویر سحری اپنے والد استاذ شاعر سحر رامپوری کے انتقال کے بعد 1986 سے میونسپل بورڈ رامپور میں اپنے والد کی جگہ ملازم ہوگئے تھے اور فی الحال وہ معاون اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے میونسپل بورڈ میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ تنویر سحری کی نعت ومنقبت وسلام کی محفلوں میں شاعر اہل بیت اطہار کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اکثر ایسی روحانی محفلوں کی نظامت کے فرائض بھی بحسن و خوبی انجام دیتے تھے۔ تنویر سحری کے پسماندگان میں ان کی بیوہ دو بیٹے احتشام علی بیگ، مرزا محمد حیدر، اور ایک شادی شدہ بیٹی ہے۔ مرحوم کے بڑے بھائی مرزا نسیم علی بیگ کے مطابق مرحوم اکثر محفلوں میں نظامت کرتے تھے اور گنگا جمنی اتحاد پر ان کے اشعار بہت مقبول تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 مئی 2023

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دور سے معلومات کی حصول

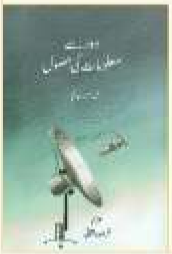

مصنف: محمد احرار عالم، مترجم: فرحت عثمانی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 130

قیمت: 90 روپے

ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج

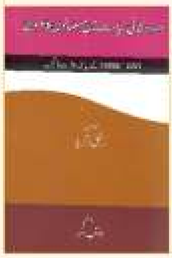

مصنف: رفیق زکریا، مترجم: ثاقب انور

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 533

قیمت: 245 روپے

ممتاز محل

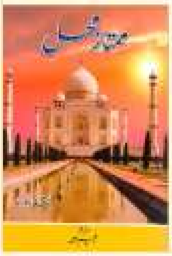

مترجم: فہیم احمد

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 442

قیمت: 210 روپے

عوام الناس کے صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام

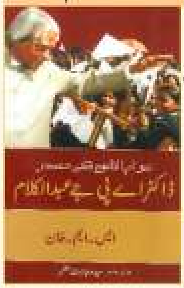

مصنف: ایس ایم خان، مترجم: سید وجاہت مظہر

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 166

قیمت: 95 روپے

آب و ہوا کا سائنسی مطالعہ

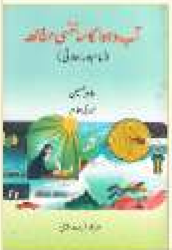

مصنف: طاہر حسین، میری طاہر

مترجم: فرحت عثمانی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 435، قیمت: 220 روپے

تاریخ طب یونانی (جلد دوم)

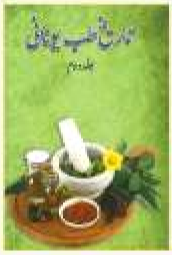

ادارہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

تشریح البدن (جلد سوم)

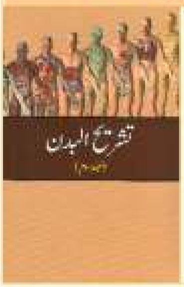

ادارہ

پہلی اشاعت: : 2022

صفحات: 455

قیمت: 210 روپے

تاریخ طب (ابتدا تا عہد حاضر)

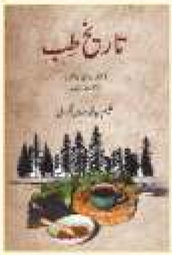

مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی

ساتویں اشاعت: 2022

صفحات: 606

قیمت: 280 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, जूलाई-२०२३,वर्ष:२५, अंक:०७

URDU DUNIYA Monthly, July-2023, Vol.25, Issue:07

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99

DL (S) - 01/3394/2023-25

ISSN 2249 - 0639

Date of Publication:24/06/2023

Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

Total Pages:100

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025

LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6